وحشتوں کی بستی میں

(ناول)

عمرانہ مشتاق

وحشتوں کی بستی میں

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق

''قدوس منزل'' پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا تھا۔ کبھی یہاں روشنیاں ہی روشنیاں ہوتی تھیں اور روشنیوں سے اس گھر کے مکینوں کے روشن حال کا عکس دور ہی سے نظر آ جاتا تھا۔ مگر اس وقت ''قدوس منزل'' ایک کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ ایک وقت تھا کہ شہر سے تقریباً بیس اکیس میل دوری کے باوجود بھی اس کی رونق میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آس پاس کے ماحول میں دور تک بہت کم آبادی تھی۔ اس گھر کے مالک قدوس صاحب اگر چاہتے تو جدید شہر کے حسین وسط میں ہر قسم کی مہنگی سے مہنگی جگہ خرید کر رہائش تعمیر کروا سکتے تھے۔ لیکن وہ رہائش کے لیے جس پُرسکون ماحول کے متلاشی تھے وہ انہیں اسی مقام پر نظر آیا۔ بالکل یکہ وتنہا، انہیں یہ جگہ پسند آ گئی تھی۔ اس گھر کی آبادی کل تین جمع چار افراد پر مشتمل تھی۔ قدوس صاحب، ان کی بیگم اور اکلوتا بیٹا شیراز اور باقی نوکر چاکر۔ شیراز اپنی والدہ کے ساتھ گھر میں اکیلا رہتا تھا لیکن قدوس صاحب کا زیادہ وقت دفتر میں گزرتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد قدوس صاحب گھر پر رہنے لگے اور شیراز کبھی دفتر چلا جاتا اور کبھی اِدھر اُدھر گھومنے دور دور تک نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔ البتہ نوکر چاکر ضرورت پڑنے پر ہمہ وقت حاضر رہتے تھے۔ ایک چوکیدار تھا جو جدید طرز کی گن لیے ہمہ وقت مستعد، باہر کے بڑے گیٹ پر موجود رہتا تھا۔ رات کے وقت اسی انداز میں دوسرا چوکیدار آ جاتا تھا۔

ان دنوں ''قدوس منزل'' کی حالت باہر ہی سے کیا، اندر سے بھی یوں لگتی تھی جیسے اس پر کسی خوفناک آسیب کا سایہ ہو۔

قدوس صاحب اور بیگم قدوس کو اس کی ویرانی کھائے جا رہی تھی۔ انہوں نے کئی بار بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے یہی جواب دیا۔ جس گھر میں اسے سکون نہیں مل سکا، وہ باہر سے رات کے وقت بھی تاریک ہی رہے تو بہتر ہے۔ کم از کم مصنوعی روشنیوں کے وبال سے دوسرے لوگ تو محفوظ رہیں۔ اس کی یہ عجیب منطق ان دونوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ ایک روز قدوس صاحب نے ذرا سختی کے ساتھ اسے کہا تو وہ بولا: ''ڈیڈی اب تو آپ مجھے اپنے طریقے سے جینے دیں۔ یہ گھر اگر میرا ہے تو میں اسے اسی انداز میں رکھوں گا اور اگر نہیں تو پھر مجھے اپنی جائیداد سے عاق کر دیں۔''

بیگم قدوس نے سمجھانے کی کوشش کی تو انہیں بھی یہی جواب ملا:

آپ نے جو چاہا وہ ہو گیا ممی! اب ہماری یہی سزا ہے کہ ہم اس گھر میں اس طرح رہیں جیسے بھوت اور چڑیلیں بسیرا کرتی ہیں۔

بیگم قدوس کو اس کی بات سن کر ایسے لگا جیسے اس پر بھی آسیب کا سایہ ہے۔ دوسرے روز انہوں نے قدوس صاحب سے بات کی کہ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، ورنہ ہمارا بیٹا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ قدوس صاحب تو پہلے ہی سے اس مسئلے پر سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکے تھے۔ انہوں نے بیگم کو تسلی دی اور اچھے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر وہی ہوا۔ شیراز زیادہ تر بیمار رہنے لگا تھا۔ اس کا ہر قسم کا علاج کیا گیا تھا لیکن اسے کوئی مرض گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ بظاہر وہ تندرست دکھائی دیتا تھا لیکن اندرونی طور پر شاید وہ کھوکھلا ہو رہا تھا۔ ایک روز ڈاکٹر مشتاق سے جب اس کی بیماری کی بات چل رہی تھی تو انہوں نے واضح طور پر کہا کہ شیراز کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ اسے محض کوئی صدمہ ہے۔ اس کا علاج میرے خیال میں یہی ہے کہ آپ اس کی شادی کر دیں۔ ''لیکن وہ شادی کے لیے نہیں مانتا۔'' قدوس صاحب نے انہیں بتایا۔ ''آپ پوری کوشش کریں کہ وہ آمادہ ہو جائے ورنہ اندر ہی اندر وہ اپنے آپ کو کسی خطرناک بیماری میں مبتلا کر لے گا۔'' ڈاکٹر مشتاق نے خطرے سے آگاہ کیا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں!'' قدوس صاحب نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے شیراز کو بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر شیراز مصر تھا کہ وہ اب شادی نہیں کرے گا۔ بس اس کی زندگی اگر یونہی گزرتی ہے تو گزر جائے۔ اس کا فیصلہ حتمی تھا۔ بیگم قدوس اس کے اس فیصلے پر بہت پریشان تھیں۔ آخر ایک دن وہ خود بھی بیمار ہو گئیں۔ ان کی بیماری طول پکڑ گئی تو قدوس صاحب نے بیٹے کو پھر ایک بار سمجھانے کی کوشش کی۔ اس پر شیراز نے چپ سادھ لی۔

قدوس صاحب کو اس کی چپ سے کچھ امید کا پہلو روشن ہوتا نظر آیا۔ لیکن اس وقت انہوں نے مصلحت کے تحت زیادہ اصرار نہ کیا۔

تاہم اگلے روز وہ ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لیے شیراز کے کمرے میں آ گئے۔ شیراز ہونقوں کی طرح یوگا کے انداز میں اپنے بازو گردن کے پیچھے کیے ہوئے چھت کو گھور رہا تھا۔ ''شیراز بیٹا!'' قدوس صاحب نے محبت سے پکارا۔ شیراز نے پلٹ کر دیکھا اور یک دم بازو نیچے چھوڑ دیئے۔ ''کیا کر رہے تھے؟'' قدوس صاحب نے پوچھا۔ ''کچھ نہیں ڈیڈی۔۔۔ بس یونہی۔۔۔''

''کب تک یونہی زندگی بسر کرتے رہو گے۔'' انہوں نے التجائی انداز میں کہا۔ ''جب تک جان میں جان ہے۔'' شیراز نے جواب دیا۔ ''کیا میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرو گے۔'' قدوس صاحب نے پھر التجا کی۔ ''کیا ابھی کوئی خواہش باقی ہے۔'' شیراز نے یک دم سوال کر دیا۔ قدوس صاحب سناٹے میں آ گئے۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھالا۔ ''ہاں بیٹا! خواہشوں ہی سے تو زندگی کا احساس جاگا رہتا ہے۔'' ''جی بتایئے!'' شیراز نے سعادت مندی سے کہا۔ ''بیٹا! اگر ایسا ہی رہا تو تمہاری ماں ختم ہو جائے گی۔''

''کیا؟'' شیراز نے چونک کر دیکھا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور قدوس صاحب جانتے تھے کہ اس بات کا اس پر اثر ضرور ہوگا۔ ''بیٹا تمہاری ماں کی ایک ہی خواہش ہے کہ تم شادی کر لو۔ ورنہ وہ مر جائے گی۔'' ''نہیں! ڈیڈی آپ کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر شیراز کے لہجے میں درد سمٹ آیا تھا۔ ''بیٹا! اس کی یہ آخری خواہش پوری کر دو۔ اس کے بعد جو چاہو کرنا۔''

شیراز یوں خاموش تھا، جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

کچھ دیر کمرے میں سناٹا رہا۔ ''ٹھیک ہے ڈیڈی! آپ اپنی یہ حسرت بھی پوری کر لیں۔'' شیراز نے خلاف توقع کہا۔

قدوس صاحب کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا۔ وہ تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ وہ اگر اپنی سعادت مندی بھی دکھائے گا تو معاملے کو طول دینے کے لیے ہم سے وقت مانگے گا جیسا کہ اس سے پہلے کئی بار ہو چکا تھا۔ ان کی نظر میں ماضی کے کئی دردناک منظر گھوم گئے، اور انہوں نے بڑھ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ ''شیراز بیٹا!'' ان کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ ''تم واقعی ایک سعادت مند بیٹے ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔'' اور شیراز چپ تھا۔ پھر نیچے آ گئے اور بیگم قدوس کو یہ خوش خبری سنائی۔

بیگم قدوس حیران رہ گئیں۔ خوشی کے آنسوان کی آنکھوں سے جھانکنے لگے اور انہوں نے شکر کے بارِعظیم سے سر سجدے میں رکھ دیا۔

قدوس صاحب نے بیگم کو دیکھا تو وہ بھی سجدۂ شکر میں چلے گئے۔ ''کیسی ہو تم؟'' قدوس صاحب سے اپنی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ''ٹھیک ہوں۔ میری ساری بیماری دور ہو گئی ہے۔''

قدوس صاحب مسکرائے۔ پھر کچھ دیر بعد انہوں نے کہا کہ میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں، ہم ابھی باہر جائیں گے۔

انہوں نے سعیدہ کو آواز دی کہ ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لمبی ڈرائیونگ کے بعد ہاؤسنگ سوسائٹی کے ''عظیم ولا'' میں داخل ہوئے۔

وہ دونوں گاڑی سے باہر نکلے تو نوکر نے اندر جا کر اطلاع دی۔ تھوڑی دیر میں وہ ان کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ عظیم صاحب بھی آ گئے۔

قدوس صاحب اٹھ کر انہیں ملے۔ انہوں نے بیگم قدوس کو سلام کیا۔ حال چال پوچھا اور کچھ دیر میں کھانے پینے کے سامان کی ٹرالی لے کر نوکر حاضر ہو گیا۔

''بھئی عظیم! ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں۔''

''نہیں نہیں کیا کہہ رہے ہیں قدوس بھائی۔ اتنی دور سے آپ آئے ہیں تو کھائے پیے بغیر نہیں جا سکتے۔'' عظیم صاحب گویا ہوئے۔

''بھئی ہم ابھی جانے کی بات تو کر ہی نہیں رہے۔ ہم تو بس ایک آرزو لے کر آئے ہیں آپ کے پاس۔''

''جی کہیے قدوس بھائی! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' عظیم صاحب نے بلا تکلف پوچھا۔

''ہمیں ساریہ چاہیے۔۔۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

''کیا مطلب؟۔۔۔اوہ۔۔۔اوہ۔۔۔اوہو ہو۔ میں سمجھا۔ شیراز کے لیے بات کر رہے ہیں آپ؟

''ہاں! قدوس صاحب مسکرا دیے۔

''بھئی وہ تمہاری ہے، میں نے پہلے بھی کب انکار کیا تھا۔ وہ تو تمہارے بیٹے کی ضد نے معاملہ کچھ کا کچھ کر دیا۔'' انہوں نے کچھ توقف کیا۔'' اب پھر اسی طرح پھر رہا ہے نالائق۔''

ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ اور بیگم قدوس کو ان کی بات سن کر نا گوار سا محسوس ہوا۔

تاہم انہوں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''عظیم بھائی! ساریہ ان دنوں کیا کر رہی ہے؟''

''لو بھئی۔۔۔ اتفاق دیکھو۔ اب تک تو اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر وہ ابھی تک پڑھ رہی ہے۔ ایم اے انگلش کے بعد پچھلے دنوں اس نے لاء بھی کر لیا ہے۔ شادی کا نام ہی نہیں لیتی۔ بیوقوف کہیں کی۔ ماں ہوتی تو شاید اسے منوا بھی لیتی لیکن میں تو اس کی ہر خواہش پوری کرتا رہتا ہوں۔ وہ جو کہتی ہے میں کر دیتا ہوں۔'' عظیم صاحب اپنی ہی ترنگ میں بولتے چلے گئے۔

بیگم قدوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ''وہ کہاں ہے اس وقت۔''

''بیٹی!۔۔۔ساریہ!'' انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

اور ساریہ کمرے میں داخل ہوئی تو بیگم قدوس اور قدوس صاحب کو دیکھ کر کھل اٹھی۔

''بیٹا! ان سے ملو۔ پہچانا ان کو؟ بڑے عرصے بعد آئے ہیں۔ وہ بھی میرے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے۔'' عظیم صاحب کی وہی ترنگ تھی۔ بیگم قدوس یہ بات سن کر بے اختیار ہنس دیں۔

ساریہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''جی انکل! گڈ ایوننگ۔۔۔جی آنٹی! ہاؤ آر یو۔''

بیگم قدوس مسکرائیں اور اٹھ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

بیگم قدوس نے کہا: عظیم بھائی! میں ساریہ کو کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

''ہاں بھئی لے جاؤ! میں مولانا صاحب کو نکاح کے لیے وہیں بھیج دوں گا۔'' عظیم صاحب گویا ہوئے۔

''نہیں بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' بیگم قدوس ایک دم بوکھلا گئیں۔

ساریہ نے بیگم قدوس کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے ان کے کان میں کچھ کہا۔

بیگم قدوس ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ قدوس صاحب بھی گھبرا کر اٹھ پڑے۔

ساریہ نے یہ صورت حال دیکھی تو عظیم صاحب سے کہا: ''پاپا! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ میں یہاں موجود ہوں ان کی مہمان نوازی کے لیے۔''

عظیم صاحب روبوٹ کی طرح اٹھے اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

قدوس صاحب نے ساریہ کی طرف دیکھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''انکل پاپا کا ذہنی توازن کچھ دنوں سے ڈسٹرب ہے۔ اچھے بھلے ہوتے ہیں لیکن اچانک عجیب سی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔''

''اوہ! قدوس صاحب کو سخت افسوس ہوا۔'' علاج ہو رہا ہے ان کا؟''

''جی! پوری طرح۔۔۔ ابھی آپ کے آنے سے پیشتر ڈاکٹر نے دوا دی تھی اور پھر انہیں آرام کا مشورہ دیا تھا، مگر یہ اپنے کمرے میں کتاب پڑھنے بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں آپ آئے۔'' ساریہ نے بتایا۔

''بیٹا پھر تو یہ معاملہ اور بھی جلدی کا ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔ اور ساریہ نے سر جھکا لیا۔

وہ دونوں گھر واپس آ گئے۔ شیراز کے بارے میں سعیدہ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ بیگم قدوس بڑی تیزی سے اس کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

اس واقعے کے تیسرے روز ساریہ دلہن بنی ان کے گھر میں تھی۔ گھر کے اندر سے لے کر گھر سے باہر تک چاروں طرف برقی روشنیوں کی جگمگاہٹ نے پورے علاقے کی ویرانی میں جشن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد ''قدوس منزل'' اپنی وحشتوں سے باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

سرسبز میدانی علاقوں، برف پوش پہاڑوں اور حسین مرغزاروں کی سیر کر کے ایک ماہ بعد وہ اپنے گھر واپس آئے تھے۔ شیراز کی روح کو حسین مقامات کے دلفریب نظارے تسکین پہنچاتے تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی ان مقامات کی سیر کے لیے کئی بار گیا تھا۔ ان مقامات سے اس کی کئی یادیں وابستہ تھیں اور وہ ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے اور کبھی یوں ہی اپنی تفریحی سرگرمیوں کی آرزو میں چلا جاتا تھا۔ ایک ماہ بعد جن قدرتی مناظر کی دلفریبی کا عکس آنکھوں میں سموئے وہ ابھی گھر آئے تھے، اس عرصے کی جدائی برداشت کرنے کے بعد بیگم قدوس نے بچوں کو آتے ہی سینے سے لگا لیا اور پیار کرنے لگیں۔

''سفر تو ٹھیک ٹھاک رہا نا، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔'' بچوں سے فارغ ہو کر انہوں نے شیراز سے پوچھا۔

''نہیں ممی، بالکل پریشانی نہیں ہوئی۔'' شیراز سے پہلے ساریہ نے جواب دیا۔

''دادی اماں! ریحان ان کے پاس آ گیا۔ وہ تقریباً دو سال کا ہو چکا تھا جبکہ ذیشان اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔

''ہاں بیٹا! بیگم قدوس نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔

''ہم نے آپ کو بہت مس کیا۔''

''اپنی دادی اماں کو بھول تو نہیں گئے تھے بیٹے۔'' بیگم قدوس نے ننھے ذیشان کو بھی گلے لگا لیا۔

''نئیں دائی اماں!'' اس نے توتلی سی زبان میں کہا تو سب ہنس پڑے۔

''ہاں ممی! بچوں نے تو آپ کی غیر موجودگی کو بہت محسوس کیا۔ آئندہ سال ہم آپ کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔'' ساریہ بولی۔

''بیٹا اگر زندگی رہی تو ضرور چلیں گے۔'' بیگم قدوس بولیں۔

پھر وہ سب خاصی دیر بیٹھے ایک ماہ کی روداد سناتے رہے۔ کہاں کہاں گھومے۔ خوبصورت لمحوں کو قید کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے۔ حسین وادیوں میں کھینچی ہوئی تصویریں بیگم قدوس کو دکھائی جانے لگیں۔ کئی دفعہ انہوں نے بچوں کی تصویروں کو چوم چوم لیا۔

''خدا نظرِ بد سے بچائے کتنے پیارے لگ رہے ہیں دونوں۔'' وہ بولیں۔

''اپنے باپ پر ہی گئے ہیں۔'' شیراز نے ساریہ کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اوہو۔ اتنی خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔'' ساریہ نے مسکراتے ہوئے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی تو شیراز ہنسنے لگا۔

کھانے کے دوران بھی وہیں کے تذکرے ہوتے رہے۔

''اچھا اب تم لوگ آرام کرو، بہت تھک گئے ہو گے۔'' بیگم قدوس اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولیں۔

لمبے سفر کی وجہ سے جسم تھکن سے چور تھے۔ لیٹتے ہی وہ سب گہری نیند سو گئے۔ شام کو نہا دھو کر تازہ دم ہو کر وہ سب چائے کی میز پر آ گئے۔ بیگم قدوس وہاں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ساریہ نے اپنے اور شیراز کے لیے چائے بنائی۔ اور بیگم قدوس بچوں کو بسکٹ کھلانے لگیں۔

''مینٹل ہسپتال سے فون آیا تھا۔'' بسکٹ ذیشان کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بیگم قدوس نے بتایا۔

''اچھا۔'' شیراز نے سرسری انداز میں کہا۔

بیگم قدوس نے شیراز کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر محسوس نہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک سکون سا محسوس کیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ سب لوگ چائے پی چکے تو بیگم قدوس ساریہ سے مخاطب ہوئیں۔

''بیٹا! بچوں کو کمرے میں چھوڑ آؤ۔ میں ذرا تمہاری موجودگی میں شیراز سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی اچھا میں ابھی آئی۔'' ساریہ بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر جلد ہی واپس آ گئی۔

بیگم قدوس نے ساریہ کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ پھر شیراز سے مخاطب ہوئیں۔

''بیٹا ایک اہم بات ہے۔''

شیراز ان کی بات سن کر قدرے متحیر ہوا۔ پھر پوچھا:

''کون سی بات ممی!''

بھی تو بتانے لگی ہوں۔ بیگم قدوس بات کرتے ہوئے ایک لمحے کو رکیں۔ پھر بولیں۔

''میرا خیال ہے کہ تم یہ خبر حوصلے اور صبر کے ساتھ سنو گے۔''

''ممی آپ جلدی سے بتائیں، کون سی خبر۔'' شیراز بے چین سا ہو گیا۔ ساریہ کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔

''بازغہ کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''کیا؟'' شیراز کے ذہن کو جھٹکا سا لگا اور ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

ساریہ بھی ہکا بکا رہ گئی۔

''کہاں جا رہے ہو بیٹا؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''مینٹل ہسپتال۔'' شیراز نے کہا۔

''اس وقت جا کر کیا کرو گے۔ اس واقعے کو تو دو روز گزر چکے ہیں۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

''اوہ''۔ اس نے واپس کرسی پر بیٹھ کر پشت سے سر ٹکا لیا۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ بھولی بسری یادوں کا ریلا سا ایک دم دماغ میں گھس آیا۔ بازغہ جو بھی اس کی زندگی تھی، ذہن کے پردے پر لہرائی۔ ہنستی مسکراتی تبسم کی بجلیاں گراتی، خوبصورت آنکھوں میں اس کی چاہت کے دیپ، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہوئی سوسو زاویوں سے وہ شیراز کے ذہن کے پردے پر کھلتی گئی۔ وہ اس کے تصور میں ڈوب گیا۔

''کیا سوچنے لگے بیٹا!'' بیگم قدوس کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔

''اس بیچاری کی زندگی بھی کیا تھی۔ پاگل انسان کا کیا مرنا، کیا جینا۔'' ساریہ افسوس بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ممی آپ نے مجھے اطلاع کر دی ہوتی۔ میں دو دن پہلے ہی آ جاتا۔'' ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے شیراز نے کہا۔

''ہسپتال والوں نے مجھے بھی کل ہی اطلاع دی تھی۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔ ''اس کے کفن دفن کا انتظام بھی ہسپتال والوں نے ہی کیا تھا۔'' بیگم قدوس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر بتا رہی تھیں کہ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کی اطلاع اس کے دفن کرنے کے بعد ہی اس کے گھر والوں کو دی جائے۔ سو ان لوگوں نے وہی کیا۔ مجھے تو کل اطلاع ہوئی۔ نہیں تو میں کسی کو بھیج کر میت منگوا لیتی اور تجہیز و تکفین کا انتظام بھی ہو جاتا۔'' بیگم قدوس نے تفصیل بتائی۔

''کیوں۔۔۔ کیا شاید ناراض تھی ہم سے؟'' زیر لب کہتے ہوئے شیراز نے دوبارہ اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ دکھ کی لہر اس کو اپنے پورے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بیٹا! پاگل آدمی کا کیا۔ راضی اور کیا اس کی ناراضی۔ خدا جانے کس دھن میں کہہ گئی ہو گی، جس کا ہسپتال والوں نے بتنگڑ ہی بنا ڈالا۔'' بیگم قدوس بولتی گئیں۔

''ممی وہ ضرور ہم سے ناراض تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی بیماری کی اطلاع پا کر بھی میں وہاں نہیں جا سکا تھا۔'' شیراز کے لہجے میں ندامت سی تھی۔

''فون آیا بھی ایسے موقع پر تھا کہ ہم لوگوں کے پاس وہاں جانے کا بالکل وقت نہیں تھا۔'' ساریہ نے صفائی پیش کی۔

''میرے جانے کے بعد بھی کیا کوئی فون وغیرہ آیا تھا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں! دو مرتبہ ہسپتال سے فون آیا تھا کہ وہ بیمار ہے۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

''پھر؟'' شیراز بولا۔

''میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ تم سیر و تفریح کی غرض سے ایک مہینے تک باہر رہو گے۔''

''میرے آنے کا انتظار تو کر لیا ہوتا بازغہ۔'' شیراز نے دل ہی دل میں شکوہ کیا۔

''کب تک میں تمہارا انتظار کرتی۔ تم نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔'' ذہن کے پردے پر خاموش آنکھوں سے سوال کرتی بازغہ کی تصویر ابھری تو دکھ اور ندامت سے شیراز کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔

''جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب کہیں تم اپنی طبیعت نہ خراب کر لینا۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''آپ اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیجیے نا۔'' ساریہ نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

وہ چپ چاپ آنکھیں موندے پڑا رہا۔ کچھ دیر یونہی خاموشی سی رہی۔

''ہسپتال والوں نے کہا تھا کہ کسی دن آ کر اس کا سامان وغیرہ لے جائیں۔'' کچھ دیر بعد بیگم قدوس نے ماحول کے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''اس کے پاس تھا ہی کیا، سب کچھ تو لٹ گیا تھا اس کا۔'' آنکھیں موندے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

''جو بھی تھا، بہر حال وہاں سے تو لانا ہی ہے نا۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''اچھا۔'' وہ بے حد تھکے تھکے اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ ہنستی مسکراتی لڑکی ایک دن ہوش وحواس کھو کر یوں بے موت مر جائے گی۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں تھوڑا سا افسوس تھا۔

''میں نے صرف ایک ہی بار دیکھا تھا۔ بہت ہی افسوس ہوا تھا مجھے ان کی حالت دیکھ کر۔'' ساریہ بھی اداس لہجے میں بولی۔

''بس خدا کی مرضی۔ خدا ہی جانے اپنے کاموں کو۔'' بیگم قدوس تاسف بھری آواز میں بولیں۔

شیراز آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

''بیٹا صبر سے کام لو۔ ذہن پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ ابھی تو تمہاری سفر کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''اس کی موت پر تو صدمہ کر لینے دیجیے ممی۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

''تم لوگوں کے چلے جانے سے ایک دم سناٹا ہو جاتا ہے۔ سارا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے، میں تو تمہاری واپسی کا ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ بچوں کے دم ہی سے تو گھر میں رونق رہتی ہے۔ میرا تو ایک پل بھی نہیں لگتا ان کے بغیر۔'' بیگم قدوس نے بات بدلنا چاہی۔

''اب کی مرتبہ ہم آپ کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔'' ساریہ ایک دم ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

وہ دونوں خدا جانے کیا کیا باتیں کرتی رہیں اور شیراز کرسی کی پشت سے سر ٹیکے، آنکھیں موندے سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی سال ہو گئے تھے۔ بازغہ سے جدا ہوئے لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جدائی ابھی ابھی ہوئی ہو۔ خدا جانے آخری بار اس کی صورت نہ دیکھنے کا دکھ تھا یا اپنی بے وفائی کا غم۔ ایک دم انجان احساس اس کے دل پر چرکے لگانے لگا۔ اس کی سوئی محبت تمام شدتوں سے جاگ اٹھی تھی لیکن کب، جب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ اس ڈھیر میں وہ اپنی محبت کی چنگاریوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا چاہ رہا تھا۔ محبت کے اس کھیل میں بازغہ کے حصے میں آنے والے دکھوں کا اپنی خوشیوں سے موازنہ کر رہا تھا۔ دونوں نے محبت کے سفر کا آغاز ساتھ ساتھ کیا تھا۔ لیکن بازغہ کے دامن میں کانٹے الجھ گئے تھے اور وہ خود پھولوں کی وادی میں جا پہنچا تھا۔ نجانے کتنی دیر وہ یونہی آنکھیں موندے پڑا رہا۔

''اندھیرا ہو رہا ہے بیٹا!۔۔۔ اب اندر چلو!'' بیگم قدوس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''کب تک اس طرح پڑے رہو گے۔ خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں ہے بیٹا!'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''چلو اٹھو، اندر چلو۔'' انہوں نے کندھا پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بوجھل بوجھل قدموں سے لان عبور کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار اس کی صورت تو دیکھ لیتا۔ درد کا طوفان پھر اٹھنے لگا تو وہ آہ بھرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تفریحی پروگرام پر جانے سے ایک دن پہلے ہسپتال سے فون آیا تھا۔ شیراز نے فون خود ہی ریسیو کیا تھا۔۔۔

''ہیلو'' ماؤتھ پیس منہ کے قریب لاتے ہوئے کہا تھا۔ ''مسٹر شیراز سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی تھی۔

''جی۔ فرمایئے!'' شیراز بولا۔

''میں مینٹل ہسپتال سے بول رہی ہوں۔ مسٹر شیراز کو بیماری کی اطلاع دینی تھی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کیا ہوا انہیں؟'' شیراز نے پوچھا۔

''وہ کافی عرصے سے مسلسل بیمار ہیں۔'' دوسری طرف سے بتایا گیا۔

''اچھا ٹھیک ہے'' کہہ کر شیراز نے ریسیور رکھ دیا۔

''کس کا فون تھا؟'' ساریہ سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے ہوئے بولی۔

''مینٹل ہسپتال سے آیا تھا، بازغہ بیمار ہے۔'' شیراز نے بتایا۔

''ہوا کیا؟'' ساریہ نے پوچھا۔

''ڈاکٹر بتا رہی تھی کہ بہت عرصے سے مسلسل بیمار ہے وہ۔'' شیراز نے کہا۔

''پھر؟'' ساریہ نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ''کل کی سیٹیں ریزرو ہو چکی ہیں۔''

شیراز کچھ سوچتے ہوئے بولا ''یہی ہو سکتا ہے کہ میں اسی وقت ہسپتال روانہ ہو جاؤں۔'''' لیکن مجھے کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے۔''

شاریہ ایکدم پریشان سی ہو کر بولی۔ ''ہاں مجھے بھی کچھ تھوڑا سا کام کرنا ہے۔

''اور پھر فاصلہ بھی تو بہت ہے۔''

''تقریباً پورا دن ہی لگ جاتا ہے۔'' ساریہ نے کہا۔

''مشکل تو یہی ہے۔'' وہ بولا۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپا کوئی پرانا جذبہ ابھر رہا تھا جو بازغہ کی سوئی ہوئی محبت کی شمع پھر سے جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ خود ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ پرانی چاہتیں، پرانے جذبے جو وقت اور حالات کی دبیز تہوں میں دب چکے تھے۔ پرانی محبتوں نے مصلحتوں کی چادر اوڑھ لی تھی۔ اب تو سب کچھ نیا تھا۔ نئے حالات تھے، نئے لوگ تھے۔ اب تو وہ خود بھی بہت بدل چکا تھا، سب کچھ بھول کر نئی راہوں پر گامزن ہو گیا تھا، ان راہوں پر جہاں اب بازغہ کی جگہ ساریہ اس کی ہم رکاب تھی۔ راستہ خوبصورت ہو تو بعض اوقات ہمراہی کے بدل جانے کا احساس بھی نہیں رہتا۔ اور ایسے ہی خوبصورت راستے پر ساریہ کی ہمراہی میں سب کچھ بھول سا گیا تھا۔ نئے ہمراہی نے اپنی صلاحیتوں اور دلکشیوں سے اس کے دل و دماغ پر قابو پا لیا تھا اور اب پرانے ہمراہی کی بیماری کی

اطلاع پا کر وہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ذہنی ہم آہنگی ہو تو فاصلے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ لیکن اگر ذہنی فاصلے ہو جائیں تو دو قدم کا راستہ بھی طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ شیراز کے ساتھ ہو رہا تھا۔ دل میں اگر تڑپ ہو، سچی لگن ہو تو انسان ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ لیکن جب جذبات کی آگ سرد پڑ چکی ہو، محبتیں دم توڑ چکی ہوں تو پھر یونہی ٹال مٹول کرنے کو دل چاہتا ہے، چھوٹے موٹے بہانوں کی آڑ لی جاتی ہے۔ پھر اس کے اور بازغہ کے درمیان تو ذہنی طور سے ستر میل نہیں بلکہ ستر صدیوں کا فاصلہ ہو گیا تھا۔

''پھر کیا سوچا آپ نے؟'' اسے چپ دیکھ کر ساریہ نے پوچھا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کیا جائے؟'' وہ بولا۔

''اب یہاں کے کام نمٹانے بھی تو ضروری ہیں۔'' ساریہ نے کہا۔

''ہاں یہی تو مسئلہ ہو گیا ہے۔'' وہ بولا۔

''ایسا کرتے ہیں، ایک مہینے کی تو بات ہے، واپسی پر آپ سب سے پہلے ان ہی کی عیادت کو ہو آیئے گا۔'' ساریہ نے رائے پیش کی۔

''ہاں بات تو ٹھیک ہے لیکن ایک مہینہ۔'' وہ کہتے کہتے رک کر سوچنے لگا۔ شاید مہینے کی طوالت سے ڈر گیا تھا۔

''پلک جھپکتے گزر جائے گا۔'' اسے پریشان دیکھ کر ساریہ نے کہا۔

''ہاں مجبوری ہے، یہی کرنا پڑے گا۔'' شیراز نے کاندھوں سے بوجھ اتار دیا۔

اور پھر وہ چلے گئے۔ ان دلکش نظاروں کی دنیا میں، ساریہ کو اپنی چاہت کا یقین دلاتے ہوئے ایک دفعہ بھی تو اسے خیال نہیں آیا کہ یہی ہری بھری وادیاں اس کی اور بازغہ کی محبت کی بھی گواہ ہیں۔ ان کی چاہتوں کی کہانیاں، ان کی محبت بھری سرگوشیوں کی امین ہیں، ان کی پیار بھری باتوں کی رازداں ہیں۔ اسے کچھ بھی تو خیال نہیں آیا تھا، کوئی یاد بھی تو نہیں آئی تھی ذہن میں۔ اور اب بازغہ کی موت کی خبر سے ایک دم سوئی ہوئی محبتیں پوری شدت سے جاگ اٹھی تھیں، یادیں ذہن کو کچوکے لگانے لگی تھیں۔ نقصان کی تلافی ممکن نہ ہو تو غم دوگنا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا ذہن اس آگ میں جل رہا تھا، پچھتاوے کی آگ پورے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی، کاش میں آخری بار تو اس کو دیکھ لیتا، یہی احساس تیر بن کر دل کے آر پار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ یونہی صوفے پر پڑا یادوں کے زخم سہلا رہا تھا جب ساریہ آ گئی۔ اس نے آتے ہی لائٹ جلائی۔ تب اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔

''کھانا کھا لیجیے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ساریہ نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شیراز نے آہستہ سے لب ہلائے۔

''تھوڑا بہت ہی کھا لیجیے۔'' ساریہ نے اصرار کیا۔

''نہیں میں بالکل نہیں کھاؤں گا تم جاؤ۔'' کہتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور پھر یونہی بے حس و حرکت پڑے پڑے کئی گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ نظریں سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ دو بجے تھے، سامنے بیڈ پر ساریہ بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تو وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ چاندنی رات تھی، ہوا دھیمے دھیمے سروں میں چل رہی تھی۔ ننھے ننھے پودے ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے جھوم رہے تھے، دودھیا چاندنی میں نہائی ہر چیز پر عجیب طرح کا نور برس رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی ٹہلتا رہا اور پھر تھک کر لان میں بنی سنگِ مرمر کی بینچ پر بیٹھ گیا۔

''شیراز!'' کسی نے پیچھے سے پکارا۔ اس نے ایک دم مڑ کے دیکھا، کوئی بھی نہیں تھا۔

''شیراز!'' اب کے آواز سامنے سے آتی محسوس ہوئی۔

اس نے تڑپ کر سامنے دیکھا۔ بیلے کے چھوٹے پودوں میں ننھے منے سفید پھول ستاروں کی مانند ٹکے دکھائی دے رہے تھے، اور تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اور تب ہی اسے احساس ہوا جیسے بازغہ اس کے آس پاس ہی چہل قدمی میں مصروف ہو۔ اس کی مہک شیراز کے دماغ کو معطر کرنے لگی۔ وہ دیوانہ وار نظریں گھما گھما کر چاروں طرف اسے ڈھونڈنے لگا، اور پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ یہ سب اس کا وہم تھا۔ اس کا ایک ایک سانس بازغہ کو پکار رہا تھا اور یہی پکار احساس بن کر اس کے دماغ پر چھا گئی اور تب یادوں کا ریلا دماغ میں گھس آیا اور وہ اس ریلے کے بہاؤ میں کھو گیا۔ بازغہ کے ساتھ اس نے کتنی ہی راتیں اس لان میں ساتھ ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے اور دنیا جہان کی باتیں کرتے ہوئے گزاری تھیں۔ جب بھی کسی ایک کو نیند نہ آتی، وہ لان کی کھلی فضا میں نکل آتا اور دوسرا اس کا ساتھ دیتا۔ نیلا آسمان، اس پر سجے چاند تارے جھک جھک کر ان کی محبت بھری سرگوشیاں سنتے، ستارے آنکھیں جھپک جھپک کر محبت کے ان متوالوں کو دیکھتے اور چاند مسکرا دیتا، خوشبوؤں سے لدی ہوائیں آتیں اور ان کی میٹھی میٹھی باتیں لے کر واپس جاتیں، پھول پودے چاہتوں کی گواہی دیتے اور وہ سب سے بے پروا، اپنی دنیا میں کھوئے رہتے۔

''جن دنوں ممی، ڈیڈی مجھے تم سے شادی کرنے سے منع کر رہے تھے تو میں نے یہ ساری راتیں اسی لان میں بیٹھ کر گزاری تھیں۔'' شیراز نے بازغہ کو بتایا۔

''بھلا کیوں؟'' بازغہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

وہ ستمبر کی راتیں محبوب کی یاد میں اسی طرح گزاری جاتی ہیں۔'' شیراز نے شاعرانہ انداز میں کہا۔

''اچھے خاصے شاعر بن گئے ہو۔'' بازغہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''قدرت کی صناعی دیکھنے کے بعد ہر شخص کا شاعری کرنے کو دل چاہتا ہے۔'' بازغہ کی آنکھوں میں اترتے ہوئے اس نے کہا۔

''بہت خوب۔'' بازغہ ہنسنے لگی۔

اس طرح چاندنی راتوں کے محبت آمیز ملاپ میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔

''اگر تم مجھے نہ ملتی تو کیا ہوتا۔'' وہ کہتا۔

''کچھ بھی نہ ہوتا، تم اپنے گھر میں خوش رہتے اور میں اپنے گھر میں۔'' بازغہ جواب دیتی۔

''اگر زندہ رہتا، تب ہی تو خوش رہتا نا۔'' وہ کہتا۔

''کیا مطلب؟'' بازغہ اس کے جواب کا مطلب جانتے ہوئے بھی پوچھتی۔

''تمہارے بغیر زندہ ہی کب رہ سکتا تھا۔''

''یعنی تمہارے جذبات میرے دم سے ہیں۔'' بازغہ کہتی۔

''بالکل۔'' شیراز جواب دیتا۔

''تو پھر ہر وقت دعائیں دیتے رہا کرو۔'' بازغہ ہنستے ہوئے کہتی۔

''بس جناب، ہم تو ہر وقت آپ کو درازی عمر کی دعائیں دیتے رہتے ہیں۔'' شیراز کہتا۔

''کچھ اندازہ ہے، کتنی رات ہو چکی ہے۔'' بازغہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔

''تم ساتھ ہوتی ہو تو دن رات، صبح شام کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔'' شیراز جواب دیتا۔

''اتنی مدہوشی اچھی نہیں ہوتی۔'' بازغہ ہنس دیتی۔

''تمہاری شربتی آنکھیں کسی نشے سے کم تو نہیں ہیں۔'' وہ سرشاری سے کہتا۔

''اندر چلو نیند آ رہی ہے۔'' وہ اندر جانے کے لیے قدم بڑھاتی تو شیراز بھی ساتھ ہو لیتا۔

شیراز کے دل و دماغ میں یادیں ہلچل مچا رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کی ٹھنڈی بینچ پر بیٹھا وہ خلاؤں میں رستے تلاش کر رہا تھا۔ وہ کتنی جلد کھو گئی تھی، اور یہ سب کچھ خود اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ سامنے موتیوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ اٹھا اور ڈھیر سارے پھول توڑ کر جھولی میں بھر کے واپس آ کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ ان پھولوں کو تکتا رہا۔ یادوں کا جھونکا آیا، روزانہ رات کو ٹہلتے ہوئے وہ پھولوں کا گچھا توڑ کر بالوں میں اٹکا لیتی تھی۔

''تم تو خود ایک مہکتا ہوا پھول ہو، تمہیں پھولوں کی کیا ضرورت ہے۔'' شیراز کہتا۔

''کیوں؟'' وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں پیار کا امنڈتا سمندر دیکھ کر نظریں جھکا لیتی۔ مدھر مدھر مسکان اس کے لبوں پر پھیل جاتی۔

''شکریہ! موتیے کے پھول میری زندگی ہیں۔'' وہ خوشبو سونگھتے ہوئے کہتی۔

''جناب یہ آپ کی زندگی کے پھول ہیں تو ہم کیا ہیں؟'' شیراز پوچھتا۔

''جان۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہتی تو شیراز بھی مسکرا دیتا۔ رات کو تکیے پر وہ پھول بکھیر دیتی اور پھر دیر تک وہ پھولوں سے کھیلتی رہتی۔

''جب تک ان کی خوشبو نہ آتی رہے، مجھے نیند ہی نہیں آتی۔'' وہ کہتی۔

''کیا کر رہی ہو بھئی ان پھولوں کے ساتھ۔'' شیراز اس کی محویت کو توڑتا۔

''لکھ رہی ہوں۔'' وہ جواب دیتی۔

''کیا لکھ رہی ہو؟'' منہ پر ہاتھ رکھے رکھے شیراز پوچھتا۔

''خود اٹھ کر دیکھ لو۔'' وہ کہہ دیتی۔

شیراز گردن اٹھا کر تکیے پر دیکھتا۔ سفید سفید پھولوں سے بڑے خوبصورت انداز میں اس کا نام لکھا ہوتا۔

''ہوں۔۔۔ تو ہمارے نام کا ورد ہو رہا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

''بالکل۔'' وہ پھولوں کو ترتیب دیتے ہوئے جواب دیتی اور تب شیراز اس کی گود میں پڑے ہوئے پھول لہرا کر اپنے نام کے ساتھ اس کا نام لکھ دیتا۔

''بازغہ اور شیراز ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔'' وہ یقین آمیز محبت کے ساتھ کہتا۔

''آمین۔'' وہ صدقِ دل سے کہتی۔

''کیا سمجھوں اسے؟'' شیراز پھولوں کی طرف اشارہ کرتا۔

''محبت کی دیوانگی۔'' بازغہ پھولوں میں منہ چھپا لیتی اور وہ مسکرا دیتا۔

بیگم قدوس بھی شروع شروع میں بازغہ سے بہت محبت کرنے لگی تھیں اور ان دونوں کی باہمی رفاقت اور ازدواجی زندگی پر مطمئن تھیں۔ لیکن پھر وقت نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ سب کچھ بکھر گیا، اور اب۔۔۔ بازغہ کی موت کی خبر اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

اس کی کار تیزی سے مینٹل ہسپتال کی طرف رواں تھی۔ راستے کی مسافت کم ہوتی جا رہی تھی اور ہسپتال نزدیک آتا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہ مسافت کبھی ختم نہ ہو، وہ یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہے، یونہی دیوانہ وار چلتے چلتے راستوں کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو جائے، منزل کبھی قریب نہ آئے اور وہ یونہی چلتا رہے۔ ہسپتال قریب آ جانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ وہاں جا ہی کیوں رہا تھا، کیا رکھا تھا اب اس کا وہاں، کچھ بھی تو نہیں تھا، پھر اسے جا کر کیا حاصل ہوگا؟ وہ اب وہاں کیوں جا رہا ہے؟ کس سے ملنے جا رہا ہے؟ کون ہے اب اس کا وہاں؟ وہ جو ایک ہستی وہاں رہتی تھی، منوں مٹی تلے جا چکی ہے۔ وہ شروع شروع میں جب یہاں آتا تھا تو اس کا جی چاہتا تھا، پر لگا کے اڑتا ہوا وہاں پہنچ جائے۔ طویل مسافت کا ایک ایک لمحہ بھاری بن کر گزرتا، ایک ایک پل صدیوں کے برابر محسوس ہوتا، وہ تیز سے تیز تر ڈرائیونگ کرتا، جوں جوں منزل قریب آتی جاتی، اس کی بیتابیاں بڑھتی جاتیں، کار سے اتر کر وہ دیوانہ وار اندر بھاگتا، لیکن جس کے لیے شدت سے بھاگتا، وہ تو ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ وہ تو اسے ڈھنگ سے پہچانتی بھی نہیں تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ جانتے بوجھتے اسے پہچاننا نہیں چاہتی، مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا، وہ خود تو باہوش تھا کہ اپنی مرکزِ حیات کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اپنی محبت، اپنی آرزوؤں کی مرکز اس ہستی کو سامنے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے تو قرار سا آ ہی جاتا تھا، آنکھوں کی جلن میں کچھ کمی سی آ ہی جاتی تھی، وہ چپ چاپ بیٹھا اسے ایک ٹک دیکھے جاتا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر جب دل میں غم اور دکھوں کے بادل طوفان کی شکل اختیار کرنے لگتے تو وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ آتا اور پھر آہستہ آہستہ ان طوفانوں کی شدت میں کمی آتی گئی۔ آخر آخر اس کے جذبات بالکل ہی سرد پڑ گئے۔ دل میں اس کی محبتوں کے چشمے خشک ہو گئے۔ چاہت کے آتش فشاں کی آگ بجھ کر رہ گئی۔

اب تین سال بعد پھر دل پر غموں کے بادل امڈ آئے تھے، دل چاہ رہا تھا، منزل کبھی قریب نہ آئے اور وہ یونہی راہوں میں بھٹکتا بھٹکتا کھو جائے۔ لیکن دل کا کہا کب پورا ہوتا ہے، مسافت ختم ہوتی گئی اور سامنے مینٹل ہسپتال کا گیٹ نظر آنے لگا۔ اس نے رفتار بالکل دھیمی کر دی۔ کار رینگتے رینگتے گیٹ کے اندر داخل ہو ہی گئی۔ بجھے دل سے وہ باہر نکلا اور سست قدم اٹھاتا ہوا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''السلام علیکم۔'' ان کے کمرے میں پہنچ کر وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

''اوہ! مسٹر شیراز۔'' میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے کاغذوں سے نظر ہٹاتے ہوئے اسے دیکھا۔ ''آخر آپ آ ہی گئے۔''

وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''شکریہ۔'' وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہم نے کئی مرتبہ فون پر مسز شیراز کی بیماری کی اطلاع دی تھی۔'' انہوں نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شیراز نے سر جھکا لیا۔ کہنے کو تھا ہی کیا اس کے پاس۔

''بہت انتظار کرایا آپ نے ان کو۔'' ان کے لہجے میں چبھن تھی۔

شیراز کا سر بدستور جھکا ہوا تھا، کچھ دیر خاموشی رہی۔ شیراز سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

''آپ نے وقت پر اس کی موت کی اطلاع کر دی ہوتی۔'' ہمت مجتمع کر کے وہ بولا۔

''ہم مجبور ہو گئے تھے۔'' سپرنٹنڈنٹ صاحب نے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟'' شیراز نے ایک حیرت کے ساتھ پوچھا۔

''انہوں نے سختی سے ڈاکٹر فرحانہ سے وعدہ لیا تھا کہ ان کی موت کی اطلاع ان کے دفن کیے جانے کے بعد ہی ان کے گھر والوں کو دی جائے۔'' انہوں نے تفصیل کے ساتھ بتانا شروع کیا۔ شیراز چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ان کی کچھ امانتیں ہمارے پاس ہیں۔'' انہوں نے کال بیل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر میں چپراسی اندر آ گیا۔

''ڈاکٹر ریحانہ سے مسز شیراز کا سامان لے آؤ۔'' انہوں نے چپراسی سے کہا۔

''جی اچھا!''

چپراسی چلا گیا تو تھوڑی دیر کو کمرے میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بظاہر میز پر پڑی ایک فائل کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن ان کے دماغ میں شیراز اور بازغہ کی دردناک کہانی کا ایک ایک پہلو روشن ہوتا گیا اور شیراز سوچوں کی دنیا میں گم رہا۔ کچھ دیر بعد ہی چپراسی ایک اٹیچی کیس میز پر رکھ کر چلا گیا تو انہوں نے کھولنا شروع کیا۔

''یہ ہیں ان کے کچھ کپڑے اور ذاتی سامان۔'' پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ایک چھوٹا سا ڈبہ کھولا۔

''یہ مسز شیراز کے کنگن ہیں جو ہم نے اس ڈبے میں محفوظ کر دیے تھے۔''

یادوں کی بجلی سی شیراز کے ذہن پر گری۔ چونک کر وہ ڈبے کی طرف دیکھنے لگا۔

''چیک کر لیجیے۔'' انہوں نے ڈبہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”نہیں بس ٹھیک ہے۔“

”موت کے بعد ہی ان کے ہاتھ سے اتارے گئے تھے۔شروع میں ایک مرتبہ ہم نے اتارنے چاہے تھے تو انہوں نے بے حد ہنگامہ کیا تھا۔ظاہر ہے یہ کنگن ان کو بے حد عزیز تھے۔“

شیراز ان کے لفظ ”ظاہر ہے“ کی گہرائی سے چونک اٹھا۔وہ پتھر کی مورت بنا خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ذہن میں یادوں کا کوندا سا لپک رہا تھا۔سہاگ رات کو اس نے بڑی چاہت سے یہ خوبصورت کنگن بازغہ کے ہاتھوں میں پہنائے تھے۔تب اس نے کہا تھا کہ ”موت ہی ان کو میرے ہاتھوں سے جدا کر سکتی ہے۔“ شیراز کا ذہن سلگ اٹھا۔اس شام وہ لمبی ڈرائیو پر تھا۔کھلی فضا میں دونوں کے دل پھول کی طرح کھلے ہوئے تھے۔بازغہ حسب معمول چہک رہی تھی۔شیراز اس کی قربت کے نشے میں مدہوش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔اچانک سامنے سے آنے والے ٹرک کو بالکل اپنے بالمقابل دیکھ کر شیراز نے گھبرا کر بریک لگاتے ہوئے کار کو ایک طرف کچے میں اتار لیا،خدا کی رحمت ساتھ تھی،وہ دونوں کسی بڑے حادثے سے بچ گئے تھے۔صرف بازغہ کا ہاتھ کار کی کھڑکی سے ٹکرایا تھا۔

”اف خدایا۔“شیراز نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”شکر کرو،جانیں بچ گئیں۔“بازغہ بولی۔

”تمہارے ہاتھ میں تو بہت چوٹ آئی ہے نا۔“شیراز اس کا ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

”نہیں اللہ کا شکر ہے،خراش تک نہیں آئی۔“بازغہ بھی اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”درد تو ہوگا۔“شیراز کی آنکھوں میں فکر مندی تھی۔اس کی تکلیف کے احساس سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”بالکل مطمئن رہو،درد بھی نہیں ہے۔“

”مجھے بہت افسوس ہے،میری وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی۔“اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ابھی تو نہیں اٹھانی پڑی ہے،ہاں اگر تمہاری ڈرائیونگ کا یہی حال رہا تو تکلیف ہی نہیں،ایک دن موت کو بھی اپنا وار کرنے کی مہلت مل جائے گی۔“بازغہ ہنستے ہوئے بولی۔

شیراز نے ایک دم اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”خدا کے لیے۔۔۔یوں نہ کہو۔“وہ شرمندہ سا ہو گیا۔”کیا کروں،تمہاری قربت میں دل و دماغ میں مدہوشی سی طاری ہو جاتی ہے۔“

”لیکن اب تو میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہی رہتی ہوں۔“وہ بولی۔

”اور ہر وقت میں مدہوش رہتا ہوں۔“اس نے کار دوبارہ سڑک کے رخ موڑتے ہوئے کہا۔

”اس کا ایک ہیرا نکل گیا۔“بازغہ اپنی کلائی میں کنگن گھماتے ہوئے بولی۔

”چلو ہیرے ہی پر بلا ٹل گئی۔“شیراز نے کہا۔

بازغہ نے یونہی جھک کر نیچے دیکھا۔سیٹ کے نیچے پڑا ننھا سا ہیرا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

”مل گیا۔“وہ اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”جوہری سے لگوا لیں گے۔“شیراز نے کہا تو بازغہ نے ہیرا پرس میں رکھ لیا۔

دوسری صبح آفس جانے کے لیے شیراز کار میں بیٹھا تو بازغہ حسب عادت ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہہ رہی تھی۔جب ہی شیراز کی نظر اس کی کلائیوں پر پڑی تو اسے کنگن کا نکلا ہوا ہیرا یاد آ گیا۔

”لاؤ بازغہ یہ کنگن دے دو،جوہری سے اس میں ہیرا جڑوا لاؤں گا۔“وہ بولا۔

”لیکن کیسے؟یہ تو میرے ہاتھ میں ہیں۔“بازغہ نے کہا۔

”تو اتار دو نا۔“وہ بولا۔

”نہیں شیراز،یہ میں نے اتارنے کے لیے تھوڑی پہنے ہیں،یہ میری موت کے بعد ہی میرے ہاتھوں سے جدا ہو سکتے ہیں۔“بازغہ جذباتی سی ہو گئی تھی۔

”بھئی تھوڑی دیر کے لیے اتارنے کو کہہ رہا ہوں۔“وہ بولا۔

”نہیں!ایک پل کے لیے بھی نہیں۔“بازغہ کا لہجہ اٹل سا تھا۔

”یہ کیا عجیب منطق ہے؟“شیراز نے کہا۔

”کوئی منطق نہیں ہے،تمہارے پیار کا پہلا تحفہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“وہ بولی۔

”گھبراؤ نہیں!میں تمہیں اپنے پیار کے بہت سارے تحفے دوں گا،جیتے جاگتے تحفے۔“شیراز کی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی اور بازغہ جھینپ سی گئی۔

”اچھا لاؤ،اب تو دو۔“شیراز نے ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں شیراز!تم ایسے ہی میرے ہاتھ میں پہنے پہنے ہیرا جڑوا دو نا،بہت آسان کام ہے یہ تو۔“بازغہ نے لجاجت سے کہا۔

چلو ٹھیک ہے،شام کو جوہری کی دکان پر چلنا،پھر وہی کچھ بتا سکے گا۔“شیراز نے کہا اور اسے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔شام کو وہ شیراز کے ساتھ جوہری کی دکان پر تھی۔

”دیکھیے جناب!یہ ہاتھ سے کنگن اتارنے پر راضی نہیں ہیں،یہ ہیرا اسی طرح کنگن میں لگانا ہے آپ کو۔“شیراز نے ڈبیہ میں بند ہیرا دکان دار کو تھماتے ہوئے کہا۔

”لیکن کیوں؟“جوہری کے لہجے میں ہلکا سا تعجب تھا۔

’’بس ان کی کوئی منطق ہے۔‘‘ شیراز نے بازغہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے بازغہ کے ہاتھ میں پہنے پہنے ہی ہیرا دوبارہ کنگن میں فٹ کر دیا۔

’’شکریہ۔‘‘ شوکیس پر سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بازغہ نے کہا۔

تمہاری عجیب وغریب منطق تو اس بے چارے کی سمجھ میں ہرگز نہیں آئی ہوگی۔‘‘ واپسی پر شیراز بولا۔

’’یہ تو قبر میں بھی میرے ساتھ ہی جاتا لیکن کیا کروں کہ مذہب نے دو گز کفن کے علاوہ کچھ لے جانے کی اجازت ہی نہیں دی۔‘‘ بازغہ اپنی سڈول خوبصورت کلائیوں میں پڑے بے شمار چھوٹے چھوٹے ہیروں جڑے خوبصورت کنگن کو گھماتے گھماتے گھماتے کیف آگیں لہجے میں کہہ رہی تھی۔

’’شیراز صاحب! معذرت کے ساتھ، اس کاغذ پر اپنے دستخط کر دیجیے۔‘‘ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی آواز پر وہ چونکا۔ اس نے اپنے آگے پڑے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے تو وہ کاغذ انہوں نے ایک فائل میں رکھ لیا۔

’’ہاں ایک آخری بات۔‘‘ انہوں نے اپنی میز کا دراز کھولا اور کاغذوں کا ایک پلندہ شیراز کے سامنے رکھ دیا۔

’’آپ کو شاید تعجب ہو یا نہ ہو، یہ کاغذات کا ایک پلندہ ہے جو انہوں نے اپنی موت سے دو گھنٹے پہلے مجھے بھجوا دیا تھا کہ یہ آپ تک پہنچا دیا جائے لیکن رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں تو یہ میں نے اپنی دراز میں محفوظ کر لیا تھا۔‘‘ سپرنٹنڈنگ صاحب نے کاغذات کا پلندہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

شیراز نے حیرت کے ساتھ یہ پلندہ اٹھایا اور کاغذوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگا۔

’’یہ ان کی تحریر ہے اور ظاہر ہے آپ پہچان گئے ہوں گے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے انہوں نے اپنی ہی کہانی بیان کی ہو۔‘‘ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ایک خاص نظر سے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔۔۔ ’’میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اس کی ایک ایک سطر پڑھی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ان کے کیس سے خصوصی دلچسپی تھی۔ محض اس لیے کہ دماغی لحاظ سے میں نے انہیں خصوصاً آخری دنوں میں زیادہ تر ایک نارمل خاتون پایا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں کوئی مرض نہیں تھا۔ وہ عام حالات میں بالکل تندرست دکھائی دیتی تھیں۔ ڈاکٹروں کے تفصیلی معائنے اور خصوصی تجزیے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ وہ کسی خاص جذبے یا خاص دباؤ کے تحت دیوانگی کی حالت میں مبتلا ہوئی تھیں ورنہ عام طور پر بالکل نارمل رہتی تھیں۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر فرحانہ مجھے ان کے ایک ایک پل کی خبر دیتی رہتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے ڈاکٹر فرحانہ سے قلم اور کاغذ کی فرمائش کی تو ڈاکٹر فرحانہ نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں دونوں چیزیں مہیا کر دیں۔ پھر بعد میں انہیں اکثر لکھنے میں مصروف پایا۔ ہم نے اپنے پیشہ وارانہ فرائض کے تحت یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کیا لکھتی ہیں، لیکن لکھتے وقت انہوں نے کسی کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔۔۔ اور ایک اور خاص بات‘‘۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے کچھ لمحے توقف کیا۔

’’جی وہ کیا؟‘‘ شیراز نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

’’وارڈ میں وہ تمام پاگل خواتین جو اکثر ہلا گلا کرنے پر آمادہ رہتی تھیں اور ہماری کوشش سے بھی کم ہی پرسکون ہوتی تھیں، ان کے ایک ذرا سے اشارے سے خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ہمیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ ان پر کوئی جادو سا کر دیتی ہیں۔‘‘

شیراز حیران رہ گیا۔

’’پھر؟‘‘ وہ کچھ اور سننا چاہتا تھا۔

’’مسٹر شیراز! آپ بہت خوش قسمت تھے کہ آپ کو ایسی خاتون ملیں جو قدرت کی طرف سے ایک نعمت تھیں آپ کے لیے۔ لیکن افسوس! ایک ذرا سی بات کے لیے آپ نے انہیں کھو دیا۔‘‘

سپرنٹنڈنٹ صاحب کی بات سن کر شیراز کا دل تڑپ کر رہ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب پھوٹ پڑا۔

’’مجھے افسوس ہے‘‘۔۔۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ’’لیکن اب صبر کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔۔۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔‘‘

’’ہاں۔۔۔ کاش۔۔۔!!‘‘ شیراز نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

’’مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا تو کوئی حق نہیں اور پھر ہمارے پاس یا آپ کے پاس بھی اتنا وقت کب ہوگا کہ ہم کھل کر تفصیل کے ساتھ کوئی بات کر سکیں۔‘‘ سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگے۔ ’’لیکن جیسا کہ آپ نے مسز شیراز کو یہاں داخل کرواتے وقت ہمارے پوچھنے پر کچھ باتیں ہمیں بتائیں تھیں، ان کی روشنی میں کچھ کہنا چاہوں گا۔‘‘

’’جی۔۔۔ جی آپ فرمائیے!‘‘ شیراز نے ان کے شفقت آمیز لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

’’وہ۔۔۔ آپ کی بیوی تھیں اور آپ ان کے شوہر۔۔۔‘‘ وہ بات کرتے ہوئے کچھ رک سے گئے۔

’’جی کہیے!‘‘ شیراز ہمہ تن گوش تھا۔

’’جس طرح شوہر کا حق بیوی پر ہے، اسی طرح بیوی کا حق بھی شوہر پر ہے۔ مرد عورت سے اپنے حقوق چاہتا ہے تو عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے مرد یعنی اپنے شوہر سے اس کی توقع رکھے۔‘‘

’’جی جی بالکل! میں سمجھتا ہوں۔‘‘ شیراز نے تائید کی۔

’’اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کی حفاظت کا ذمہ سونپا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اس کے ہر قسم کے حقوق کا خیال رکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اس کا حق ادا کیا۔۔۔ لیکن ایک نتیجہ میں نے اخذ کیا ہے۔‘‘ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے شیراز کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’جی!‘‘ شیراز نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی والدہ۔۔۔اور پھر آپ نے بھی اپنی نیک نہاد بیوی کو صرف ایک چھوٹی سی خواہش پر قربان کر دیا؟''

شیراز سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔اس کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔وہ خاموش رہا اور سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی خاموش ہو گئے۔

شیراز نے سارا سامان سمیٹا اور اٹھ کھڑا ہوا۔اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

''اچھا اب اجازت دیجیے!''اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میری بات کا آپ نے برا تو محسوس نہیں کیا؟''

''جی نہیں۔۔۔جو کچھ آپ نے کہا، بالکل درست ہے اور مجھے اس کا گہرا احساس ہے۔میری زندگی میں بس ایک پچھتاوا رہ گیا ہے۔شاید میں اب زندگی بھر اس پچھتاوے سے باہر نہ نکل سکوں۔''

''نہیں۔۔۔خود پر قابو رکھیے۔اب آپ پر ایک دوسری زندگی کی محافظت کا فرض عائد ہو چکا ہے۔میرا سب کچھ کہنے کا یہی مقصد تھا۔''

''خدا حافظ۔''وہ بولا۔

''خدا حافظ!''انہوں نے جواب میں خوش دلی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

شیراز تھکے تھکے قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔چوکیدار سے بازغہ کی آخری آرام گاہ کا پتہ پوچھتے ہوئے اس کا دل لہولہو ہو رہا تھا۔کیسا عجیب مقام آیا تھا۔اپنی عزیز از جان ہستی کا پتہ بھی غیر سے معلوم کرنا پڑ رہا تھا۔وہ تو اس کے نام ونشان سے بے خبر تھا۔وہ جو کبھی اس کے دل میں ہی رہا کرتی تھی۔چوکیدار کی نشاندہی پر وہ قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔ہسپتال سے کچھ فاصلے پر چھوٹی سی بستی آباد تھی اور بستی سے باہر چھوٹے سے قبرستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں بازغہ بیٹھی نیند سو رہی تھی۔ڈھلتی دوپہر کے سائے زمین کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ہرے بھرے درختوں میں گھرے قبرستان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔خاموش بستی کے مکین اپنی آرام گاہوں میں میٹھی اور بے خبر نیند سو رہے تھے۔وہ بوجھل قدم اٹھاتا آہستہ آہستہ اس کی قبر پر پہنچ گیا۔یادوں کا ریلا پھر دماغ میں آ گھسا۔کانوں میں بازغہ کی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ضبط کا یارا نہ رہا۔حوصلوں کے بندھن ٹوٹ گئے۔دل میں امنڈتا سیلاب سارے بند توڑ کر آنکھوں کے راستے پورے زور وشور سے بہہ نکلا۔

''بازغہ مجھ سے ملے بغیر چلیں گئیں تم۔۔۔یہ کیا ظلم کیا تم نے۔۔۔ناراض ہو مجھ سے؟میں جانتا ہوں میں تمہارا مجرم ہوں،آج میں تمہاری وجہ سے بچوں کا باپ ہوں،مجھے تمہاری محتاجی کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔''

دوزانو جھکا ہوا وہ زیر لب کہہ رہا تھا۔آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔اس کی آنکھوں میں جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

اس نے بڑے بڑے دکھ چپ چاپ اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار لیے تھے۔روتے ہوئے مرد نہ اسے پسند تھے اور نہ بازغہ کو۔

''مردوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔''بازغہ کہا کرتی۔

''کیوں بھلا؟کیا ان کی آنکھیں پتھر کی ہوتی ہیں؟''شیراز ہنس دیتا۔

''مرد روتے ہوئے زہر لگتے ہیں۔مردوں کو بہت حوصلہ مند ہونا چاہیے،عورتوں کی طرح آنسو بہاتے ہوئے مرد مجھے تو بہت برے لگتے ہیں۔''وہ کہنے لگی۔

''ہاں یہی میرا بھی خیال ہے،میری آنکھوں میں تو آج تک ایک بھی آنسو نہیں آیا۔''شیراز کہتا۔

''ہاں تمہارا تو دل ہی پتھر کا بنا ہے،دکھ اور سکھ کے احساس سے بے نیاز۔''بازغہ مذاق سے کہتی۔

''اللہ نے مجھے پہاڑوں جیسا حوصلہ دیا ہے،سارے دکھ میں اپنے اندر اتار لیتا ہوں۔''وہ کہتا۔

اور آج اس کی قبر پر اس کے حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔

''بازغہ تمہیں روتے ہوئے مرد بہت برے لگتے تھے نا۔اور میں رو رہا ہوں۔۔۔بہت برا ہوں میں!میرے پہاڑوں جیسے حوصلے بھربھری ریت کی مانند بکھر گئے ہیں۔۔۔مگر تم۔۔۔تم تو اب یہ نہیں دیکھ سکتیں۔میں روؤں یا ہنسوں،تمہیں اس سے کیا فرق پڑے گا۔آہ۔۔۔میں نے تمہیں کھو دیا۔تمہیں وہ سکھ نہیں دیا جو تمہارا حق تھا۔تمہیں سکون نہیں دیا،جو ہر عورت چاہتی ہے۔مگر تم نے تو مجھ سے کچھ مانگا ہی نہیں تھا،میں نے ہی کچھ طلب کیا تھا جو تم مجھے دے نہ سکیں۔لیکن میں جانتا ہوں،اس میں تمہارا کیا قصور تھا،کچھ بھی نہیں۔تم اندر ہی اندر ٹوٹ گئیں اور میں باخبر ہو کر بھی انجان سا ہو گیا۔بازغہ۔۔۔بازغہ۔۔۔بازغہ۔''وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی حالت میں رہتا کہ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔اس نے مڑ کر دیکھا۔ایک بزرگ صورت آدمی اس کے پاس کھڑا تھا۔

''دیکھو بھائی!''اس نے نہایت شفقت سے کہا۔''مرنے والا جو بھی ہے،ظاہر ہے تمہارا کوئی عزیز ہے اور تمہیں دل وجان سے پیارا ہے۔لیکن اس طرح رونا بھی ٹھیک نہیں۔اس طرح تو اسے اور بھی تکلیف ہوگی۔اس کی روح پریشان ہوگی،مرنے والوں کی قبروں پر بیٹھ کر اس طرح رویا نہیں کرتے،صبر سے کام لیتے ہیں اور اس کے ابدی سکون کے لیے دعا کرتے ہیں۔''

شیراز نے بزرگ کی باتیں سن کر خود پر قابو پایا۔اس بزرگ نے اسے دلاسا دیا اور پھر وہ آگے بڑھ کر ایک قبر کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

شیراز کو یاد آیا۔ایک بار بازغہ نے بھی نہ جانے کس بات پر اسے بتایا تھا کہ اگر کوئی مر جائے تو قبر پر کھڑے ہو کر رونا نہیں چاہیے۔اگر خود پر قابو نہ ہو تو دل میں رو لینا چاہیے کیونکہ بلند آواز کے ساتھ رونے سے مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔کیسی عجیب بات تھی کہ یہی بات اس بزرگ نے بھی اسے سمجھائی۔اسے محسوس ہوا کہ یہ بات اسے یاد کروانے کے لیے اس بزرگ کو پردۂ غیب سے بازغہ ہی نے بھیجا ہے۔

یک لخت اسے محسوس ہوا کہ بازغہ کے ساتھ اس کا رشتہ اب بھی باقی ہے۔اب بھی بازغہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے صبر وسکون کے لیے مر کر بھی دعا گو ہے۔شیراز نے دعا کے لیے ہاتھ

اٹھائے اور چپکے چپکے جو کچھ اسے یاد تھا، پڑھتا رہا۔ پھر اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ آنسوؤں کا سیلاب تھم چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہ اٹھا اور بازغہ کی قبر پر درد بھری نظر ڈالتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر واپس آنے والی راہوں پر ہولیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو خاصی رات ہو چکی تھی۔

''بہت دیر ہو گئی بیٹا!'' بیگم قدوس نے کہا۔

''جی۔'' شیراز ہولے سے بولا۔

''کہیں گئے تھے کیا؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''مینٹل ہسپتال چلا گیا تھا۔'' شیراز کا لہجہ بہت مدھم تھا۔

''ہاں یاد آیا، انہوں نے سامان وغیرہ لے جانے کے لیے کہا تھا جو امانت کے طور پر ان کے پاس محفوظ تھا۔'' بیگم قدوس کو یک دم یاد آ گیا۔

''وہی لینے گیا تھا۔'' شیراز نے بتایا۔

''تو لے آئے۔'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''ہاں!'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

''وہیں رہنے دیتے۔'' بیگم قدوس کے منہ سے یک دم یہ فقرہ نکل گیا لیکن پھر انہیں کچھ ندامت سی ہونے لگی۔

''اچھا بیٹا! ٹھیک کیا تم نے!''

''ممی! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ آپ ہی نے تو تاکید کی تھی کہ سامان لے آنا، اور پھر ان چیزوں سے میری یادیں بھی تو وابستہ ہیں۔'' وہ زچ ہو کر بولا۔

''نہ جانے یہ یادیں کب تمہارا پیچھا چھوڑیں گی۔'' اب ان کی پیشانی پر سلوٹیں سی پڑ گئیں۔

''شاید کبھی نہیں۔'' زیر لب کہتے ہوئے اٹیچی کیس میز پر رکھ کر وہ اسے کھولنے لگا۔

''کیا کرو گے اسے کھول کر، اپنا ہی دل برا کرو گے۔ بہتر ہے ایسے ہی مقفل کر کے کہیں رکھ دو۔'' بیگم قدوس بولیں۔

شیراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اٹیچی کیس وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سارہ اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ شاید گھر پر بھی نہیں تھی۔ اسے یکدم خیال آیا کہ اس نے شاپنگ کے لیے کہا تھا۔ کچھ نئے کپڑے خریدنے تھے۔ لیکن مینٹل ہسپتال جانے کی وجہ سے اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ ممکن ہے وہ خود ہی چلی گئی ہو۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور اٹیچی کیس کھولنے لگا۔ وہ بے قرار سا ہو گیا۔ ایک ایک چیز کو وہ بے قراری سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مہک اپنی سانسوں میں اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب دنیا میں اس کی خوشبو ہی تو رہ گئی تھی، اس کی محبتوں کی خوشبو، اس کے حسن کی خوشبو اور یہ خوشبوئیں اسے پاگل کیے دے رہی تھیں۔ جب ہی اس کے ہاتھ میں کنگن آ گئے۔ اس کا ذہن جل اٹھا۔ وہ کنگنوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ عین اسی لمحے بیگم قدوس اور سارہ اندر داخل ہوئیں۔

بیگم قدوس اس کے قریب آ گئیں۔ سارہ حیرت سے ہیروں سے جڑے ہوئے چمکتے کنگنوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کتنے خوبصورت کنگن ہیں۔'' سارہ نے شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' شیراز کی آواز سے درد جھلک اٹھا۔

''ہسپتال جاتے وقت میں نے اس کے ہاتھ سے اتارنے چاہے تو اس نے اس طرح کڑے تیوروں سے دیکھا کہ میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔'' بیگم قدوس کنگن اٹھاتے ہوئے ناگواری سے بولیں۔

شیراز نے دل میں سوچا: کیسے جدا کر دیتی وہ ان کو اپنے وجود سے، ان کے ساتھ تو اس کا بندھن تھا۔

سارہ نے خمار آلود آنکھوں سے شیراز اور پھر بیگم قدوس کی طرف دیکھا۔

''کیا میں پہن لوں۔'' اس نے بیگم قدوس سے پوچھا۔

''تمہیں پسند ہیں تو پہن لو بیٹا۔'' بیگم قدوس نے کنگن اٹھاتے ہوئے کہا۔

سارہ نے کنگن ان کے ہاتھ سے لے کر فوراً اپنے ہاتھوں میں پہن لیے۔

شیراز نے شدت درد سے آنکھیں بند کر لیں، اسے یوں لگا جیسے بازغہ کی روح خلاؤں میں تڑپ اٹھی ہو۔

''بیٹا! کھانا لگ چکا ہے، آؤ کھانا کھاتے ہیں۔'' بیگم قدوس نے شیراز کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی ممی!'' شیراز کا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ بیگم قدوس کا کہا ٹال نہ سکا۔

☆☆☆

رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شیراز کی آنکھیں بے خواب تھیں۔ آج کی رات بھی بے سکون ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے دل کا چین بھی بازغہ کے سنگ منوں مٹی تلے دب چکا ہے۔ عجیب سی بے چینی تھی، تڑپ تھی، کسک تھی۔ یادوں کی یلغار تھی اور وہ ان کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا، اعصاب شل ہوئے جا رہے تھے۔ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ دل پر چھائی غموں کی دھند کو دھواں بنا کر اڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاید دھند کی تہہ بھی دبیز تھی۔ اس کے ذہن پر یادوں کا غبار بڑھتا جا رہا تھا۔ سامنے بیڈ پر سار یہ بے خبر سو رہی تھی۔

ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ شیراز کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر سار یہ کی آنکھوں میں پہلے تو حیرانی امنڈ آئی، پھر اس کو تھوڑی سی ناگواری کا احساس ہوا۔

''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔'' اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں، نیند نہیں آ رہی۔'' شیراز نے ہولے سے کہا۔

''اچھا!۔۔کوشش کرتا ہوں۔'' شیراز نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا اور پھر واش روم کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے اندر برپا ہونے والے طوفان سے بے خبر سار یہ کروٹ بدل کر دوبارہ سو چکی تھی۔

''جب دل میں احساس کی بھٹی روشن ہو جائے اور جسم کا ایک ایک رگ و ریشہ اس کی تپش سے سلگ اٹھے تو پھر نیند کیسے آ سکتی ہے۔ میرے خواب تو احساس کی آگ میں جل رہے ہیں۔ پھر ان بے خواب آنکھوں کے لیے نیند کہاں سے لاؤں؟'' شیراز سوچنے لگا۔

رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اٹھا اور الماری میں سے بازغہ کی لکھی ہوئی کہانی لے کر باہر لان میں چلا آیا۔ رات کی رانی کی خوشبو سے سارا لان مہک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے اس کے سلگتے وجود سے ٹکرائے تو تپتے ذہن کو کچھ سکون سا ملا۔ نیلگوں آسمان کی بیکراں وسعتوں پر چاند مسکرا رہا تھا۔ دودھیا چاندنی میں سارے عالم کو منور کر رکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سنگ مرمر کے بنچ پر آ بیٹھا۔

''میں تم سے لکھنے کو کہا کرتا تھا بازغہ! عجیب اتفاق ہے تم نے کہانی لکھی بھی تو کہاں، ہسپتال کے افسردہ ماحول میں، اس وقت جب تم ہوش و حواس سے بیگانہ تھیں۔'' کاغذوں کا پلندہ کھولتے ہوئے اس نے زیر لب کہا۔

پہلے صفحے پر بڑے بڑے حرفوں میں کتاب کا نام تحریر تھا ''محبت کی میراث''۔ اس کے ذہن میں یاد کا کوندا لپکا۔ اس نے صفحہ پلٹا، اگلے صفحے پر تحریر تھا ''ان لوگوں کے نام جن کا دعویٰ ہے کہ وفا کسی کی میراث نہیں ہوتی۔'' گویا یہ انتساب کی عبارت تھی۔ شیراز کا دل زور سے دھڑکا۔ یادوں کا ایک زوردار ریلا ذہن میں در آیا۔ کچھ دیر بعد بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پا کر اس نے کئی صفحے پلٹ ڈالے۔ بازغہ کی ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر آنکھیں دھندلا سی گئی تھیں۔ کئی لمحے وہ خالی خالی نظروں سے صفحوں کو تکتا رہا، کیا لکھا تھا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس ایسے لگ رہا تھا جیسے سفید سفید صفحوں پر کسی نے نیلی سیاہی سے نقش و نگار بنا دیے ہوں۔ کچھ لمحے وہ یونہی بیٹھا رہا اور پھر آنکھوں میں آئی ہوئی نمی خشک ہونے لگی۔ نقش و نگار تحریر کی صورت اختیار کرنے لگے۔ تحریر کی زبان سمجھ میں آنے لگی۔ اپنا نام لکھا دیکھ کر وہ چونک اٹھا اور پھر بے اختیار تیزی سے سطروں پر اس کی نظریں پھیلنے لگیں۔ جلد ہی اسے بازغہ کا اپنا نام بھی لکھا ہوا نظر آ گیا اور پھر اس جو اس نے غور سے دیکھا تو شیراز نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شاید انہوں یعنی بازغہ نے اپنی ہی کہانی لکھی ہے۔ جبکہ میرے نام کی موجودگی سے صاف طور پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ بازغہ اور شیراز کی کہانی ہے اور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کو معلوم ہے کہ شیراز میں ہی ہوں۔ انہوں نے شاید کا لفظ محض احتیاطاً برتا ہوگا جب کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ بازغہ کی اپنی ہی کہانی ہے لیکن اس کہانی میں بازغہ تم نے میرے کردار کو کس طرح پیش کیا ہوگا، میں جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

وہ غم زدگی کی کیفیت میں اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہا تھا۔

کسے معلوم تھا کہ تقدیر تمہیں لکھنے کے لیے تمہاری اپنی ہی زندگی کا پلاٹ مہیا کرے گی۔ وہ بھی ایسے پاگل پن کی حالت میں جسے پاگل پن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا، اور شاید یہ بات کبھی تمہارے گماں میں بھی نہیں آئی ہوگی، لیکن کسے معلوم کہ تقدیر میں کیا ہے۔ ہم اپنی تقدیروں سے کتنے بے خبر ہوتے ہیں۔

تپتے ذہن سے وہ سوچے چلا جا رہا تھا۔ اس کے ماضی کا عکس ان سفید کاغذوں پر منتقل ہو چکا تھا۔ بیتے دنوں کے ڈھیر سارے لمحے اور الفاظ کے ان گنت سلسلے کاغذ کے سینے پر آویزاں تھے۔ جگہ جگہ ان کی محبتوں کی داستان بکھری ہوئی تھی، ان کی چاہتوں کی کہانیاں سموئی ہوئی تھیں۔ شیراز کی نظریں تیزی سے سطروں کے دوش بہ دوش چلنے لگیں۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں ہفتۂ طلباء بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی طلباء بڑے جوش و خروش سے تمام پروگراموں میں حصہ لے رہے تھے۔ سات دن، سات مختلف پروگرام تھے۔ ساری یونیورسٹی انہی ہنگاموں کی زد میں تھی، ہر طرف رونقیں تھیں، چہل پہل تھی، ہر چہرہ جوش و مسرت سے شاداں نظر آ رہا تھا، قہقہے ابل رہے تھے۔ پروگرام ترتیب کے مرحلے میں تھے۔ رونقیں تھیں، مسرتیں تھیں، تھوڑے دن کے لیے پڑھائی کی فکر سے بے نیاز ہو کر نوجوان فرصت کے ان لمحوں کو یادگار بنانے کے لیے کیا کیا جتن کر رہے تھے۔ غرض پوری یونیورسٹی مسرتوں اور قہقہوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ چھٹے دن

تقریری مقابلہ تھا۔ بازغہ نے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ مقابلے کا عنوان تھا "وفا کسی کی میراث نہیں ہوتی۔" بازغہ نے موضوع کی کی مخالفت میں پر زور دلائل سے لدی پھندی اپنی تقریر بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ ایسے ایسے دلائل ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے تھے کہ اگر ان پر سب مرد متفق ہو جاتے تو وفاؤں کے سارے حقوق عورتوں کے نام محفوظ کیے جا سکتے تھے۔ ویسے بھی اس سلسلے میں اس نے اپنے اردگرد کے ماحول سے خاصا تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ بچپن سے اب تک عورتوں کو وفا کا حق ادا کرتے اور مردوں کو بے وفائی کرتے ہی دیکھا سنا اور پڑھا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اللہ میاں نے بندوں کو بناتے وقت عورتوں والے خمیر میں وفاؤں کے جذبے جس قدر کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، مردوں میں اسی قدر بے وفائی اور خود غرضی کا مادہ بھر دیا تھا۔ ایثار و وفا کے خمیر سے گوندھے ہوئے بدن کا نام عورت اور بے وفائی کے خمیر سے بنائے ہوئے مجسمے کا نام مرد رکھا تھا، اور اب بازغہ کو موقع مل رہا تھا کہ وہ کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔ اس نے بڑی محنت سے تقریر تیار کی تھی۔ کتنی ہی مرتبہ ریہرسل کر کے دیکھی تھی۔ حالانکہ وہ کئی مرتبہ مقابلوں میں حصہ لے چکی تھی۔ مقابلے کیے بھی تھے، انعامات بھی حاصل کیے تھے لیکن اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی جوش اس کے ذہن پر سوار تھا۔ مقابلے والے دن پورا آڈیٹوریم سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقرر موضوع کی مخالفت اور موافقت میں ایک سے ایک بڑھ کر دلیل دیتے ہوئے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ تالیاں بج رہی تھیں، ہوٹنگ بھی جاری تھی، دلچسپ فقرے اچھالے جا رہے تھے، ہر شخص اپنی جگہ چاق و چوبند بیٹھا پورے انہماک سے مقرروں کے دلائل دلچسپی سے سن رہا تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھری ہوئی تھیں اور سامعین پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر مائیک پر شیراز احمد کا نام پکارا گیا۔ ایک ہی درسگاہ میں ہوتے ہوئے اس نے شیراز کو دیکھا تو کئی مرتبہ تھا لیکن کبھی بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک سال سینئر تھا اور بازغہ ایک سال جونیئر۔ شیراز ڈائس پر آیا۔ ایک طائرانہ نگاہ سامعین پر ڈالی اور گھن گرج کے ساتھ اپنی تقریر کا آغاز کر دیا۔ وہ موضوع کی موافقت میں بول رہا تھا۔ بہت جوش تھا اس کے لب و لہجہ میں، اور بہت اعتماد تھا اسے اپنے لفظوں پر۔ اس نے اپنی تقریر میں بہت وسیع نظریات اور خیالات سموئے تھے۔

"جناب صدر اور معزز حاضرین! یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ عورت وفا کی پتلی اور مرد بے وفائیوں کا مجسمہ ہے۔ راہِ عشق میں اگر عورت نے قدم بڑھائے ہیں تو مرد بھی اس کے ہم رکاب رہا ہے۔ بتائیے کیا شیریں اپنے جذبۂ عشق میں اکیلی تھی، کیا فرہاد نے اس کا ساتھ نہیں دیا، سنگلاخ پتھروں سے دودھ کی نہر نکالنا کیا مردوں کی بے وفائی کا مظہر ہے؟ کیا لیلیٰ نے اکیلے ہی میدان عشق پار کیا تھا؟ کیا مجنوں اس کی یاد میں دیوانہ ہو کر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک نہیں چھانتا رہا؟ ہیر رانجھا کی محبت پر نظر ڈالیے، سسی پنوں کو لیجیے، سوہنی مہینوال کو دیکھیے۔ کون سی داستان ہے جس میں وفا کا سہرا صرف عورت کے سر ہے؟ خالق کائنات نے تخلیق کرتے وقت ایثار و محبت اور قربانی کا جذبہ مرد اور عورت دونوں کو برابر عطا کیا ہے۔ دونوں کے دل ان ہی جذبوں سے مسحور اور سرشار ہیں۔ اس کائنات کا نظام اسی جذبے سے چل رہا ہے۔ ایک مرد ایک عورت سے عہدِ وفا باندھ کر اسے اپنے نکاح میں لیتا ہے، کیا عمر بھر کا یہ ساتھ مردوں کی وفا ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، مرد وفادار ہے، اس نے ہر قدم پر، ہر عمل سے اپنی وفاؤں کا اظہار کیا ہے۔ وفا عورت کی طبیعت کا بھی خاصہ ہے لیکن اس میں وہ کسی بھی طرح مرد سے برتری نہیں لے گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت نے اپنی بعض مجبوریوں کو بھی وفا کا نام دے ڈالا ہے۔ عورت بعض اوقات وفا کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اپنے حالات سے مجبور ہو کر وہ وفاؤں کا دامن تھام لیتی ہے لیکن مرد کی راہ میں ایسی کوئی مجبوری کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ تو سچے دل سے، سچے جذبے سے وفا کرتا ہے۔ اس لیے میں موضوع کی موافقت میں یہی کہوں گا کہ وفا کسی کی میراث نہیں ہے۔ مرد عورت دونوں وفادار ہوتے ہیں اور دونوں بے وفا بھی۔"

کتنی لمبی تقریر کی اس نے، بازغہ کو کچھ احساس نہ ہوا۔ وہ تو بس اس کے جوشِ خطابت سے متاثر ہوئی جا رہی تھی۔ اسے ہوش تب آیا جب وہ تقریر ختم کر کے جا رہا تھا اور یوں ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ دو ایک مقرر اور آئے اور پھر بازغہ کا نام پکارا گیا۔ گھن گرج والی تقریریں سن سن کر اس کے خیالات میں طغیانی آ گئی تھی۔

وہی جو وفا کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہوتے، آج کیا کیا زوردار طریقے سے اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خیالات کی رَو میں بسی ہوئی وہ ڈائس تک پہنچ گئی اور پھر اسے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ بس خیالات کا ایک سیلاب تھا جو اس کے منہ سے ابل رہا تھا۔ کئی دن سے یاد کی ہوئی تقریر کا بڑا حصہ اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ بس اس کا ذہن تو سمندر کی مانند وسیع ہو گیا تھا، جس میں سے خیالات کے قطرے موتی بن بن کر ابل رہے تھے۔ وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔

"جنابِ صدر! یہ وفا کے نام لیوا صرف ایک مدت تک وفا پرست رہتے ہیں اور پھر مطلب نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مرد ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری شادی نہ کرتے۔ شادی سے پہلے محبت کے خزانے لٹانے والے شادی کے بعد بے التفاتی کیوں برتتے ہیں۔ کیا شادی کے بعد عورت پہلے جیسی نہیں رہتی۔ کیا اس کی شکل و صورت بدل جاتی ہے لیکن ان مردوں کی وفاؤں کے ڈھنگ بدل جاتے ہیں۔ اگر خدا مردوں کو بھی تھوڑا سا وفا کا مادہ دے دیتا تو آج عورت اتنی دکھی نہ ہوتی۔ جدھر نظر ڈالیے آپ کو مردوں کے ستم کی تصویر نظر آ جائے گی لیکن کوشش سے ڈھونڈنے کے بعد بھی آپ کو کوئی مرد ایسا نظر نہیں آئے گا جو عورتوں کے ہاتھوں ستایا ہوا ہو۔ کیا یہی مردوں کی وفا ہے جس کی وجہ سے ازل سے لے کر آج تک عورت دکھ اور مظلومیت کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے۔"

نہ جانے وہ کیا کیا بولتی رہی۔ کئی مرتبہ تالیوں کی آوازیں سنائی دیں لیکن اسے تو کچھ بھی ہوش نہ رہا تھا۔ لڑکیاں اس کی ہمت کی داد دے رہی تھیں اور لڑکے ہوٹنگ کر رہے تھے۔ اس کا جی تو ہلکا ہو ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی تو بہت سی باتیں کہنے کو تھیں اس کے پاس، لیکن وقت محدود تھا، اس لیے اسے مجبوراً واپس آنا پڑا۔ کچھ دیر بعد مقابلہ ختم ہو گیا اور سب بے چینی سے نتائج کا انتظار کرنے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد فیصلے کا اعلان ہوا تو شیراز احمد کو اول انعام کا حق دار قرار دیا گیا۔

لڑکوں نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔ تالیوں سے سارا ہال گونجنے لگا اور بازغہ کو یوں لگا جیسے سب مل کر عورتوں کی وفا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کی ساری کوششیں، سب محنتیں ضائع ہو گئی تھیں۔ تمام کوششوں کے باوجود وہ عورت کا جذبۂ ایثار و وفا تسلیم کرانے میں ناکام رہی تھی۔ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دھندلائی آنکھوں سے اس نے شیراز کو صدرِ جلسہ سے انعام وصول کرتے دیکھا۔ شیراز کے ہونٹوں پر دلفریب فاتحانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ شاید لڑکیوں کے تمام دعووں کو باطل قرار دے کر ہرانے میں فخر و انبساط سے گردن اکڑ گئی تھی۔ ڈائس سے نیچے اترتے ہی لڑکوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لے کر اس کا گلا پھولوں کے ہاروں سے بھر دیا۔ وہ سب کے بیچ یوں کھڑا تھا جیسے کوئی فاتح میدانِ جنگ سے واپسی پر اپنی قوم سے داد و تحسین حاصل کر رہا ہو۔ دوسرا انعام رضا زیدی کو ملا تھا اور تیسرے انعام کے لیے بازغہ کے نام کا اعلان ہو رہا تھا لیکن وہ ہاری ہوئی فوج کے کمانڈر کی طرح اپنے خیالوں میں گم سم بیٹھی تھی۔ برابر والی لڑکی نے ہوکا دے کر اسے مائیک سے ہوتے ہوئے اعلان کی طرف متوجہ کیا۔ وہ بادلِ نخواستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تھکے تھکے قدموں سے انعام وصول کرنے پہنچ گئی۔ یہ انعام اس کی شب و روز کی محنت سے تیار کی ہوئی تقریر کے صلے میں دیا جا

رہا تھا۔ ورنہ وہ تو سب کچھ ہار گئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ہار اس کی اپنی نہیں بلکہ ساری دنیا کی عورتوں کی ہار تھی۔ اس کی کوئی دلیل، کوئی بات بھی تو عورتوں کو سرخرو نہیں کر سکی تھی۔ بھلا وہ عورتوں کی کوئی خوبی، کوئی صفت کیسے مان لیتے۔ اس طرح تو ان کی انا، ان کی مردانگی مجروح ہو جاتی۔

وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔ انعام حاصل کرنے کی اسے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بس یونہی ٹوٹے دل کے ساتھ وصول کر لیا تھا۔

پروگرام کے اختتام تک وہ سب کچھ بھول چکی تھی یا اس نے شاید اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ کامیاب ہونے والوں کو مبارکباد دینا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ چپ چاپ ٹوٹے دل کے ساتھ وہ گھر واپس آ گئی اور پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ دوستوں نے اکسایا کہ جیتنے والوں کو مبارکباد نہ دینا کم ظرفی کی نشانی ہے۔ تمہیں خود جا کر شیراز کو مبارکباد دینی چاہیے لیکن اس کا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ بھلا کس طرح اپنے نظریات، اپنے دلائل رد کرنے والے کو خود اپنے منہ سے مبارکباد کے الفاظ کہہ سکتی تھی، وہ ٹال رہی تھی لیکن دوستوں کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ رضیہ کا خیال تھا کہ وہ تمہاری اس تنگ دلی کو تمہاری شکست سمجھے گا۔ منور کی رائے تھی کہ مقابلوں میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے، تمہیں اسے مبارکباد دے کر اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے اور خدا جانے کس کس کا کیا کیا خیال تھا۔ وہ سب مسکرا کر اسے ہم خیال بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پھر وہ راضی ہو ہی گئی، اوپری دل سے ہی سہی لیکن اسے مبارکباد دے کر اپنے دل کا بوجھ ضرور ہلکا کرے گی۔ کئی مرتبہ اس نے شیراز کو دیکھا لیکن ہر مرتبہ وہ دوستوں کے جمگھٹے میں ہی نظر آیا۔ اس دن وہ پیریڈ اٹینڈ کر کے لائبریری میں چلی آئی۔ تب ہی وہ اسے ایک کونے میں تنہا بیٹھا نظر آ گیا۔ سر جھکائے وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بازغہ کے قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اسے آج پہلی مرتبہ کس طرح مخاطب کرے۔ اس نے تو آج تک اس سے ایک لفظ بھی بات نہیں کی تھی۔ پھر کتاب لے کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ ہی گئی۔

''مبارک ہو!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

شیراز نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔ ''جی۔۔۔ کس چیز کی مبارکباد؟''

''تقریری مقابلہ جیتنے کی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ! بہت جلد آپ کو خیال آ گیا۔'' شیراز نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''میں بھول گئی تھی۔'' بازغہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''شکریہ! میرا خیال ہے آپ نے بہت سوچ سمجھ کر مبارکباد دی ہے۔'' شیراز مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جی۔'' بازغہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''یعنی آٹھ دنوں میں میری باتوں پر بہت غور و خوض کرنے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچی ہوں گی کہ حق پر میں ہی تھا۔ میرے خیالات سے متفق ہو کر ہی اب آپ مجھے یہاں مبارکباد دینے آئی ہیں۔'' شیراز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔'' بازغہ اس کی بات سن کر تڑپ سی اٹھی۔

''میں آپ سے اور آپ جیسے خیالات رکھنے والوں سے نہ کبھی متفق ہوئی ہوں، نہ ہو سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں تلخی سی گھل گئی۔

''اچھا!۔۔۔ ویسے ایک نہ ایک دن آپ کو یہ سچائی تسلیم کرنی پڑے گی کہ وفا کسی کی میراث نہیں ہوتی۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس سے گفتگو بڑھانا گویا ایک طویل بحث کو جنم دینا تھا اور بازغہ دوبارہ ایسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے کتاب اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔

''کون سا ادب پڑھنا پسند کرتی ہیں آپ؟''

''کیا مطلب؟'' بازغہ نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔

''میرا مطلب ہے انگریزی یا اردو۔'' وہ بولا۔

''اردو ادب۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''بہت خوب۔'' کون سے شاعر یا ادیب پسند ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''آپ میرا انٹرویو کر رہے ہیں کیا؟'' اس نے غصے سے کہا۔

''جی نہیں! میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔'' شیراز گڑبڑا سا گیا اور کتاب کھول کر سامنے رکھ لی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ کتابوں پر نظریں جمائے دونوں نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

''ویسے آپ تقریر بہت اچھی کرتی ہیں۔ میں آپ کی صلاحیت کا معترف ہوں۔'' کچھ دیر بعد شیراز نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

''جی، شکریہ!'' بازغہ نے نظریں جھکا لیں۔

''بس ایک بات کا خیال رکھیں کہ جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ مواد جذباتی نہیں بلکہ سچا اور حقیقی ہونا چاہیے۔'' اس نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔

بازغہ کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔ ''میرا مقصد چمکتے ہوئے کپ حاصل کرنا نہیں بلکہ لوگوں کے سامنے سچی اور صحیح بات لانا ہے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''اگر آپ حق پر ہوتیں تو میری ہار یقینی تھی۔'' اس نے کہا۔

''اب ان باتوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟'' وہ الجھ کر بولی۔

''آپ کو قائل کرنا۔'' اس نے مسکراتی آنکھوں سے بازغہ کو دیکھا۔

''میں ان خالی خولی باتوں سے قائل ہونے والی نہیں ہوں۔'' بازغہ نے کہا۔

''ثبوت چاہتی ہیں آپ؟'' وہ بازغہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دلنشیں انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اور خدا جانے ان آنکھوں میں کیا تھا کہ بازغہ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گھبرا کر بازغہ نے اپنی نظریں جھکا لیں اور کتابیں سمیٹ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہو چکی پڑھائی۔'' شیراز بولا۔

''جی! میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' بازغہ نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''اوہو! یاد آیا، کلاس تو میری بھی شروع ہونے والی ہے۔'' شیراز بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ساتھ ساتھ لائبریری سے باہر آ گئے۔

پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ اس دن وہ لائبریری کے تنہا گوشے میں بیٹھی انہماک سے نوٹس تیار کرنے میں مصروف تھی کہ شیراز آ گیا۔

''ہیلو۔'' وہ آتے ہی خوش دلی سے بولا۔

''ہیلو۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''بہت زور و شور سے پڑھائی کی جا رہی ہے؟'' وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''امتحان نزدیک ہیں۔'' اس نے سر جھکائے لکھتے ہوئے جواب دیا۔

''بے شک۔'' شیراز نے سرد آہ بھری۔

بازغہ سر جھکائے لکھنے میں مصروف تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''امتحان کے بعد یہاں سے جانا بھی پڑے گا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کیوں؟ کیا عمر بھی یہیں رہنے کا ارادہ کر کے آئے تھے؟'' بازغہ نے کہا۔

''نہیں! اس وقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' وہ ہنس دیا۔

''پھر اب کیا ہوا؟'' بازغہ بولی۔

''اس گلشن میں دل لگا لیا ہے، اب یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ بولا۔

''باہر نکلنے پر اندازہ ہو گا کہ دنیا میں اور بھی کتنے خوبصورت گلشن موجود ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''ہاں! ہیں تو لیکن جو چیز کسی کو بھا جائے وہی سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔''

''پھر کیا یہی رہنا ہے؟'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''یہی تو مشکل ہے کہ جانے کو جی بھی نہیں چاہتا اور جانا بھی ضروری ہے۔'' وہ بولا۔

''کہیں جاب کرنے کا ارادہ ہے؟'' بازغہ نے یونہی پوچھ لیا۔

''جاب تو شاید ہم کر ہی نہیں سکتے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' بازغہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''والدِ بزرگوار نے کاروبار ہی اتنا پھیلا لیا ہے کہ اب ان سے اکیلے سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب ان کی آنکھیں یقیناً ہم پر لگی ہوئی ہیں، بس یوں سمجھ لیں کہ پڑھ لکھ کر ہمیں بھاڑ میں جھونکنا ہے۔'' وہ عجیب سی بے بسی سے بولا۔

بازغہ ہنس دی۔ ''کس چیز کا کاروبار ہے؟''

''امپورٹ ایکسپورٹ کا، قالینوں کا اور خدا جانے کتنے کاروبار ہیں ان کے۔'' وہ بولا۔

بازغہ چپ چاپ لکھنے میں مصروف ہو گئی۔

''کیا لکھ رہی ہیں؟'' تھوڑی دیر بعد شیراز نے سکوت توڑا۔

''نوٹس بنا رہی ہوں۔'' بازغہ نے بتایا۔

''اگر مزید نوٹس کی ضرورت پڑے تو میرے پاس موجود ہیں۔'' شیراز بولا۔

''جی نہیں، شکریہ!'' بازغہ نے کہا۔

''تکلف سے کام لے رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''نہیں تو۔'' بازغہ نے کہا۔

''پھر میرے بنائے ہوئے نوٹس پر اعتبار نہیں آپ کو؟'' شیراز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، آپ کے بنائے ہوئے نوٹس تو یقیناً بہت اچھے ہوں گے۔'' وہ بولی۔

’’تو گویا آپ میری ذہانت کی قائل ہو چکی ہیں۔‘‘ وہ بولا۔

بازغہ نے اسے دیکھا۔ وہ شریر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

’’بالکل نہیں۔‘‘ بازغہ بھی اس کے انداز میں جواب دیتے ہوئے مسکرا دی۔

’’پھر آپ کو میرے نوٹس لینے میں کیا اعتراض ہے؟‘‘ وہ بولا۔

’’اعتراض تو کوئی نہیں ہے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’پھر؟‘‘ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

’’میں اپنی مدد آپ کے اصول کی قائل ہوں۔‘‘ وہ بولی۔

’’سوچ لیجیے! وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس راہِ امتحان میں بہت سے مشکل مرحلے بھی آتے ہیں۔‘‘

’’جب آپ اس مشکل مراحل سے گزر گئے تو میں بھی گزر جاؤں گی۔‘‘ بازغہ کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔

’’بہت خوب! اعتماد بہت اچھی بات ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’شکریہ!‘‘ بازغہ نے کہا۔

کلاس شروع ہونے والی تھی، اس لیے دونوں کتابیں سمیٹے باہر آ گئے۔ بعض وقت ایسا بھی آتا ہے جب اعتماد کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ یقین کی منزل متزلزل ہونے لگتی ہے۔ بازغہ کو اپنی ذہانت پر اعتماد تھا لیکن اس پر اس وقت مایوسی چھانی شروع ہو گئی جب کوشش کے باوجود بہت سی پرابلم حل کرنے میں ناکامی ہو جاتی۔ امتحان کی جتنی اچھی تیاری وہ کرنی چاہتی تھی، اتنی اچھی ہو نہیں پا رہی تھی۔ جتنے عمدہ نوٹس بنانے کی آرزو تھی وہ پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی اور پر زیادہ اعتماد نہیں ہے اور شیراز سے مانگنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ بھلا اب وہ کس طرح اس سے کہے گی۔ اس نے تو اپنے آپ پر بے حد اعتماد کر کے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ پھر اس مقصد کے تحت اس کے پاس جانا اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے آگے شرمندگی اٹھانے کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی تھی۔ شیراز اگر پوچھ بیٹھا کہ کہاں گیا تمہارا وہ اعتماد تو وہ کیا کہے گی۔ اسے کوئی بھی جواب نہیں بن پڑے گا۔ خفت اور شرمندگی کا احساس اسے شیراز کے پاس جانے سے روک رہا تھا، اور تب ہی اس نے رضیہ کا سہارا لیا اور دوسرے ہی دن رضیہ نے اس کی تمام مطلوبہ چیزیں لا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

’’لو بھئی اپنا مطلوبہ سامان۔‘‘ وہ بازغہ کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

’’بندی شیراز صاحب سے ان کے پرانے نوٹس لے کر بازغہ کی خدمت میں حاضر ہے۔‘‘ وہ شرارت سے بولی۔

’’تم نے کیا کہا تھا۔‘‘ بازغہ نے ذرا لہجے کو سخت کرتے ہوئے کہا۔

’’یہی کہ بازغہ کو آپ کے نوٹس درکار ہیں۔‘‘ رضیہ نے اطمینان سے کہا۔

’’کیا؟‘‘ بازغہ ایک دم چیخ پڑی ’’تم نے میرا نام لے دیا۔‘‘

بھئی وہ پوچھنے لگا کہ نوٹس آپ کو چاہئیں۔‘‘ رضیہ نے بتایا۔

’’اُفوہ!‘‘ بازغہ نے سر تھام لیا۔ ’’بڑی بے وقوف ہو تم۔‘‘ اسے بے تحاشا غصہ آ گیا۔

’’بھئی اس میں ہرج ہی کیا تھا؟‘‘ رضیہ اپنی جان چھڑانے کی غرض سے ہنسی ہوئی چلی گئی۔

بازغہ کو اس کی بے وقوفی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ سارا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا تھا اس بے وقوف لڑکی نے۔ ساری اسکیم خاک میں ملا دی تھی۔ اس کا جی چاہا ابھی تمام نوٹس اٹھا کر شیراز کو واپس کر آئے لیکن اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ شیراز کو تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ اس کے اعتماد کا شیشہ چکنا چور ہو چکا ہے۔ اب کچھ صفائی پیش کرنا فضول ہی تھی۔ مجبور ہو کر اس نے تمام نوٹس سمیٹ لیے۔ شیراز کو سراہتے ہوئے جرنلوں میں سے اپنی مطلوبہ چیزیں اتار لیں۔ پھر واپسی کا مسئلہ آ گیا۔ دل تو شیراز کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ جی میں آیا کہ واپسی کا مرحلہ بھی رضیہ کے ذریعے ہی طے کرے لیکن احسان کے بعد شکریہ کے دو بول بھی نہ کہنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ناچار وہ فائل اٹھائے شکستہ قدموں سے شیراز کے پاس چلی آئی۔

’’شکریہ!‘‘

اس نے نوٹس شیراز کے سامنے رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ شیراز بولا۔

کچھ لمحے توقف کے بعد بازغہ نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ہونٹوں پر مخصوص سی مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بازغہ نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں، مبادہ وہ کوئی بات کہہ دے لیکن وہ کچھ نہیں بولا اور کچھ نہیں پوچھا۔ بس چپ چاپ اسے دیکھتا رہا اور بازغہ جلدی سے وہاں سے آ گئی۔ بعض اوقات سب کچھ اتنی خاموشی سے ہو جاتا ہے کہ اس کے ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا اور کچھ اتنی ہی خاموشی سے چپکے چپکے شیراز اس کے دل میں سماتا چلا گیا کہ اسے احساس تک نہ ہوا اور پتہ تب چلا جب وہ پوری طرح سے اس کی محبت کے سمندر میں ڈوب چکی تھی۔ محبت میں ڈوبے ہوئے کو کنارے کی خبر نہیں رہتی اور بازغہ کو بھی اس کی محبت کے بے کراں سمندر کا کوئی کنارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ہر طرف شیراز کی محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو خود بخود اس کے وجود میں سماتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، اس سمندر سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سب کچھ بے سود تھا۔ جس قدر وہ شیراز کا خیال دل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی اسی قدر وہ اس کے دل میں سماتا چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی محبت کے بے کراں سمندر سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ سب بے سود تھا۔ اس کے تصور کی جگمگاہٹ سے بازغہ کے شب و روز روشن ہو گئے تھے۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ ذہن سپنوں کے جال بنتا رہتا، اور وہ خاموش مسکراہٹ لیے

اپنے دل کی کارگزاریاں دیکھتی رہتی۔ یونیورسٹی کی خوبصورت لائبریری میں بیٹھے وہ گھنٹوں دنیا جہان کے موضوعات پر بحث کرتے۔ سرسبز سبزہ زار پر چہل قدمی کرتے ہوئے شیراز دلچسپ فقرے کہتا رہتا اور بازغہ ہنس دیتی۔ بڑی بڑی دیر وہ پڑھائی سے متعلق لیکچر دیتا رہتا۔ مشکل سے مشکل مسئلہ اس کے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتا رہتا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھے چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہتی اور اس کی دلکش شخصیت کے سحر میں کوئی رہتی۔

''کچھ آیا مزاج شریف میں؟'' سمجھاتے ہوئے وہ اچانک پوچھ بیٹھتا۔

''ہوں۔'' بازغہ ایک دم چونک پڑتی۔

''حاضر نہیں تھیں۔'' وہ اس کی چوری پڑتے ہوئے ہنس کر کہتا۔

''نہیں نہیں میں تو سب سن رہی ہوں۔'' وہ گڑبڑا سی جاتی۔

''اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے کہتا اور بازغہ خجل سی مسکراہٹ سے گردن جھکا لیتی۔

''اب شروع کروں؟'' تھوڑی دیر توقف کے بعد وہ پوچھتا۔

بازغہ نظریں اٹھا کر دیکھتی۔

''میرا مطلب ہے کہ کیا آپ خیالوں کی دنیا سے واپس آ چکی ہیں۔'' وہ کہتا۔

بازغہ جھینپ سی جاتی اور پھر سنبھل کر بیٹھ جاتی۔ پورے غور سے اس کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگتی۔ وہ نئے سرے سے سب کچھ سمجھانا شروع کر دیتا۔ یونہی باتوں باتوں میں وہ مشکل سے مشکل مسئلے کا حل کچھ اس طرح ذہن نشین کرا دیتا کہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ یوں وہ امتحان کی طرف سے خاصی مطمئن ہو گئی۔

ایک دن شیراز اس کے پاس آیا تو خاصا الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ ماں باپ بھی پتہ نہیں کس مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔'' وہ بینچ پر بازغہ سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟ کیا بات ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بچپن سے آزادی دیتے ہیں کہ اپنی مرضی سے کام کر سکتے ہو لیکن جب زندگی کے اہم فیصلے کا وقت آتا ہے تو پھر اپنی مرضی ٹھونسنا شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

بازغہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب میری زندگی کا فیصلہ ممی ڈیڈی خود کرنا چاہتے ہیں، زندگی میری اور فیصلہ ان کا، یعنی مجھے ان کے مرتب کیے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ ہے نا عجیب بات۔'' وہ بازغہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہوا کیا ہے آخر؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''مجھے تم سے شادی کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔'' اس نے بازغہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا کسی تمہید کے اس طرح کہا کہ بازغہ حیران رہ گئی۔

ایک لمحے کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ اظہار دل کے لیے تو لوگ ہفتوں خوبصورت موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں، آنکھوں میں دنیا بھر کی چاہت سموئے خوبصورت لفظوں میں اپنے جذبۂ دل کا اظہار کرتے ہیں لیکن شیراز نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس ایک ہی لمحے میں ایک ہی دم سب فاصلے طے کر لیے تھے۔ خوبصورت لفظوں کا سہارا نہیں لیا تھا۔ بس ایک دم ہی زمین سے اٹھا کر بازغہ کو آسمان کی وسعتوں میں پہنچا دیا تھا۔ کئی لمحے حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے کے بعد بازغہ ہوش میں آئی تو دل میں ایک دم اچانک ہی بہار آ گئی، ہر طرف ہریالی چھا گئی، پھول ہی پھول کھل اٹھے، پیار کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار اس کے وجود کو بھگونے لگی، اس کی روح تک سرشار ہو کر جھوم اٹھی اور پھر دوسرا لمحہ نہ جانے کس لمحے سے لرز اٹھا۔ اگر شیراز مجبوریوں کے جال میں جکڑا گیا تو؟ وہ لرز اٹھی۔ پریشان ہو کر اس نے شیراز کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی گہری گہری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور تب اس نے آہستہ سے بازغہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کر دو گی تو میں ساری دنیا سے ٹکر لے لوں گا۔'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

بازغہ کو اپنا وجود ہواؤں میں اڑتا محسوس ہوا۔ اس کا دل پھر سپنوں کی خوبصورت وادی میں چلا گیا۔ اگر مسافت ایک دم ختم ہو جائے اور اچانک منزل سامنے نظر آنے لگے تو اس خوشی کی کیا حد ہوتی ہے جو غیر متوقع نتیجے میں دل کی در آئی ہو۔ بازغہ کی محبت کی مسافت بھی ختم ہو گئی تھی۔ منزل اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ لیکن پھر فطری شرم و حیا آڑے آ گئی۔ حجاب سے آنکھیں بوجھل ہو کر جھک گئیں۔

''بولو میرا ساتھ دو گی؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

انکار کی گنجائش ہی کہاں تھی، وہ کب کی اس کی ہو چکی تھی، دل اسے من مندر کا دیوتا تسلیم کر چکا تھا۔ وہ تو ساری عمر زندگی کی اونچی نیچی، مشکل اور آسان راہوں میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

اس نے نظریں اٹھائیں، شیراز مسلسل اسے تک رہا تھا۔

''بولو نا!'' اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بازغہ نے خود سپردگی کے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

''تو گویا آگ دونوں طرف برابر کی لگی ہے۔'' شیراز کا قہقہہ اس کے کانوں سے ٹکرایا۔

بازغہ کا اقرار سنتے ہی وہ اپنی فطری شوخی پر اتر آیا۔ بازغہ جھینپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

’’پیریڈ اٹینڈ کرنا ہے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’ٹھیک ہے تم پیریڈ اٹینڈ کرو اور ہم میدانِ عشق فتح کرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔‘‘ ہنستے ہوئے کہہ کر وہ بھی ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

مدھری مسکراہٹ بازغہ کے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔ اس نے نظریں جھکا کر قدم آگے بڑھانے شروع کر دیئے۔ وہ بازغہ کی نس نس میں سما گیا تھا۔ آنکھوں کے راستے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دل کے چھپے گوشوں میں اپنا گھر بنا چکا تھا۔ اس کے خواب بازغہ کی آنکھوں میں بس گئے تھے، وہ ان دنوں بہت خوش اور مگن تھی، شیراز سے اب آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا، وہ پوری سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف ہو گیا تھا، جب بھی کبھی لان یا راہداری میں چلتے ہوئے آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیتا اور بازغہ جھینپ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چل دیتی۔

شیراز کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ ان دنوں وہ خاصا پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ لان میں بیٹھی تھی کہ وہ بھی وہیں چلا آیا۔

’’کیا بات ہے؟ پریشان دکھائی دے رہے ہو۔‘‘ بازغہ نے پوچھا۔

شیراز منہ سے کچھ بولے بغیر اسے دیکھنے لگا۔

’’امتحان کا خوف سوار ہے کیا؟‘‘ بازغہ نے پھر کہا۔

’’امتحان تو بچپن سے دیتا چلا آ رہا ہوں، اس کا کیا خوف۔‘‘ وہ لاپروائی سے بولا۔

’’پھر؟‘‘ بازغہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’سوچ رہا ہوں، کہیں ممی ڈیڈی ظالم سماج کے ٹھیکیدار بن کر ہمارے درمیان کوئی مضبوط دیوار بنانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔‘‘ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

بازغہ سن سی ہو گئی، انجانے خدشے سے دل لرز اٹھا۔

’’لیکن میں بزدل نہیں ہوں، تمہارے لیے دیوارِ چین بھی پھلانگ جاؤں گا۔‘‘ شیراز نے بڑے عزم سے مسکراتے ہوئے کہا تو بازغہ کی جان میں جان آئی اور اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

’’تم میرا انتظار کرو گی نا!‘‘ اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور بازغہ نے خود سپردگی کے عالم میں اس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

’’وعدہ؟‘‘ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

’’وعدہ!‘‘ بے اختیار بازغہ کے ہونٹوں سے پھسل گیا اور وہ اپنی جسارت پر خود ہی شرمندہ سی ہو گئی۔ پھر کئی دن یونہی گزر گئے، شیراز کے امتحان شروع ہو گئے اور وہ ان میں مصروف ہو گیا، بازغہ نے بھی سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ پھر اس کے امتحان بھی ختم ہو گئے۔ وہ دن یونیورسٹی میں شیراز کا آخری دن تھا، کتنی دیر سے سہیلیاں بازغہ کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھیں، بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئی، تب ہی شیراز آ گیا۔

’’ارے بھئی کبھی تو سہیلیوں کے جھرمٹ سے باہر مل جایا کرو۔‘‘

’’مجھے کیا پتا کہ آپ مجھے تلاش کر رہے تھے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’میری تلاش مکمل ہو چکی ہے، گوہرِ مقصود پا لیا ہے میں نے۔‘‘ وہ بازغہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو بازغہ بھی مسکرا دی۔

کچھ دیر وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا، بازغہ کو الجھن سی ہونے لگی۔

’’بازغہ!‘‘ تب ہی اس نے آہستہ سے پکارا۔

’’جی!‘‘ بازغہ بولی۔

’’کب تک انتظار کر سکتی ہو میرا؟‘‘ وہ بولا۔

’’تمام عمر۔‘‘ بے اختیار بازغہ کے منہ سے نکل گیا۔

’’نہیں بھئی! ساری عمر کا انتظار نہیں، بڑھاپے میں شادی کرتے کیا اچھے لگیں گے۔‘‘ وہ شرارت سے ہنستے ہوئے بولا۔

بازغہ بھی ہنسنے لگی۔

’’میرا مطلب ہے کہ ممی، ڈیڈی کو منانے کے لیے مزید وقت درکار ہے، بڑے ضدی ہیں وہ لوگ۔‘‘ وہ بولا۔

بازغہ چپ رہی۔

’’تم انتظار سے گھبرا تو نہیں جاؤ گی؟‘‘ شیراز نے پوچھا۔

’’نہیں!‘‘ بازغہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس کا جی چاہا کہہ دے تمہی تو میری روح کی ٹھنڈک ہو، جتنا چاہو انتظار کرانا، میں تو تمہاری راہوں پر پلکیں بچھائے بیٹھی رہوں گی، چاہے تمہاری راہ تکتے تکتے سارا جیون بیت جائے۔ وہ سوچتی رہی لیکن زبان نے دل کی باتوں کا ساتھ نہیں دیا، بس دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ چپ چاپ پیر سے زمین کریدتی رہی۔

’’اچھا خدا حافظ!‘‘ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

’’خدا حافظ۔‘‘ بازغہ کی آواز رندھ سی گئی، پھر وہ چلا گیا، ڈھیر سے دن یونہی بیت گئے۔ وہ بیمار پڑ گئی۔ شیراز کا رزلٹ آیا تو اس دفعہ بھی اس نے پوزیشن لے لی تھی۔ بازغہ کا جی چاہا کہ جا کر اسے

مبارک باد دے لیکن بیماری کی وجہ سے نہیں جاسکی۔ بس بستر پر لیٹے لیٹے ہی سوچتی رہتی۔ آج شیراز یونیورسٹی آیا ہوگا، کتنا خوش ہوگا وہ اپنی کامیابی پر، کتنی ڈھیری مبارکبادیں سمیٹ رہا ہوگا، شاید اس نے اسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو، دل میں موہوم سی امید جاگ اٹھتی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں اسے یونیورسٹی میں گھومتے پھرتے دیکھا کرتی، کبھی تصور ابھرتا کہ وہ مختلف گوشوں میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔ کیا پتہ وہ اسے بھول ہی گیا ہو۔ کبھی خیال آتا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ رزلٹ کے چکروں میں اب تو وہ اکثر یونیورسٹی آتا رہتا ہوگا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچتی رہتی اور دل چاہتا کہ اڑ کر اس تک جا پہنچے۔ اس کو بتا دے کہ وہ اس کے لیے کتنی بے کل، کتنی بے قرار سی ہے لیکن وہ مجبور تھی، بیماری کی شدت سے یونیورسٹی جانے کے قابل نہیں تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ تو گرتی پڑتی چلی بھی جاتی لیکن امی نے سخت پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کو بستر سے اٹھنے بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ امی بڑے پیار سے اس کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ ابا نے میز پر پھلوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ امی کاٹ کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھیں، پھر بھلا وہ اسے اتنی دور سفر کرنے کی اجازت کیسے دیتیں۔ بازغہ بستر پر پڑے پڑے سوچوں کی تپش سے پگھلی جا رہی تھی۔

''کیا سوچتی رہتی ہو بیٹا ہر وقت؟'' امی پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتیں۔

''کچھ نہیں!'' وہ گھبرا جاتی کہ کہیں اس کے دل کا چور ہی نہ پکڑا جائے۔

''کچھ بھی تو نہیں''۔۔۔ کہتے کہتے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔

اور پھر جب وہ صحت یاب ہو کر یونیورسٹی پہنچی تو بہت وقت گزر چکا تھا۔ اب تو وہاں شیراز کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ڈھیر سے دن یونہی گزر گئے۔ اس نے فائنل ایئر کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گئی۔ ابا نے نوکری کی اجازت نہیں دی۔ اکلوتی بیٹی کو وہ نوکری کے بکھیڑے میں الجھانا نہیں چاہتے تھے۔ آخر گھر میں بیٹھ کر انتظار کے لمحوں کی لذت میں کھو گئی۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو گئیں لیکن آنے والے کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ دونوں کا نمبر بدل گیا، نیا نمبر شیراز کے پاس نہ تھا اور نہ بازغہ کے پاس شیراز کا۔ پھر بھی وہ آس کے دیپک جلائے بیٹھی تھی۔ اسے شیراز پر پورا بھروسہ تھا، اس کی چاہت پر مکمل اعتماد تھا، اپنے دل میں سلگتی آگ کی تمازت پر پورا یقین تھا، کبھی تو اس کی تپش شیراز تک پہنچ ہی جائے گی، اپنی محبت پر اعتماد تھا اور اسی اعتماد کے سہارے اس نے بہت سارے دن بتا دیئے تھے۔ پلکوں پر دیئے جلائے وہ امید کی راہوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جو اس کی متاع حیات تھا، اس کی چاہتوں کا مرکز، آرزوؤں کا محور تھا، جس کے بغیر اب زندگی گزارنے کا تصور بھی اذیت ناک تھا، وہ جو اس کی نس نس میں سما گیا تھا، بے وفا نہیں ہو سکتا، وہ آئے گا، اسے اپنا بنانے ضرور آئے گا۔ وہ پورے یقین سے سوچتی پھر یقین کی بنیادیں متزلزل ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ اعتماد کا شیشہ چٹخنا شروع ہو گیا۔ مایوسی کی لہریں اس کے پورے وجود کو ڈبونے کی فکر میں لگ گئیں۔ ڈھیر سارے دن بیت گئے تھے لیکن آنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتے ہوتے جاں لیوا بن رہی تھیں۔ سانسیں سینے میں گھٹنے لگی تھیں۔ آرزوؤں کے محل مسمار ہوتے دکھائی دینے لگے۔ امنگیں دم توڑتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ بوکھلا سی گئی۔ اپنی محبت کو یوں لٹتے دیکھ کر ہوش و حواس اڑنے لگے۔ شدتِ غم سے دماغ ماؤف ہونے لگا لیکن ابھی تک اس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تھا اور اس آس کے سہارے تو وہ ساری عمر انتظار کی صلیب پر لٹکنے کو تیار تھی۔ اس آس کے سہارے تو تمام عمر یونہی بتا سکتی تھی۔ دن گزر رہے تھے پر آس نہیں ٹوٹی تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ جذبۂ دل کی شدتیں رنگ لے آئیں۔ کال بیل بجنے پر اس نے دروازہ کھولا تو سامنے شیراز کو کھڑے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بھی آنکھوں میں جذبوں کی شدتیں لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ بازغہ تو اسے سامنے پا کر سب کچھ بھول گئی تھی۔ بس ایک ٹک اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

''دیکھو بازغہ میں آ گیا۔'' اس کی آنکھوں میں محبت ہی محبت بھری ہوئی تھی۔ اور بازغہ کو یوں لگا جیسے جسم میں جان واپس آ گئی ہو۔ خوشی سے اس کی آنکھیں یک دم چھلک اٹھیں اور بے اختیار اس کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلا۔

''شیراز۔۔۔!''

''معاف کرنا! سکندرِ اعظم کو اپنی فوج کو مناتے مناتے بڑی دیر لگ گئی، اور جب تک ان کو منا نہ لیتا خواہ مخواہ تم سے رابطہ کر کے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' شیراز نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی۔

''ممی، ڈیڈی گاڑی میں ہیں۔'' شیراز نے یاددہانی کرائی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ہی گاڑی کھڑی تھی، لیکن اس نے تو سوائے شیراز کے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بے اختیار سی ہو کر جلدی سے باہر آ گئی۔

''تشریف لائیے!'' کار کے قریب پہنچ کر اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

قدوس صاحب اور ان کی بیگم کار سے باہر آ گئے۔

''السلام وعلیکم!'' بازغہ نے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹی!'' قدوس صاحب نے کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو بازغہ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

سب کو لے کر وہ ڈرائینگ روم میں آ گئی۔ اپنے امی ابا سے سب کا تعارف کرانے کے بعد وہ باورچی خانے میں آ گئی۔ وہ چائے بنا رہی تھی۔ وہیں شیراز آ گیا، کیونکہ زمانہ طالبعلمی میں وہ تین بار ان کے گھر آیا تھا۔

''حال چال تو ٹھیک ہے نا، ہماری یاد نے زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟'' شیراز نے شرارت کے انداز میں پوچھا۔

وہ بھی شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں!''
''واقعی!'' شیراز نے کہا۔
''بالکل سچ!'' بازغہ نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔
''ادھر دیکھو میری طرف۔'' شیراز نے اسے شانوں سے تھام کر اس کا رخ آہستہ سے اپنی طرف موڑ لیا۔
بازغہ جلدی جلدی آنکھیں جھپکنے لگی۔
''اب بتاؤ!'' وہ بولا۔
''کیا؟'' بازغہ انجان سی بن گئی۔
''یہی کہ میری یاد آئی کہ نہیں۔'' وہ بولا۔
''کہہ دیا نا، کبھی تمہارا خیال تک نہیں آیا۔'' وہ جلدی سے چولہے کی طرف مڑ گئی۔
''تمہاری آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں یا زبان؟'' شیراز نے پوچھا۔
''کیا مطلب؟'' بازغہ نے پوچھا۔
''تمہاری زبان جو کچھ کہہ رہی ہے آنکھیں سراسر اس کی نفی کر رہی ہیں۔'' وہ بولا۔
بازغہ چپ چاپ مسکرانے لگی۔ جی چاہا کہے ''تمہاری یاد کے سہارے ہی تو اتنے سارے دن گزارے ہیں میں نے'' لیکن وہ کہہ نہ سکی۔
''میں آنکھوں میں لکھی تحریر پر یقین کرتا ہوں، زبان جھوٹ بول سکتی ہے آنکھیں نہیں۔'' وہ بولا۔
''یہ تحریریں کب سے پڑھنی آ گئیں جناب کو؟'' بازغہ نے پوچھا۔
''جب سے تمہارا ساتھ ہوا، ویسے میں شکل دیکھ کر دل کا حال بھی معلوم کر لیتا ہوں۔'' شیراز نے کہا۔
''کیا مطلب؟'' بازغہ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔
''تمہاری شکل دیکھتے ہی مجھے تمہاری دلی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہو گیا تھا۔'' وہ بولا۔
''یعنی؟'' بازغہ نے تعجب سے پوچھا۔
''یعنی یہی کہ محترمہ کا ایک ایک پل ہماری یاد میں روتے دھوتے گزرا ہے۔'' شیراز کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
''اتنی خوش فہمی اچھی نہیں ہوتی۔'' بازغہ نے کہا۔
''خوش فہمی نہیں، یقین ہے۔'' شیراز کے لہجے میں اعتماد تھا۔
بازغہ چپ رہی۔
''صحیح ہے نا میری بات؟'' وہ پھر بولا۔
''تم سمجھ رہے ہو کہ تمہاری یاد کے علاوہ مجھے دنیا میں کوئی دوسرا کام ہی نہیں تھا۔'' بازغہ نے کہا۔
''مجھے معلوم ہے کہ تم نے دوسرے تمام کام پس پشت ڈال دیئے ہوں گے۔'' وہ بولا۔
اچھا آپ وہاں جا کر بیٹھیے، میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔
''بزرگوں کی باتوں میں میرا دل نہیں لگتا، پتہ نہیں کس کس زمانے کی باتیں کرتے ہیں وہ؟'' شیراز نے کہا تو بازغہ ہنس دی۔
''ویسے آج بزرگ حضرات، بہت کام کی باتیں کریں گے۔'' شیراز نے بتایا۔
''کون سی باتیں؟'' بازغہ نے پوچھا۔
''اتنی انجان مت بنو۔'' وہ اس کے کان کے قریب منہ لا کر بولا۔
بازغہ کا دل بہت زور سے دھڑک اٹھا، شرم کی لہر پورے وجود میں پھیل گئی۔
''مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کہ پتہ نہیں تم نے میرا اتنے عرصے انتظار کیا بھی ہو گا یا نہیں۔'' وہ بولا۔
''میری وفا پر اعتماد نہیں تھا کیا؟'' بازغہ کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔
''جب ہی تو چلا آیا۔'' شیراز نے کہا۔
''البتہ میں سمجھ رہی تھی کہ شاید تم اپنا وعدہ بھول گئے ہو۔'' بازغہ نے بتایا۔
''تمہیں بتایا تو تھا کہ وفا کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
بازغہ مسکرانے لگی۔

’’یقین آیا؟‘‘ وہ پوچھ رہا تھا۔

’’ہاں!‘‘ بھرپور طمانیت کے احساس کے ساتھ بازغہ نے کہا۔

’’قائل ہو گئیں نا۔‘‘ وہ بولا۔

’’بالکل۔‘‘ بازغہ ٹرالی میں سامان سجاتے ہوئے بولی۔

’’اچھا اب کمرے میں چلیے۔‘‘ بازغہ نے ٹرالی کھسکاتے ہوئے کہا تو شیراز بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا۔

’’ارے بیٹی اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔‘‘ قدوس صاحب نے کہا۔

’’پہلی دفعہ تو آپ ہمارے گھر آئے ہیں۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’اب تو آتے ہی رہا کریں گے۔‘‘ وہ بولے۔

’’اور کیا، رشتے داری جو ہو گئی۔‘‘ بیگم قدوس بولیں۔

’’آپ لوگوں ہی کا گھر ہے یہ بھی، جس وقت چاہیں بلا تکلف چلے آیا کیجیے۔‘‘ بازغہ کی امی نے کہا۔

’’ہم تکلف کے قائل ہی نہیں ہیں، جب دل چاہا ضرور آئیں گے۔‘‘ قدوس صاحب بولے۔

’’بالکل جناب آپ ہی کا گھر ہے۔‘‘ بازغہ کے ابا نے کہا۔

چائے کا دور خوشگوار باتوں میں ختم ہوا اور پھر بیگم قدوس نے انگوٹھی نکال کر اسے پہنانی چاہی۔ بازغہ نے اپنے امی ابا کی طرف دیکھا۔

’’ہاں بیٹا، پہن لو۔‘‘ بازغہ کی امی نے کہا تو بازغہ نے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ بیگم قدوس نے خوبصورت انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

’’خدا جوڑی ہمیشہ سلامت رکھے۔‘‘ بیگم قدوس نے دعا دی۔

’’آمین۔‘‘ بازغہ کے امی ابا نے ایک ساتھ کہا۔

انگوٹھی پہننے کے بعد اس کی نظریں بے اختیار سامنے اٹھ گئیں۔ شیراز بڑی شریر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ سی گئی اور اٹھ کر چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

دن تو سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، یہ تو اپنے اندر کے جذبات کی بات ہے کہ کوئی دن بے انتہا حسین لگنے لگتا ہے اور کوئی کوئی بے حد سوگوار۔ اگر دل میں غموں کے طوفان اٹھ رہے ہوں تو پھر کائنات کی ہر شے سوگوار سوگوار لگتی ہے، بالکل ایسے جیسے ہمارے دکھوں میں شامل ہو کر اداس ہو گئی ہو، ہر چیز سے اداسی ٹپکتی نظر آتی ہے۔ ہر شے پر خاموش ماتم کا گماں گزرتا ہے اور اگر دل میں مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے ہوں، روح خوشی سے سرشار ہو تو پھر ہر چیز خوشی سے جھومتی نظر آتی ہے، دن حسین لگنے لگتا ہے، ہر طرف رنگ و بو کی برسات سی محسوس ہوتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کائنات کی ہر شے ہماری خوشیوں میں شریک ہو کر ہمارے ساتھ گنگنا رہی ہے۔

یہ دن بھی اگرچہ عام دنوں ہی کی طرح تھا۔ ویسے ہی سورج نکلا تھا۔ ویسے ہی ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہی موسم تھا۔ ہوا بھی اسی طرح چل رہی تھی جیسے عام دنوں میں چلتی ہے، سب کچھ روز جیسا ہی تھا لیکن بازغہ کو وہ دن بے انتہا حسین لگ رہا تھا۔ ہر شے اپنی خوشیوں میں شریک ہو کر جھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور کچھ ایسے ہی خوشیوں کی پھوار اس کے دل میں بھی پڑ رہی تھی۔ وہ خوش تھی، بے انتہا خوش، اتنی کہ پاؤں زمین پر پڑنے مشکل ہو رہے تھے۔ جی چاہ رہا تھا بس فضاؤں میں تیرتی پھرے، بادل کا ٹکڑا بن کر نیلے آسمان کے سینے پر رقص کرتی رہے، خوشیوں کے ہنڈولے میں بیٹھ کر ہواؤں کے دوش پر لہراتی رہے۔ اس کا دل پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ آج اس کی روح کی گہرائیوں میں بسنے والا، دھڑکن بن کر دل میں سمانے والا، اس کا اپنا بن گیا تھا۔ وہ جس نے کبھی اجنبی بن کر اس کے دل کے دروازے پر دستک دی تھی اور جسے اس نے دل کی گہرائیوں میں بسایا تھا آج ہمیشہ کے لیے اس کا اپنا ہو گیا تھا۔ فاصلے مٹ گئے تھے، دوریاں ختم ہو گئی تھیں، وہ ایک ہو گئے تھے، آرزوؤں کی تکمیل ہو گئی، وفا کی راہوں پر طویل مسافت طے کرنے کے بعد دونوں نے منزل پالی تھی۔ شیراز بھی بے انتہا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے انگ انگ سے مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جسے چاہا، اسے پالیا۔ یہی خوبصورت احساس زندگی بن کر رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔

☆☆☆

☆☆☆

قدوس منزل میں ان دنوں خوشیوں کی دیوی رقصاں تھی۔ ہر طرف بہار کا سا گماں تھا۔ شیراز کا وسیع و عریض گھر بہت خوبصورت تھا۔ بہت خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ کیا ہوا، ہر چیز مکینوں کے عمدہ ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ بازغہ کو یہاں آ کر اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے اپنے شیراز کا گھر جو ٹھہرا۔ بھلا اسے یہاں اجنبیت کیسے لگتی۔ یہاں کی تو ہر چیز سے اسے اپنی دیرینہ وابستگی کا گماں ہوتا تھا۔ اس شام وہ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

''پہلے ہمارا گھر بہت سونا سونا سا لگتا تھا۔'' شیراز نے کہا۔

''اب اس کو رونقیں بخشنا میرا کام ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''بے شک!'' ذو معنی انداز میں شیراز نے کہا تو بازغہ کو اپنی کہی ہوئی بات کا احساس ہوا اور شرم کی لہر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی۔

''ابھی تک تو کبھی کبھار مریم کے بچے آ کر اس گھر کو دو چار دن کے لیے رونقیں دے جاتے تھے اور اب یہ ذمہ داری تم قبول کر رہی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

بازغہ پیر کے انگوٹھے سے گھاس کریدنے لگی۔

''ہے نا۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی کرسی پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے قدرے جھکتے ہوئے بولا۔ بازغہ نے شرگیں نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

بہت خوبصورت دن تھے۔ خوشیوں بھرا ایک ایک لمحہ دھیرے دھیرے انداز میں سرک رہا تھا۔ وہ دونوں ہر لمحے کی مسرتیں لوٹ رہے تھے۔ پیار بھرے ہر پل کو اپنے دلوں میں جذب کر رہے تھے۔ چاہتوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کی قربت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔

شیراز نے ہنی مون کے لیے یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا تھا لیکن بازغہ کا اصرار تھا کہ اپنے وطن کو خدا نے بے انتہا حسن کی دولت سے نوازا ہے۔ پہلے اپنے ملک کی سیر کریں گے۔ یہاں کا چپہ چپہ دیکھیں گے، قریہ قریہ گھومیں گے، پھر کسی دوسرے ملک جائیں گے۔

''پاکستان کو خدا نے حسن کی دولت کیا کم دی ہے؟'' بازغہ نے کہا۔

''نہیں، حسن کا شاہکار تو میرے سامنے موجود ہے۔'' شیراز نے بازغہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس حسن کی بات نہیں کر رہی ہوں۔'' بازغہ ہنستے ہوئے بولی۔

''میرے دل و دماغ پر تو یہ حسن چھایا رہتا ہے کہ آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔'' وہ سرشاری سے بولا۔

''تم چلو تو، میں دکھاؤں گی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لازوال قدرت کے نمونے کس طرح پہاڑوں اور میدانوں میں بکھیرے ہیں۔'' وہ بولی۔

''اچھا بھئی جیسے مرضی حضور کی، ہم تو بس پیچھے پیچھے چلنے والے ہیں۔'' وہ بولا۔

اور پھر وہ پاکستان کے خوبصورت حسین گوشوں میں اپنی محبت کے یادگار لمحوں کو امر بنانے کے لیے چلے گئے۔ سوات کی خوبصورتی میں، کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر، مری کی پرکیف فضاؤں میں، کاغان کے دل میں اتر جانے والے حسین مناظر میں اپنی محبت کے نغمے الاپتے وہ کھو سے گئے تھے، سب کچھ بھول گئے تھے، ایک دوسرے کی قربت میں مدہوش تھے۔ حسین وادیوں میں اپنی محبت کے نقش ثبت کرتے پھر رہے تھے، ان لمحوں کو امر بنانے کے لیے جتن کر رہے تھے۔ کاغان میں وہ شام بڑی رومان پرور تھی۔ وہ اور شیراز ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے باہر کی دلکشی کا نظارہ کر رہے تھے، جب ہی نہ جانے کدھر سے بادل آ کر آسمان پر چھانے لگے۔ ہوا میں تیزی آ گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں۔ جلد ہی موٹی بوندوں نے تیز بارش کی صورت اختیار کر لی۔ رم جھم برسات ہو رہی تھی۔ ہوا کے ساتھ پھوار آ کر ان دونوں کو بھگونے لگی تھی۔ دونوں خاصے بھیگ گئے لیکن ایک دوسرے کی قربت میں مدہوش وہ اس کیف آگیں بارش میں کھوئے اس نظارے کو اپنے دل میں جذب کر رہے تھے۔

''کتنا خوبصورت لگ رہا ہے سب کچھ۔'' بازغہ نے کہا۔

''واقعی۔'' شیراز کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''مجھے بارش اچھی نہیں لگتی تھی لیکن پہاڑوں پر آ کر احساس ہوا کہ رم جھم برستی برسات تو کائنات کی حسین ترین شے ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''بارش کا لطف شہروں میں نہیں کھلی فضاؤں میں آتا ہے۔'' شیراز بولا۔

''جی چاہ رہا ہے یونہی اس خوبصورت ماحول میں کھوئے کھوئے زندگی تمام ہو جائے۔ یہ پرکیف نظارے کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوں۔'' بازغہ ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اب ہم ہر سال یہاں آیا کریں گے۔'' شیراز نے کہا۔

''سچ!'' بازغہ کھل اٹھی۔

''بالکل سچ۔'' وہ بولا۔

''زندگی کا اصل حسن تو ان ہی جہتوں پر ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''اور اگر ساتھی بھی حسین ہو تو لطف کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔'' وہ بازغہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

برسات برستی رہی، ننھی منی بوندیں انہیں بھگوتی رہیں اور وہ یونہی کھڑے ماحول کی رنگینی میں ڈوبے رہے۔

''کپڑے تبدیل کرلیں، کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔'' تھوڑی دیر بعد بازغہ نے کہا۔''ہوا میں خنکی بڑھ گئی ہے۔''

''تم بھی تو بھیگ رہی ہوں۔'' شیراز اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے سردی نہیں لگ رہی۔'' وہ بولی۔

''ارے نہیں، اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو تیمارداری کون کرے گا۔'' شیراز نے کہا۔

''آپ۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں؟'' وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔

''بس گھبرا گئے۔'' بازغہ نے چڑنے والے انداز میں کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے، دراصل مجھے تیمارداری کرنا آتی ہی کب ہے۔ وہ بولا۔

''آپ کو تو صرف مریض بنانا آتا ہے۔'' بازغہ بولی۔

''کیا مطلب؟'' شیراز نے پوچھا۔

''مریضِ عشق۔'' بازغہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''بے شک۔'' شیراز نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا کپڑے تو بدل لو نہیں تو ممی ناراض ہوں گی کہ میری بہو نے لے جا کر بیمار کر دیا۔ وہ بولی۔

''اچھا بدل لیتا ہوں۔''

جب کافی دیر بعد بارش تھمی، رات کی سیاہی نے چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر سیاہ چادر ڈالنی شروع کر دی۔ کتنے خوبصورت نظارے تھے۔ رات کی سیاہی میں دریائے سوات کے کنارے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر شیراز نے اس کی کئی تصویریں اتاری تھیں۔

''ٹھیک ہے اب آ جاؤ۔'' کیمرہ دوبارہ گلے میں لٹکاتے ہوئے وہ بولا۔

بازغہ اٹھی اور پانی میں ڈوبے پتھروں پر آہستہ آہستہ قدم جماتی بڑی احتیاط سے کنارے کی طرف آنے لگی۔ اور پھر نہ جانے کیسے اچانک ہی پانی میں جا پڑی۔ بے اختیار اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو شیراز کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔

''خدایا شکر ہے تیرا۔'' غنودگی کے عالم میں شیراز کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

بازغہ نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی ہی دیر یونہی پڑے رہنے کے بعد جسم میں کچھ جان سی آئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بڑی بے ایمان ہو تم۔'' شیراز اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟'' بازغہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے دماغ سے سب کچھ نکل چکا تھا۔

''وعدہ کرتی ہو ساتھ نبھانے کا اور ابھی سے ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کر رہی تھیں۔'' وہ کچھ جھنجھلایا ہوا سا تھا۔

تب بازغہ کے ذہن میں سارا منظر گھوم گیا۔ خوف سے اس نے جھرجھری لی۔ اس نے سخت زمین پر ہاتھ مضبوطی سے جما کر اپنے زندہ رہنے کا یقین کیا۔

''اگر میں ڈوب جاتی۔'' دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ عجیب سی سراسیمگی سارے وجود میں چھانے لگی۔ اس نے شیراز کو دیکھا۔ وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''سنبھل کر کیوں نہیں چلتی تھیں۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو خود تو آرام سے سو جاتیں اور ساری عمر ویرانوں کی خاک چھانتا پھرتا۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا تو باوجود خوف کے بازغہ کو ہنسی آ گئی۔

''اچانک ہی پیر پھسل گیا، کیا کوئی خرابی تو محسوس نہیں کر رہیں۔''

وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔

''نہیں!'' وہ بولی۔

''ویسے میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، جب تک میں زندہ ہوں تمہیں بھی جینا پڑے گا۔ سمجھیں!'' وہ اس کا کان کھینچتے ہوئے بولا۔

''سمجھ گئی بابا۔'' بازغہ اپنا کان چھڑاتے ہوئے بولی۔

اور پھر وہ بتانے لگا کہ کس طرح اس نے بجلی کی سی تیزی سے خود بھی دریا میں چھلانگ لگا دی اور اس سے پہلے کہ لہریں بازغہ کو بہا کر اس سے دور لے جاتیں اس نے نہایت پھرتی سے اسے جا لیا اور جب اسے لے کر پانی سے باہر آیا تو وہ بے ہوش تھی۔ کتنی ہی دیر تک اس نے اس کے پیٹ سے پانی نکالا اور پھر اپنی گرم سانسوں سے اس کے جسم میں حرارت پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔

''تم تو آرام سے بے حس پڑی تھیں اور میری جان پر بنی ہوئی تھی۔'' وہ بولا۔

''کیوں؟ تمہاری جان پر کیوں بن گئی؟'' بازغہ نے کہا۔

''تمہیں اس حالت میں دیکھ کر دل کی دھڑکنیں ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کئی بار ایسا لگا کہ بس اب دل بند ہی ہوا چاہتا ہے لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ اپنے مرنے سے پہلے کم از کم تمہیں تو

ہوش میں لے آؤں۔‘‘

شیراز بولتا رہا اور بازغہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

’’یہ بھی ہوسکتا تھا کہ جب تم ہوش میں آتیں تو مجھے اپنے برابر مردہ پاتیں۔‘‘ وہ بولا۔

’’خدا نہ کرے!‘‘ بازغہ جلدی سے بول اٹھی۔

’’تم نے تو میری جان ہی نکال لی تھی، اگر میں مرجاتا تو؟‘‘ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

’’تو میں دوبارہ دریا میں چھلانگ لگا دیتی۔‘‘ بازغہ بولی۔

’’یعنی کہ ہماری کہانی کا انجام بالخیر اسی وادی میں ہوجاتا۔‘‘ شیراز اپنی فطری شوخی پر اتر آیا۔

’’بالکل!‘‘ بازغہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

’’اچھا اب طبیعت ٹھیک ہو تو اٹھو، واپس چلتے ہیں۔‘‘ وہ اسے سہارے سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

دو دن تک وہ ہوٹل سے باہر نہ نکل سکے۔ بازغہ پر عجیب سی نقاہت طاری ہوگئی تھی اور شیراز بھی اس حادثے کے بعد کچھ شکستہ سا ہوگیا تھا۔ تاہم وہ سارا وقت اس کے ساتھ ہی بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہتا۔ کئی مرتبہ بازغہ نے کہا کہ وہ خود ہی گھوم پھر آئے لیکن وہ راضی ہی نہیں ہوا۔

’’ساتھی کے بغیر خوبصورت سفر بھی بیکار ہی لگتا ہے۔‘‘ وہ کہہ دیتا۔

’’تو پھر کب تک یونہی بیٹھے رہو گے۔‘‘ بازغہ کہتی۔

’’جب تک تم ساتھ دینے کے قابل نہیں ہوجاتیں۔‘‘

بازغہ کا دل چاہتا کہ وہ جلدی سے اچھی ہوجائے تاکہ شیراز کا ساتھ دے سکے۔ بھلا اس قدر خلوص اور محبت کا جواب وہ بستر پر پڑے کیسے دے سکتی ہے۔ اور پھر جونہی نقاہت تھوڑی سی دور ہوئی، وہ اٹھ بیٹھی۔ پھر وہی مسرت بھری گھڑیاں آگئیں۔ وہی پرکیف لمحے جیون میں رس گھولنے لگے۔ حسین وادیوں کی گود میں صبح و شام بسر ہونے لگے۔ وادیوں میں لگے اونچے اونچے درختوں کے تنوں پر شیراز اپنا اور بازغہ کا نام کھود دیتا۔

’’عاشقی کا بہت پرانا طریقہ ہے یہ۔‘‘ بازغہ ہنس دیتی۔

’’جب تک یہ درخت قائم رہیں گے ہماری محبت کی گواہی دیتے رہیں گے۔‘‘ وہ کہتا۔

’’خدا جانے کتنے محبت کرنے والے ایسے ہی نام لکھ لکھ کر بھول بھی چکے ہوں گے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’بھولنے والے تو بھول گئے ہوں گے لیکن یہ درخت تو آج تک ان کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان وادیوں میں آج بھی نہ جانے کتنے محبت کرنے والوں کی پیار بھری صدائیں گونجتی ہیں۔‘‘ شیراز بولا۔

’’ان میں ایک صدا ہماری بھی شامل ہوگئی ہے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’بے شک! یہ وادیاں رہتی دنیا تک ہماری چاہت کی گواہی دیتی رہیں گی۔‘‘ وہ بولا۔

ایک مہینہ ہو چلا تھا لیکن ان کا دل ہی نہیں بھر رہا تھا یہاں سے جانے کو۔ جنت نظیر وادیوں میں رہنے کو کس کا دل نہیں چاہتا بھلا۔

’’کافی دن ہوگئے ہیں، سب لوگ ہماری واپسی کے منتظر ہوں گے۔‘‘ ایک صبح بازغہ نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ہاں۔‘‘ خصوصاً ڈیڈی کو تو بہت انتظار ہوگا میرے آنے کا۔‘‘ شیراز بولا۔

’’شاید اس لیے کہ مصروف لوگوں کو کسی دوسرے کے وجود کا احساس نہیں رہتا ہے۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔‘‘ شیراز نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بازغہ چپ رہی۔

’’تمہارا تصور ہر وقت میرے ساتھ رہے گا۔ تمہیں تو میں اپنے آفس میں اپنے سامنے بٹھائے رکھوں گا۔‘‘ وہ دلچسپ سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

’’کیوں بھلا؟‘‘ بازغہ نے پوچھا۔

’’جب تک نظروں کے سامنے کوئی حسین چہرہ نہ ہو، میرا کام مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔‘‘ وہ اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ بازغہ بھی مسکرا دی۔

حسین خطوں کے دلفریب اور روح پرور نظاروں کا عکس آنکھوں میں سموئے جب وہ واپس آئے تو بہت دن ہوچکے تھے۔

’’کئی دن لگا دیئے تم لوگوں نے۔‘‘ بیگم قدوس نے کہا۔

’’بس وہ!‘‘ شیراز کہتے کہتے رک گیا، اور بازغہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی آنکھوں میں خاموش مسکراہٹیں سجائے کھڑی تھی۔

بھلا وہ کس طرح کہہ دے کہ وہاں سے آنے کو دل ہی کس کا چاہ رہا تھا۔ ان حسین وادیوں میں تو پوری زندگی بتانے کو دل چاہتا ہے۔

’’ڈیڈی کی طبیعت تو ٹھیک رہی نا؟‘‘ شیراز نے پوچھا۔

''نہیں، پچھلے دنوں خاصی خراب ہوگئی تھی۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

''اب تو ٹھیک ہے نا؟'' شیراز بے چین نظر آنے لگا۔

''ہاں! اب تو اللہ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہیں۔ بس تمہاری آمد کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔''

اور پھر انہوں نے سفر وغیرہ کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔ شیراز اطمینان سے ان کے سوالوں کا جواب دینے لگا۔ ڈیڈی تو اس وقت آفس میں ہی ہوں گے نا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں کتنا ہی منع کروں جانے سے، لیکن وہ مانتے ہی کب ہیں۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''اچھا میں انہیں وہیں مل لیتا ہوں۔''

شیراز ان کے آفس چلا گیا اور بازغہ بیگم قدوس کو اپنی سیر و تفریح کی تفصیلات بتانے لگیں۔ اس دن وہ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بڑی خوبصورت اور نادر اشیاء سے آراستہ کشادہ ڈرائینگ روم اپنے مکینوں کے اعلیٰ ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

''بے حد خوبصورت اور نادر اشیاء ہیں آپ کے پاس۔'' بازغہ کاشی کے خوبصورت ظروف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے اعلیٰ ذوق کی داد دو۔'' شیراز نے سر اٹھایا۔

''تمہارے اعلیٰ ذوق کی داد تو میں نے اسی دن دے دی تھی جب تم نے مجھے پسند کیا تھا۔'' بازغہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت ناز ہے تمہیں اپنے آپ پر۔''

''ہاں! اور اس سے کہیں زیادہ آپ پر۔''

شیراز ہنسنے لگا۔ بالکل شریری مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر بھی تھی۔

شیراز اٹھ کر بازغہ کے قریب آ گیا اور ایک ایک چیز کی تفصیل بتانے لگا۔ کون سی چیز کہاں سے لی تھی۔ کس ملک کی بنی تھی۔ ممی ڈیڈی کی پسند ہے یا اس نے اپنی پسند سے لی تھی۔ وہ سب چیزوں کی تفصیل بتا رہا تھا کہ مریم آ گئی۔

''ہیلو بھابھی!'' وہ آتے ہی گرم جوشی سے بولی۔

''ہیلو مریم!'' بازغہ نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

جب ہی مریم کے دونوں بچے صوفے پر چڑھ کر قریب کھڑے شیراز کی پشت پر سوار ہو گئے۔

''ہیلو ماموں!'' شانی اس کے گلے میں ہاتھ مضبوطی سے جماتے ہوئے بولا۔

''ہیلو، ہیلو!''

شیراز ہاتھوں سے دونوں کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''ارے آتے ہی ماموں کو پریشان کرنے لگے۔'' مریم نے سرزنش کی۔

''ماموں پریشان تھوڑی ہوتے ہیں۔'' ببلو بولا۔

شیراز کے ساتھ بازغہ اور مریم بھی ہنسنے لگی اور بچوں کو پشت پر اٹھائے ہوئے شیراز باہر چلا گیا۔

''شیراز کو بچے بہت ہی پسند ہیں۔ بچے کتنے ہی پریشان کر لیں مجال ہے کہ ان کے ماتھے پر شکن بھی آ جائے۔'' مریم صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''بچے ہوتے ہی بہت پیارے ہیں۔'' بازغہ نے بھی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''شیراز کا شمار ان لوگوں میں ہے جنہیں بچے ضرورت سے زیادہ ہی اچھے لگتے ہیں۔'' مریم بولی۔

''اچھا!'' بازغہ نے کہا۔

''ویسے بھابھی آپ کو بہت آسانی رہے گی۔'' مریم نے شریر سے لہجے میں کہا۔

''وہ کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بچوں کو سنبھالنے میں شیراز آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔'' مریم نے کہا۔

''ہوں!'' نظریں نیچی کر کے بازغہ مسکرانے لگی۔

''انہیں بچوں سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ ایک مرتبہ میں یہاں آئی ہوئی تھی۔ شانی ایک ڈیڑھ سال کا گود میں تھا۔ اسے بخار آیا تو وہ بے حد ضدی ہو گیا۔ رات کو اسے ضد ہو گئی۔ یقین کیجیے شیراز آدھی رات تک اسے گود میں لیے لان میں ٹہلتے رہے۔'' مریم بولی۔

''اچھا!'' بازغہ نے تعجب سے کہا۔

''ہاں! مجھ سے کہہ دیا کہ تم آرام سے سو جاؤ، اسے میں سنبھال لوں گا۔'' مریم نے بتایا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' بازغہ ہنسنے لگی۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ اس معاملے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔'' مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی!'' بازغہ کے لبوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔

وہ باتیں کر رہی تھیں کہ بیگم قدوس آگئیں۔ ''السلام علیکم پھوپھی جان۔'' مریم اٹھ کر ان کے گلے لگ گئی۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' بیگم قدوس نے اسے پیار سے چمٹا لیا۔

''اکیلی آئی ہو کیا؟ بچے کہاں ہیں؟'' انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیراز کے ساتھ باہر کھیل رہے ہیں۔'' مریم نے بتایا۔

''یعنی کہ بس آتے ہی شیراز کے ساتھ کھیل شروع ہو گیا۔'' بیگم قدوس ہنسنے لگیں۔

''وہ دیکھیے، تینوں کس قدر مگن ہیں۔'' مریم نے کھلے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

بیگم قدوس بھی دریچے میں جا کھڑی ہوئیں۔ ''شیراز تو بچوں کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتا ہے۔''

بیگم قدوس کے لہجے میں محبت جھلک رہی تھی۔

''ہاں پھوپھی جان!'' مریم نے کہا۔

''وہ دن دور نہیں جب وہ خود بچوں کا باپ بن جائے گا۔'' بیگم قدوس کی آواز میں انجانی خوشبو کی مٹھاس تھی۔

''کیا واقعی؟'' مریم نے خوشی سے بھرپور آواز میں پوچھا۔

شرم کی لہر بازغہ کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔

''بھئی آج نہیں تو کل۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''ہاں، وہ کل جلدی سے لائے اللہ!'' مریم بولی۔

وہ دونوں دریچے سے ہٹ کر بازغہ کے پاس آبیٹھیں۔ جب ہی چائے آگئی۔ ''شیراز سے کہو کہ اب کم از کم چائے تو سب کے ساتھ لے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''جی اچھا!'' بازغہ اٹھ کر لان میں چلی آئی۔

''اگر کھیل کود سے جی بھر گیا ہو تو اندر تشریف لے آیئے، چائے پر سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' بازغہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

''بھئی اب ٹی ٹائم ہو گیا ہے، اس لیے اب دس منٹ کے لیے کھیل ختم۔'' ریکٹ زمین پر پھینکتے ہوئے وہ بچوں سے مخاطب ہوا۔

''ہاں، پہلے چائے پی لیتے ہیں۔''

ان دونوں نے بھی ریکٹ پھینکے اور اندر کی طرف دوڑ گئے۔ ''بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت لطف آتا ہے۔'' شیراز بازغہ کے ساتھ اندر آتے ہوئے بولا۔

''اچھا جناب، یہ لطف چائے کے بعد پھر اٹھا لیجیے گا۔'' بازغہ نے کہا۔

پھر دونوں ڈرائنگ روم میں آکر سب کے ساتھ چائے پینے اور باتوں میں مشغول ہو گئے۔

بہت سکون پرور خوبصورت دن ایک کے بعد ایک کر کے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے دامن میں ڈھیروں خوشیاں ڈال کر وقت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے خوشیاں سمیٹ رہی تھی۔ محبت بھرے لمحے کو اپنے دل کے تہہ خانوں میں قید کر رہی تھی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا کہ ''برس سترہ یا کہ سولہ کا سن۔۔۔ مرادوں کی راتیں مرادوں کے دن''۔ اگرچہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھی لیکن اس کے جذبوں میں محبت کی ان کہی برساتوں نے زندگی کے لمحوں کو لازوال کر دیا تھا اور وہ خود کو اسی طرح محسوس کر رہی تھی۔ ہر طرف خوشبوؤں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ بازغہ اور شیراز اس سمندر میں اپنے وجود کو ڈبوئے ہوئے تھے۔ زندگی بڑی پرکیف اور بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ شیراز نے کاروبار پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ کاروبار بہت وسیع تھا۔ خدا جانے کس کس چیز کے کاروبار تھے۔ کتنی فیکٹریاں تھیں، کتنی جائیدادیں تھیں۔ بازغہ کو تو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی خوشبوؤں کا مرکز تو صرف شیراز کی ذات تھی اور اتنی مصروفیت کے باوجود شیراز اپنی محبت کا حق ادا کر رہا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد دونوں اپنی دنیا میں گم ہو جاتے۔ بڑی لمبی لمبی سیریں کرنے نکل جاتے۔ کافی رات گئے واپسی ہوتی۔

''رات کافی ہو گئی ہے، صبح تمہیں آفس بھی جانا ہے۔'' بازغہ کہتی۔

''تو کیا ہوا؟'' شیراز پوچھتا۔

''میرا مطلب ہے تھکن ہو جائے گی۔'' بازغہ کہتی۔

''تمہارے ساتھ ہونے سے تھکن ہوتی نہیں بلکہ اترتی ہے۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ ایسے ہی گھومتے رہنا۔'' بازغہ بھی ہنس دیتی۔

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ سعادت مندی سے سر جھکا دیتا اور جب بہت رات ہو جاتی تو دونوں گھر آجاتے۔ شیراز کے آفس چلے جانے کے بعد وہ یا تو رسالے اور ناول وغیرہ پڑھتی رہتی یا بیگم قدوس سے باتیں کرتی۔ اس دن بھی ایک ناول ختم کر کے وہ بیگم قدوس کے کمرے میں چلی آئی۔ میز پر مختلف سامان سجائے وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں۔

''ہیلو ممی!'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''ہیلو بیٹا!'' اس کی طرف سے پشت کیے ہی انہوں نے جواب دیا۔

''کیا کر رہی ہیں؟'' بازغہ ان کے قریب پہنچ کر بولی۔

''پرانی یادیں تازہ کر رہی ہوں۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''ارے یہ اتنے پرانے ننھے منے فراک۔'' بازغہ نے ایک چھوٹی سی فراک اٹھاتے ہوئے کہا۔

شیراز کے بچپن کے ہیں۔'' بیگم قدوس کی آنکھوں میں یادوں کی چمک لہرائی۔

''آپ نے ابھی تک سنبھال کر رکھے ہیں؟'' بازغہ کے لہجے میں حیرت سمٹ آئی۔

''مائیں اپنی اولاد کی چیزوں کو ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہیں۔'' ان کے لہجے میں ممتا ہی ممتا تھی۔

''کمال ہے۔'' بازغہ چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

شیراز کا بچپن بکھرا پڑا تھا۔ مختلف کپڑے، کھلونے اور نجانے کیا کیا۔ وہ ایک ایک چیز کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ ہر چیز سے انسیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ان میں ابھی تک شیراز کی خوشبو بسی تھی۔

''بہت خوبصورت چیزیں تیار کی تھیں آپ نے۔'' بازغہ نے کہا۔

''پسند آ رہی ہیں تمہیں؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''بہت!'' وہ بولی۔

''تمہارے لیے ہی نکالی ہیں میں نے۔'' ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''کیا؟'' بازغہ کچھ نہ سمجھی۔

''ایک مرتبہ وہ بہت بیمار ہو گیا تھا۔ زندگی کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ جب ہی میں نے عہد کیا تھا کہ اگر خدا نے اسے زندگی دی تو میں اس کے بچپن کے کپڑے اپنے پوتے کو پہناؤں گی۔'' انہوں نے بتایا۔ ''بہت ہیر پھر کر کے ان کی درازیٔ عمر کی دعا مانگی تھی۔''

بازغہ کو ایک دم ہنسی آ گئی۔

تو کیا کرتی، اس سے پہلے تین بچے خدا نے فوراً ہی واپس لے لیے تھے۔'' وہ اداسی سے بولیں۔

''شیراز کو تو میرے لیے زندہ رہنا تھا، اگر شیراز نہ ہوتے تو یقیناً میں بھی نہ ہوتی۔'' بازغہ سوچنے لگی۔

''اب میں اپنی یہ امانت تمہیں سونپ رہی ہوں۔'' بیگم قدوس نے چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا؟'' بازغہ گڑبڑا سی گئی۔

''قدوس صاحب کے علاج کی غرض سے ہم دونوں چھ مہینے کے لیے امریکہ جا رہے ہیں۔ ممکن ہے وہاں زیادہ دن لگ جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سال ڈیڑھ رکنا پڑے۔'' وہ بولیں۔

بازغہ استفہامی نظروں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''اور ہمارے پیچھے ہمارے ننھے صاحب تشریف لے ہی آئیں گے۔ اسی لیے میں یہ سب تمہیں سونپ رہی ہوں۔''

ان کے لہجے میں بے پناہ یقین کی کیفیت تھی۔ شرم کی لہر بازغہ کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ نظریں جھک گئیں۔ نئے مسرت بھرے احساس نے دل میں انگڑائی لی۔ نئے جذبے جاگنے لگے۔ ممتا کی ٹھنڈک کے میٹھے میٹھے احساس نے بازغہ کے دل میں گدگدی سی کر دی۔

''تم یہ سب سنبھال کر رکھنا۔'' انہوں نے چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔

بازغہ کا دل انجانی سی مسرت سے جھوم اٹھا۔ نئے جذبوں سے آشنائی بہت خوبصورت تھی۔ اس پر سرور کی کیفیت چھانے لگی۔ بیگم قدوس الماری میں سے ایک ڈبہ نکال لائیں۔

''عقیقے والے دن اس کے گلے میں یہ ڈالنا ہے۔'' انہوں نے ڈبہ کھول کر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹی سی بہت خوبصورت زنجیر میں ننھے منے ہیرے لگا تعویز تھا۔

''اس میں سورۃ فاتحہ لکھی ہے۔'' انہوں نے تعویز کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔

باریک باریک حرفوں میں پوری سورۃ لکھی تھی۔

''ہمارے خاندان میں یہ پشت در پشت چلا آ رہا ہے۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

بازغہ چپ چاپ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

''خاندانی امانت اب تمہارے سپرد کر رہی ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔

''جی شکریہ!'' بازغہ نے بھی اسی اعتماد سے ڈبہ تھام لیا اور سب چیزیں سنبھالے سنبھالے وہ ان کے کمرے سے باہر آ گئی۔ بہت دلکش، حسین جذبوں سے آشنائی ہوئی تھی۔ بڑی مہک آ رہی تھی ان میٹھے سکون بخش جذبوں کی، بہت لذت آمیز راحت محسوس ہو رہی تھی یہ سب چیزیں دیکھ کر۔ اس نے انہیں اپنی الماری میں رکھ دیا۔

''آج ممی نے مجھے بہت انوکھی قسم کی چیزیں دی ہیں تحفے میں۔'' رات اس نے شیراز کو بتایا۔

''کیا؟'' شیراز کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے بچپن کی یادگاریں۔'' بازغہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارے پاس۔'' شیراز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ممی کا کہنا ہے کہ آپ اور آپ کے صاحبزادے بچپن میں ایک ہی لباس زیب تن کریں گے۔''

نہ جانے کس ترنگ میں اس کے منہ سے نکلا: ''سچ'' شیراز ایک دم کھل اٹھا۔''کیا ہمارے صاحبزادے تشریف لانے والے ہیں؟''

''نہیں تو۔'' بازغہ کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔

''آج نہیں تو کل ان کو آنا ہی ہے نا!'' شیراز نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

بازغہ شرم سے سرخ ہو گئی۔

''میں نے تو اپنے بیٹے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔'' وہ ترنگ میں بولا۔

''اور اگر پہلے بیٹی ہو جائے تو؟'' جھکی جھکی نظروں سے شرمگیں مسکراہٹ سے بازغہ نے کہا۔

''تو بھی کوئی ہرج نہیں، بس ایک شرط ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا؟'' بازغہ نے نظریں اٹھائیں۔

''بالکل تمہاری طرح ہونی چاہیے۔'' وہ محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بازغہ نے نظریں جھکا لیں۔ دلفریب مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل رہی تھی۔

''تمہیں پتہ ہے میں نے لڑکی کا نام کیا رکھا ہے؟'' شیراز نے کہا۔

''کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''مومل۔'' شیراز نے کہا۔

بازغہ چپ رہی۔

''کیسا نام ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''بہت پیارا۔'' وہ بولی۔

''تمہیں پسند آیا؟''

''بہت۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''بس تو پھر طے ہے کہ ہماری بیٹی مومل ہو گی۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو بازغہ نے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

قدوس صاحب اور بیگم قدوس چھ مہینے کے لیے امریکہ چلے گئے۔ جاتے جاتے بیگم قدوس اس کو ڈھیر ساری ہدایات دے گئی تھیں۔ بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔ اونچ نیچ سمجھا گئی تھیں۔ بازغہ نے بہت توجہ سے سب کچھ سنا تھا، بلکہ یاد کر لیا تھا۔ ان کی ساری باتوں کو گرہ میں باندھ لیا تھا، حالانکہ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بس یقین تھا اور اسی یقین کی کیفیت سے سرشار وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں مگن تھیں۔ آج نہیں تو کل، آخر ان کے آنگن میں ننھے منے جیتے جاگتے پھولوں کو کھلنا تو ہے ہی نا۔ دونوں یقین کی سرحدوں میں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری بازغہ پر آ گئی تھی۔ بڑے خلوص اور محبت سے اس نے ان ذمہ داریوں کو قبول کیا تھا۔ بہت لگن سے وہ اس بڑے سے گھر کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ سارا نظام بڑی خوبصورتی سے سنبھال لیا تھا۔ ان کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ شروع شروع میں بیگم قدوس نے اپنے ٹیلی فون میں گھر کے بارے میں فکر مندی ظاہر کی تھی۔ تب شیراز نے انہیں کہہ دیا تھا کہ بازغہ نے ایسی خوبی سے گھر کا نظام سنبھالا ہے کہ ناظم کے بدل جانے کا احساس نہیں ہوتا اور شیراز کا جواب پا کر وہ شاید مطمئن ہو گئی تھیں، کیونکہ پھر انہوں نے کسی فون میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ بیگم قدوس کچھ سخت گیر طبیعت کی مالک تھیں۔ جب ہی سارے نوکر کچھ سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ لیکن اب بازغہ کی خوش مزاجی کی وجہ سے ان کی کیفیت بھی بدل سی گئی تھی۔ اب وہ گھل مل کر رہنے لگے تھے۔ اب بازغہ کے سامنے وہ اپنے مسائل بھی پیش کرنے لگے تھے اور وہ حتی الامکان ان کے مسائل حل کر دیتی تھی۔ ان سب میں بھی بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

اس دن شیراز کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ اکیلی لان میں ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ گھر کے پچھواڑے کی طرف نکل آئی۔ بادام کے بڑے بڑے پیڑوں کے سے آگے مہندی کی باڑ شروع ہو جاتی تھی۔ وہ آہستہ ٹہلتے ہوئے باڑ تک پہنچ گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ سعیدہ اپنے چھوٹے سے گھر کے سامنے مٹی کے چبوترے پر بیٹھی ساگ کاٹ رہی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھی۔

''ارے بیگم صاحبہ آپ!'' وہ جلدی سے اٹھ کر نزدیک آ گئی۔ ''کوئی کام ہے کیا؟ مجھے وہیں بلا لیا ہوتا۔'' وہ بولی۔

''نہیں کوئی کام نہیں ہے، ہم نے سوچا آج تم لوگوں کے ہاں جانا چاہیے۔''

بازغہ کو مسکراتے دیکھ کر سعیدہ اطمینان کی سانس لی۔

''تو پھر آیئے نا، باہر کیوں کھڑی ہیں۔'' سعیدہ بولی۔

بازغہ باڑ کے درمیان راستے سے گزر کر اندر آ گئی۔ سعیدہ اسے ساتھ لیے اپنے گھر میں داخل ہوئی۔

''ادھر بیٹھیے!'' کمرے میں پہنچ کر اس نے کرسی پیش کی۔

بازغہ نے بیٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بس ایک دو چارپائیاں تھیں۔ دیوار میں لگے لکڑی کے ریک پر پرانے برتن تھے۔ بس یہی کل اثاثہ تھا۔ جب ہی اس کی نگاہ چارپائی پر پڑے دوپٹے پر پڑی جس کے کنارے پر گوٹا لگا ہوا تھا۔

''یہ کس نے تیار کیا ہے؟'' بازغہ نے دوپٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''شادی ہوئی تھی لڑکی کی۔'' سعیدہ نے کہا۔

''ہوئی تھی؟ کیا مطلب؟؟'' بازغہ نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''ہوتے ہوتے رک گئی۔'' سعیدہ کی آواز میں دکھوں کی آمیزش شامل ہو گئی۔

''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''پیسہ راستے کی دیوار بن گیا ہے۔'' وہ بولی۔

بازغہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ان لوگوں نے جہیز کا مطالبہ کر دیا ہے، ہم غریب لوگ ہیں، باپ دو سال سے چارپائی پر بیمار پڑا ہے، میں محنت کر کے بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں۔ پھر ہم ان کا مطالبہ کیسے پورا کر سکتے ہیں؟'' سعیدہ کی آواز رُندھ گئی۔

''پھر؟'' بازغہ نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''پھر کیا جی! غریب کی بیٹی کی قسمت میں سوائے دکھوں کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اس در پر بیٹھی اپنے حصے کے دکھ سمیٹے اپنی تقدیر کو رو رہی ہے۔'' وہ بولی۔

''نہیں سعیدہ! ایسے مت کہو۔'' بازغہ کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔

مجبوریوں اور دکھوں کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

''پھر اور کیا کہوں بیگم صاحبہ!'' وہ دکھی سی آواز میں بولی۔

''تم بے فکر ہو کر تاریخ طے کرو، شادی کا انتظام ہو جائے گا۔'' بازغہ نے کہا۔

''کیسے بیگم صاحبہ؟'' سعیدہ بولی۔

''میں کروں گی۔'' بازغہ کے لہجے میں عزم تھا۔

''سچ!'' سعیدہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

''ہاں!'' وہ بولی۔

''خدا آپ کو سدا سکھی رکھے۔'' سعیدہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''خدا آپ کو چاند سا بیٹا دے، آپ کی گود آباد رکھے۔'' وہ دوپٹہ پھیلا کر اسے دعائیں دینے لگی۔

بازغہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پہلی دفعہ تو آئیں آپ۔ سوکھا منہ لے کر نہیں جانے دوں گی۔'' سعیدہ راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''تمہاری بیٹی کی شادی پر ہی منہ میٹھا کروں گی۔'' بازغہ مسکراتے ہوئے بولی۔

جب تو کراؤں گی ہی لیکن ابھی بغیر کچھ کھائے پیے نہیں جانے دوں گی۔'' وہ بولی۔

''نہیں سعیدہ، پھر کبھی سہی۔'' کہتی ہوئی بازغہ وہاں سے آگئی۔

اس نے محرومیوں، دکھوں، پریشانیوں کی تصویر پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ کیا یہ بھی زندگی کا ایک روپ ہے۔ پریشانیوں میں گھری، محرومیوں کو دامن میں سمیٹے سسکتی زندگی۔ اس کا دل بوجھ تلے دبنے لگا، اور جب اس نے شیراز سے ذکر کیا تو وہ ہنس پڑا۔

''یہ تو آج پتہ چلا کہ خدا نے تمہیں فیاضی بھی دل کھول کر عطا کی ہے۔'' وہ بولا۔

''تو کیا تم نے مجھے کنجوس سمجھ رکھا تھا؟'' بازغہ بولی۔

''کنجوسی اور فیاضی علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔'' وہ بولا۔

''جناب! میرا دل سمندروں کی طرح وسیع ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور موم کی طرح پگھلنے والا بھی۔'' شیراز نے کہا۔

''بالکل!'' بازغہ بولی۔

''لیکن ممی کا دل شاید اتنا نرم نہیں ہے، تم ان سے ذکر مت کرنا۔'' شیراز نے کہا۔

''ٹھیک ہے!'' بازغہ نے حامی بھر لی۔

''تم اس کی کیا مدد کرو گی؟'' شیراز بولا۔

''میں اس کو بہت سارا جہیز دوں گی تاکہ اس کی ٹوٹتی ہوئی نسبت دوبارہ جڑ جائے اور وہ ہنسی خوشی سسرال سدھارے۔'' بازغہ نے کہا۔

''بے شک! جو دل میں آئے کرو۔'' شیراز نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

دوسرے دن وہ پھر سعیدہ کے گھر میں اس کے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

''سعیدہ! تم بے فکر ہو کر شادی کی تاریخ مقرر کر لو۔ نسیمہ کے سسرال والوں نے جتنا جہیز مانگا ہے میں انشاء اللہ اس سے زیادہ کا انتظام کروں گی۔'' بازغہ نے کہا۔

''سچ بیگم صاحبہ!'' سعیدہ نے خوشی سے بے اختیار ہو کر اس کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔

''بالکل سچ!'' بازغہ کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

تب ہی بازغہ کی نظر نسیمہ پر پڑی۔ سبزی بناتی ہوئی نسیمہ کے گالوں پر شفق کی سرخی پھوٹ پڑی تھی۔ لبوں پر دھیمی سی مسکان بکھری ہوئی تھی۔

''خدا تمہیں خوش رکھے۔'' بازغہ نے دل ہی دل میں سچے دل سے دعا دی۔

پھر اس نے نسیمہ کے لیے جہیز کے لیے ڈھیروں سامان خرید لیا تھا۔ کسی بھی چیز کی کمی نہیں چھوڑی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے دل میں طمانیت کا ڈھیروں احساس اتر گیا تھا۔ سچ ہے کہ نیکی کرتے وقت انسان کے دل کو کس قدر سکون ملتا ہے۔ بازغہ کو بھی روحانی اطمینان مل رہا تھا یہ سب کرتے ہوئے اور جب اس نے یہ سب سامان سعیدہ کو دکھایا تو خوشی سے سعیدہ کی قوت گویائی شاید سلب سی ہوگئی۔ دیر تک ہکا بکا منہ کھولے، آنکھوں میں حیرت اور خوشی کا سمندر لیے وہ سامان کو تکتی رہی۔

''آپ نے تو بہت زیادہ کر دیا، اتنا تو ان لوگوں نے مانگا بھی نہیں تھا۔''

خاصی دیر بعد جب مقام حیرت ختم ہوا تو سعیدہ رو پڑی۔

''تو کیا ہوا، توقعات سے بڑھ کر ملے گا تو سسرال والے تمہاری بیٹی کی قدر بھی زیادہ کریں گے۔'' بازغہ نے مسکرا کر کہا۔

''آپ انسان کے روپ میں فرشتہ ہیں، میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں۔'' سعیدہ کی آنکھیں شکر کے احساس سے جھلملا گئیں۔

''میں فرشتہ نہیں، بالکل تمہاری ہی طرح کی انسان ہوں اور تمہیں شکریہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ تو میرا فرض تھا۔'' بازغہ نے نرمی سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

تب سعیدہ ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ کچھ ہی دن بعد نوکروں کے کوارٹروں میں زندگی کی رنگینیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ نسیمہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ ان کے گھروں کے سارے ہی مکین بہت محبت اور خلوص سے خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں حصہ لے رہے تھے۔ سارے ہی کوارٹر رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجائے گئے تھے۔ روزانہ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جانے لگے

تھے۔اس کا دل بھی خوشی کے احساس سے سرشار تھا۔اس رات وہ شیراز کے ساتھ بالکونی میں کھڑی نظارہ کر رہی تھی۔کوارٹروں میں روشنیاں تھیں، گیتوں کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔

''نسیمہ کی شادی کو سارے نوکر بہت انجوائے کر رہے ہیں، بہت خوشی خوشی وہ سب کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بھئی اللہ میاں تمہیں اتنا رحم دل اور فیاض نہ بناتا تو شاید آج وہاں اس قدر خوشیوں کی برسات نہ ہوتی۔'' شیراز بولا۔

''شیراز! اللہ میاں نے ہمیں کتنی ڈھیروں خوشیاں اور نعمتیں دی ہیں۔اب اگر ہم نے ان کی خوشی کے موقع پر تھوڑا سا انہیں دے دیا تو ہمیں کیا فرق پڑا۔آخر ہمارا بھی تو فرض ہے نا کہ ہم ان میں سے تھوڑا بہت دوسروں کو بھی تو دیا کریں۔خوشیوں پر تو ان کا بھی حق ہے نا۔'' بازغہ نے کہا۔

''بے شک! اور میں تمہارے اس جذبے کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' شیراز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

''صرف میرے جذبے کی قدر کرتے ہو، میری نہیں۔'' بازغہ نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

''ارے تمہاری قدر اس دل میں اس قدر بھر دی پڑی ہے کہ اب تو اوور لوڈ ہونے کا خطرہ ہے۔'' شیراز ہنستے ہوئے بولا۔

''اوور لوڈ مت ہونے دینا، تھوڑی سی کمی کر لو۔'' بازغہ بولی۔

''کیوں؟'' شیراز نے پوچھا۔

''بھئی جب کوئی چیز اوور لوڈ ہو جاتی ہے تو سامان ادھر ادھر گرنے لگتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میری محبت کا ایک تنکا بھی بے وقعت ہو کر تمہارے دل سے گرے۔'' بازغہ جذباتی سی ہو گئی۔

''نہیں نہیں! میرے دل میں بہت گنجائش ہے۔'' شیراز بولا۔

نسیمہ کی بارات والے دن سعیدہ کا اصرار بے حد بڑھ گیا تھا۔وہ مسلسل کئی دنوں سے اسے مختلف رسموں میں شریک ہونے کو کہہ رہی تھی لیکن بازغہ نے ہر دفعہ ٹال دیا تھا۔بارات میں سعیدہ کے پر زور اصرار پر وہ مان گئی۔وہ تیار ہونے لگی تب ہی شیراز آ گیا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سعیدہ کا اصرار بہت بڑھ گیا تھا، اب بارات میں جانا ہی پڑ رہا ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''بے شک جاؤ، لیکن ممی کو مت بتانا۔'' شیراز نے کہا۔

''بھئی آخر کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''ان کے نزدیک یہ معیوب بات ہے۔'' شیراز بولا۔

''کس وجہ سے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''ان کی حیثیت اور مرتبے کی وجہ سے وہ نہیں چاہتیں کہ ہم ان لوگوں میں گھل مل سکیں۔'' وہ بولا۔

شیراز کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔جانے لوگوں نے انسانوں کو مختلف خانوں میں کیوں بانٹ دیا ہے۔انسان تو سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ان کی خوشیاں یا غم ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں، سب ایک جیسے احساسات کے مالک ہوتے ہیں۔پھر نہ جانے کیوں سب کو مختلف خانوں میں رکھا گیا ہے۔ایسے خانوں میں جن کا آپس میں ملنا اور خوشیوں میں شریک ہونا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

شادی میں بہت گہما گہمی تھی۔سعیدہ کے چہرے پر خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔نسیمہ سر جھکائے رنگین سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی۔بازغہ تھوڑی دیر شریک ہو کر واپس آ گئی۔پھر کئی دن یونہی بیت گئے۔اس دن وہ لاؤنج میں بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی کہ سعیدہ کے ساتھ نسیمہ بھی آ گئی،

''سلام بیگم صاحبہ!'' اس نے اپنا مہندی لگا ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہو نسیمہ؟'' اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

''اچھی ہوں۔'' شرمگیں سی مسکراہٹ نسیمہ کے لبوں پر تھی۔

''آپ کی مہربانیوں نے اس کے نصیب کھول دیئے ہیں۔'' سعیدہ نے لقمہ دیا۔

''نصیب تو اللہ بناتا ہے سعیدہ!'' بازغہ نے کہا۔

''لیکن وسیلے تو بندوں کو بناتا ہے نا۔'' سعیدہ نے ذہانت سے جواب دیا۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔'' بازغہ ہنس دی۔

''اتنا بہت سا جہیز دیکھ کر سسرال والے اس کی بہت قدر کر رہے ہیں۔'' سعیدہ بولی۔

''بس اللہ ان کو نیک ہدایت ہی دیتا رہے اور ایسے ہی ساری زندگی وہ اس کی قدر کریں۔'' بازغہ نے دعا دی۔

''آمین!'' سعیدہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

نسیمہ کے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ دیکھ کر بازغہ کے اپنے دل میں ڈھیروں اطمینان اتر گیا۔ساعتیں حسین اور خوشگوار ہوں تو دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔مصیبت کا ایک ایک دن گن گن کر

گزرتا ہے۔لمحوں پر صدیوں کا گماں گزرتا ہے اور خوشیوں کی گھڑیاں پل بھر میں بیت جاتی ہیں۔وقت گزارنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ڈھیر سارے دن ہنستے مسکراتے بیت گئے اور پتہ بھی نہیں چلا۔

☆☆☆

☆☆☆

''بھئی فنکشن میں کیا کیا پروگرام کرنے کا ارادہ ہے اس دن؟'' شیراز نے پوچھا۔

''کون سے فنکشن میں؟'' بازغہ حیرت بھرے انداز میں بولی۔

''تمہیں نہیں معلوم!'' اس مرتبہ شیراز کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نہیں!'' اس کی حیرانی بدستور قائم تھی۔

''ارے کچھ بھی یاد نہیں کیا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''نہیں کچھ بھی یاد نہیں۔'' بازغہ بولی۔

''پھر تو میرا وجود بھی بھول چکی ہوگی۔'' وہ بولا۔

''تم کوئی بھولنے والی چیز ہو کیا۔'' بازغہ مسکرا دی۔

''اب تم سے تو یہی امید رہ گئی ہے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''تم ہی بتادو نا!'' وہ زِچ ہو کر بولی۔

''جس دن مجھے اپنایا تھا، وہ دن بھول گئی!'' وہ بولا۔

''اوہو! یاد آیا، ہماری شادی کا دن۔'' بازغہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

''شکر ہے خدا کا۔'' شیراز نے دونوں ہاتھ بلند کیے۔

''یاد تو آیا نا۔''

''ایک سال گزر گیا، سچ! پتہ ہی نہیں چلا۔'' وہ حیرت بھرے خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

''پتہ بھی کیسے چلتا، تم تو مدہوش ہی اتنی رہتی ہو۔'' وہ بولا

''تمہاری قربت میں۔'' بازغہ نے ہنس کر جملہ پورا کر دیا۔

اچھا اب چلو!'' شیراز نے کہا۔

''کہاں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''شاپنگ کے لیے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' بازغہ بولی۔

''کوئی تحفہ نہیں لینا ہے کیا؟'' وہ بولا۔

''پچھلے سال تمہاری صورت میں زندگی کا سب سے قیمتی اور حسین تحفہ لے چکی ہوں۔ اب کچھ اور کی آرزو نہیں ہے۔'' وہ سرشار لہجے میں بولی۔

''اوہو۔۔۔! ٹھیک ہے بھئی!'' وہ اس کو چڑانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سالگرہ والے دن بھی تو کچھ لینا ہی ہے نا۔''

''چلیے! جو حکم حضور کا۔۔۔!'' بازغہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سپر مارکیٹ کے باہر بہت رش تھا۔ کاروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنی گاڑی زیادہ فاصلے پر پارک کرنی پڑی اور پھر پیدل آ کر وہ کاروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مارکیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک کار میں چھوٹا سا گول مٹول سرخ و سفید بچہ کھڑکی کے بلند شیشے سے ناک نکالے جھانک رہا تھا۔

''اوہو۔۔۔!'' شیراز رک گیا اور آگے والی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر شیشہ چڑھا کر بچے کو باہر نکال لیا۔

''ارے کیا کر رہے ہو؟'' بازغہ پریشان سی ہو گئی۔

''بہت پیارا سا بچہ ہے۔'' وہ اس کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے بولا۔

بچہ واقعی بہت پیارا تھا۔ ذرا بھی تو نہیں گھبرا رہا تھا۔ خاموشی سے پیار کروائے جا رہا تھا۔ شیراز نے لگاتار کئی مرتبہ اس کے گالوں سے پیار کیا۔

''اغواء کے کیس میں پکڑوانے کا ارادہ ہے کیا؟'' بازغہ کی پریشانی بڑھنے لگی۔

''ارے ارے! اس کا تو خیال ہی نہیں آیا۔'' شیراز نے جلدی سے بچے کو واپس کار میں پہنچا کر شیشہ چڑھا دیا۔

''خوبصورت بچے میری کمزوری ہیں، کیا کروں!'' وہ بازغہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''اندازہ ہو گیا ہے مجھے۔'' بازغہ نے جواب دیا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

سالگرہ والے دن انہوں نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بہت سارے دوست مدعو تھے۔ پرلطف انتظام کیا گیا تھا۔ وہ دونوں مہمانوں کے درمیان بہت شاداں و فرحاں گھوم رہے تھے۔ ہر مہمان کی پذیرائی کر رہے تھے۔ سب سے سالگرہ کی مبارکبادیں وصول کر رہے تھے۔ رات گئے تک خاصا ہنگامہ رہا، خوب رونقیں ہوئیں، ان دونوں نے بہت مسرتیں سمیٹ لی تھیں۔ تمام مہمانوں کے جانے کے بعد جب رات گئے وہ اپنے بیڈروم میں آئے تو دروازے کی اندرونی طرف سیاہ فیتہ لٹک رہا تھا۔

''یہ کیا؟'' شیراز کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''میں نے باندھا ہے۔'' بازغہ بولی۔

''کیوں؟'' شیراز کی حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔

''جناب! اپنی ہنستی مسکراتی زندگی کو، اپنی خوشیوں کو نظرِ بد سے بچانے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔'' بازغہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ عجیب سا ہے؟'' شیراز ابھی تک متعجب ہی تھا۔

''پتہ نہیں۔۔۔ ڈر سا لگ رہا ہے کہ ہماری خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔'' بازغہ بولی۔

''پہلے تم اپنی نظر اتار لو۔۔۔ تم کو میری نظر نہ لگ جائے۔'' شیراز نے شاعرانہ موڈ میں آ کر کہا۔ وہ والہانہ انداز سے بازغہ کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری نظر۔۔۔'' بازغہ ہنس دی۔ ''تمہاری نظر ہی سے تو زندہ ہوں۔''

''اور میں۔۔۔'' شیراز نے کہا۔

''کیا؟''

''تمہاری نظر سے اپنے ہوش گنوا بیٹھا ہوں۔''

بازغہ اس کی بات سن کر مسحور سی ہو گئی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' بازغہ ذرا شرما سی گئی۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' اس کے لہجے میں دنیا جہان کا پیار سمٹ آیا تھا۔

''آج پہلی مرتبہ اچھی لگ رہی ہوں کیا؟''

''نہیں! ہر روز پہلے سے زیادہ اچھی لگتی ہو اور آج تو انتہاء کو پہنچ گئی ہو۔'' وہ بولا۔

بازغہ سرشاری کے عالم میں کھڑی مسکراتی رہی۔

''ویسے اب تم مزید اچھا لگنا بند کردو۔'' وہ بولا۔

''ہیں۔۔۔یں۔۔۔!'' بازغہ نے ہنستے ہوئے لہجے میں ذرا مصنوعی حیرت پیدا کی۔''وہ کیوں؟''

''بیکار آدمی بنانا ہے کیا مجھے؟ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہاری صورت تکتا رہوں، کوئی کام نہ کروں۔''

''اچھا!'' بازغہ ہنس دی۔

''اگر تمہاری خوبصورتی یوں ہی روز افزوں رہی نا۔۔۔ تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔'' شیراز نے کہا۔

''اچھا! اب میں کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گی، اپنے منہ پر تھوڑی سی کالک مل لیا کروں گی۔'' بازغہ نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

''خیر اب ایسا بھی مت کرنا۔'' وہ بھی ہنسنے لگا۔

میز پر تحائف کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ پیکٹ کھولنے لگا۔

''میں نے ممی ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ ان کی طرف سے ہمیں سالگرہ پر کوئی بہت نادر سی چیز تحفے میں ملنی چاہیے۔'' شیراز نے بتایا۔

''تو آپ نے ان سے تحفے کی فرمائش کر دی۔'' بازغہ نے سرزنش بھرے انداز میں کہا۔

''بالکل۔۔۔! حق ہے ہمارا ان پر۔'' شیراز اطمینان سے بولا۔

''ان میں تو ان کا بھیجا ہوا کوئی تحفہ نہیں ہے۔'' بازغہ نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں! ابھی تک تو نہیں آیا۔ چوائس میں دیر لگ رہی ہوگی۔ ان کو اپنے بیٹے بہو کی پسند کا اندازہ ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''ان کا دیا ہوا معمولی تحفہ بھی میرے لیے خاص ہی ہوگا، دل و جان سے قبول ہوگا مجھے۔'' بازغہ بولی۔

دوسرے دن امریکہ سے فیکس آ گیا۔ شیراز آفس میں تھا۔ فیکس دونوں کے نام تھا۔ بازغہ نے پڑھا۔ لکھا تھا: ''ہمارا خیال تھا کہ تحفہ ہمیں تمہاری طرف سے ملے گا، جیتا جاگتا، حسین تحفہ۔'' بازغہ کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کا کوئی دوش نہیں تھا، پھر نہ جانے کیوں ندامت کی لہریں دل میں اٹھنے لگیں۔ نہ جانے کب اور کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں گی اور وہ ان کی امیدوں پر پوری نہیں اتری تھی۔ سوچتے ہوئے بازغہ کا دل بجھ سا گیا اور جب شیراز آفس سے آیا تو اس نے چپ چاپ فیکس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''اور کچھ نہیں ہے اس کے ساتھ۔'' شیراز نے بے قراری سے پوچھا۔

''نہیں!'' بازغہ کے چہرے پر ان کہے درد کے سائے اتر آئے تھے۔

''خالی خولی مبارکباد دی ہے کیا؟'' شیراز فیکس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

بازغہ چپ رہی۔ فیکس پڑھنے کے بعد شیراز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پتہ نہیں! یہ ماں باپ کو پوتا پوتی کھلانے میں اتنی بے صبری کیوں ہوتی ہے؟'' وہ بولا۔ ''ہماری باری آئے گی تو شاید ہمیں پتہ چلے، شاید کچھ لذت اس میں ہوتی ہے۔۔۔ مگر ہماری باری آئے گی کب؟'' شیراز نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

بازغہ چپ رہی، اداس مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔

''اور ہماری ممی تو کچھ زیادہ ہی بے صبر معلوم ہوتی ہیں۔'' وہ بازغہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور بازغہ کی نظریں خاموش تھیں، کچھ بھی نہیں تھا ان میں۔

''اگلی سالگرہ پر تو ان کو جیتا جاگتا تحفہ یقیناً دینا پڑے گا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''میرے بس میں ہوتا تو۔۔۔''

''اس سالگرہ پر ہی دے دیتیں۔'' شیراز نے ہنس کر جملہ پورا کر دیا۔

بازغہ نے نظریں جھکا لیں۔

''خیر اس سال نہ سہی! اگلے سال میں، آخر موٹو کو یا علی کو اور نہ جانے کس کس کو اس دنیا میں آنا تو ہے ہی نا۔۔۔'' وہ شرارت سے ہنس رہا تھا۔

بازغہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اسے عجیب سی خفت کا احساس ہو رہا تھا۔ دل میں چبھن سی ہو رہی تھی۔ تیسرے دن ڈاک سے پارسل آ گیا۔ دھڑکتے دل سے بازغہ نے کھولا۔ ہاتھی دانت کے بہت خوبصورت گلدان تھے۔ ساتھ لٹکتی چٹ پر لکھا تھا:

''تمہارا چمن ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے، ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ حقیر نذرانہ۔''

اتنا خوبصورت تحفہ دینا تھا تو پہلے دل کی خوشی کیوں چھین لی تھی۔'' جھلملاتی آنکھیں لیے وہ سوچ رہی تھی۔

اس شام وہ لان میں بیٹھی تھی کہ سعیدہ آ گئی۔

''اچھی تو ہو سعیدہ؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''آپ کی دعائیں ہیں جی۔'' وہ بولی۔

''اور تمہاری بیٹی تو ٹھیک ٹھاک ہے نا سسرال میں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بہت اچھی ہے وہ بھی، دھن دولت دیکھ کر وہ لوگ تو اس کے آگے بچھے جا رہے ہیں۔ یہ دھن دولت بھی عجیب چیز ہے، ہو تو آدمی خوش، نہ ہو تو کسی کام کا نہیں۔۔آپ نے ہم غریبوں کی قسمت پر بڑا کرم کیا ہے۔ میری تو نس نس سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔'' سعیدہ بولتی چلی گئی۔

''اللہ آپ کی گود ہری کرے۔۔۔آپ کو زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔۔۔''

''نہیں سعیدہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے'' بازغہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ حق تھا تمہارا۔''

''حق کو کون دیکھتا ہے آج کل بیگم صاحبہ، آپ جیسے فرشتہ صفت انسان تو بہت کم ہیں اس دنیا میں۔'' سعیدہ تشکر کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔'' بازغہ ہنسنے لگی۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔ بیگم صاحبہ اٹھتے بیٹھتے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ جیسے آپ نے میری بچی کو خوشیاں دیں، خدا آپ کو بھی ہزاروں خوشیاں دے۔ چاند سا بیٹا دے۔ آپ کی گود کو ہمیشہ آباد رکھے۔'' وہ دوپٹہ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعائیں دینے لگی۔

بازغہ کو اس کی دعائیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ مسکراتی آنکھوں سے وہ سعیدہ کو دیکھ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا بس وہ یونہی بیٹھے اسے دعائیں دیتی رہے۔

''کاش تمہاری دعاؤں میں تاثیر ہو۔'' بازغہ کے دل میں تمنائیں ہلچل مچانے لگیں۔

''بیگم صاحبہ! غریبوں کی دی ہوئی دعاؤں میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔ خدا نے چاہا تو میری دعائیں بہت جلد قبول ہوں گی۔'' سعیدہ نے شاید اس کے دل کی بات جان لی تھی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' وہ دل ہی دل میں بولی۔

''بڑی بیگم صاحبہ نے وعدہ کیا ہے کہ جب ان کے ہاں پہلا پوتا ہوگا تو وہ سب نوکروں کو جوان کے گھروں کے کمرے ادھورے پڑے ہیں ان پر پکی چھتیں ڈلوا دیں گی۔'' سعیدہ نے کہا۔

''اچھا اس لیے تم مجھے دعائیں دے رہی تھیں۔'' بازغہ ہنس دی۔

''نہیں یہ بات نہیں۔'' سعیدہ گڑبڑا سی گئی۔ ''میرا سائبان تو میرا میاں ہے، جو آپ کے کرم سے اچھا ہوتا جا رہا ہے، مجھے کسی اور سائبان کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہاں! اب کیسا ہے تمہارا میاں؟'' بازغہ کو یاد آیا۔

''جب سے آپ نے باقاعدگی سے علاج کروانا شروع کیا ہے تب سے اس کی حالت ہر روز سنبھلتی جا رہی ہے۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''تمہارے گھروں کی چھتیں پکی نہیں ہیں کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''ایک کمرے کی چھت پکی ہے اور دوسری یونہی کچی پڑی ہے۔ اب اتنے سارے بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ بارش کے دنوں میں کچی چھت ٹپکتی رہتی ہے اور کمرہ استعمال کے قابل نہیں رہتا۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''تم فکر نہ کرو، اس کی چھت بھی پکی ہو جائے گی۔'' بازغہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا آپ کو خوش رکھے!'' سعیدہ دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی تو بازغہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں اس کا کہا ہوا فقرہ گونجنے لگا۔ ''دھن دولت بھی کیا چیز ہے، ہو تو آدمی خوش، نہ ہو تو کسی کام کا نہیں۔'' وہ سوچتی رہی۔ جس کے پاس جو چیز نہ ہو اس کے لیے آدمی پریشان رہتا ہے اور جو چیز موجود ہو اس کی قدر نہیں کر سکتا۔ میرے پاس دولت کے ڈھیر لگے رہتے ہیں لیکن جو اصل دولت ہے وہ ابھی تک میرے پاس نہیں آئی۔ اسے سعیدہ پر رشک آنے لگا۔ کتنی خوش ہے وہ۔ غربت میں میاں کو سائبان سمجھتی ہے اور بچے اس کی زندگی میں خوشیوں کا سامان، اس کی زندگی کا آرام ہیں۔ یہ سامان، یہ آرام ابھی اسے میسر نہیں۔ یونہی بیٹھے بیٹھے وہ سوچتی رہی۔ کئی وسوسے، کئی نادیدہ منظر اس کی نظروں میں گھوم گئے۔ لیکن پھر اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں۔ ضرور اللہ تعالیٰ اس پر اپنے کرم کی بارش کرے گا۔۔۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن سی ہو گئی۔

سرشاریوں میں ڈوبے، چاہتوں میں کھوئے دن گزر رہے تھے۔ شیراز ہر ہفتے امریکہ فون کر کے خیریت معلوم کرتا۔ کئی دفعہ بازغہ نے بھی فون پر بیگم قدوس سے بات کی تھی۔ اس دن بیگم قدوس نے فون پر قدوس صاحب کے آپریشن کی اطلاع دی تھی۔ شیراز بے حد پریشان ہو گیا۔

''کئی دن سے ڈیڈی کو دیکھنے کے لیے طبیعت سخت پریشان ہے۔'' وہ بولا۔

''تو آپ ان کو دیکھ کیوں نہیں آتے۔'' بازغہ نے کہا۔

''ہاں! اب تو ان کا آپریشن بھی ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''ممی بتا رہی تھیں کہ کافی سیریس آپریشن ہوگا۔'' بازغہ نے بتایا۔

''ہاں! خدا ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ سلامت رکھے۔'' پریشانی شیراز کے چہرے پر ہویدا تھی۔

''ممی بھی بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔'' وہ بولی۔

''معاملہ ہی ایسا ہے۔'' شیراز بولا۔

''اور پھر وہ وہاں تنہا بھی تو ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''نہیں، وہ بہت باہمت، بہت حوصلہ مند خاتون ہیں۔'' شیراز نے فخریہ انداز میں کہا۔

''بے شک، لیکن تمہیں بھی تو جانا چاہیے نا۔ ایسے موقعوں پر بیٹوں کی موجودگی سے دل کو بہت تقویت ملتی ہے۔''

''کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ ان کے لیے میرا دل کتنا بے چین ہے، لیکن وہ مجھے خود ہی وہاں آنے کو منع کر رہے ہیں۔'' شیراز نے اسے بتایا۔ ''شاید اس لیے کہ ہمارا بزنس متاثر نہ ہو، یہ بزنس تو مجھے ہی سنبھالنا ہے نا!''

''ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو سوچو، ہمارے پاس دولت کا کوئی اندازہ ہے، ہمیں اس کی کیا فکر ہے، ہاں البتہ والدین دوبارہ نہیں ملتے، اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے۔ ہمارے سوا ان کا کون ہے۔ ہم ان کی خدمت نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔'' بازغہ نے دلی خلوص کے ساتھ کہا۔

''اچھا بھئی! تم نے تو تقریر کرنی شروع کر دی۔ لگتا ہے یونیورسٹی کا دور ابھی تک تمہارے ذہن میں تازہ ہے۔'' شیراز نے ازراہِ مذاق کہا۔

بازغہ اس کی بات سن کر ہنس دی۔ ''یونیورسٹی کیوں نہ یاد رہے، آخر تم وہیں تو گئے تھے مجھے لانے کے لیے۔'' بازغہ نے اسے چڑایا۔

''ہوں۔'' شیراز سنجیدہ ہو گیا اور اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس بے اندازہ دولت ہے لیکن امی اور ڈیڈی کا ذہن ایک منٹ کو بھی بزنس سے نہیں ہٹتا۔'' شیراز نے کہا۔

''خیر! اب تو آپ کو جانا ہی چاہیے۔'' وہ بولی۔

''ہاں ان کو دیکھے بغیر جی نہیں مانتا، ان کے لیے میرا دل تڑپ رہا ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''تو پھر ان کی تھوڑی سی ناراضی برداشت کر لینا۔'' بازغہ بولی۔

''تم چلو گی میرے ساتھ۔'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں! میرا دل بھی انہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہے۔'' بازغہ بولی۔

اگلے دن شیراز نے دفتر کی ضروری کارروائی کے بعد بازغہ کو فون کیا کہ ہم انشاء اللہ کل امریکہ روانہ ہو جائیں گے۔

بازغہ نے اس کی بات سن کر جلدی سے سعیدہ کو بلایا۔ اسے گھر کے بارے میں ضروری ہدایات دینی شروع کر دیں حالانکہ ان کے جانے کے بعد گھر میں کوئی خاص کام تو نہیں جانا تھا لیکن اسے فکر لاحق ہوئی کہ نوکران کے جانے کے بعد پریشان نہ ہوں۔ اس نے شیراز سے اجازت لے کر انہیں ضروری سامان مہیا کر دیا تاکہ اگر کچھ دن لگ جائیں تو انہیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔

☆☆☆

☆☆☆

جس دن وہ امریکہ پہنچے اس سے ایک دن پہلے ہی قدوس صاحب کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اوپن ہارٹ سرجری ہوئی تھی۔ کل سے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ بیگم قدوس بے حد پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ شیراز انہیں دیکھتے ہی پریشان ہو گیا اور ان کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔

''حوصلہ رکھو بیٹے!'' وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔

قدوس صاحب کے کمرے میں پہنچ کر اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ دکھ سے سر جھکائے وہ ان کے سرہانے نڈھال نڈھال سا کھڑا تھا، اور تب ہی بازغہ کو اندازہ ہوا کہ اسے اپنے ممی ڈیڈی سے کس قدر محبت ہے۔ ایک دن اور گزر گیا۔ تب قدوس صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ کئی منٹ چپ چاپ دیکھنے کے بعد ان کے لب ہلے۔ سب سے پہلے انہوں نے شیراز ہی کو پکارا تھا اور تب بازغہ کو محسوس ہوا کہ ان دونوں نے یہاں آ کر بہت اچھا کیا تھا۔ ایک دن مزید یونہی آنکھیں کھولتے بند کرتے گزر گیا۔ ان کے چہرے کی نقاہت ذرا سی کم تھی۔ وہ سب ان کے اردگرد بیٹھے تھے۔

قدوس صاحب کے ہونٹوں سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی۔ ''بیٹا موت کیسے آسکتی ہے، جان تو پوتا دیکھنے کی آرزو میں اٹکی ہے۔''

بازغہ پر جیسے ایک دم منوں بوجھ گر گیا۔ بے ساختہ اس نے سامنے دیکھا۔ شیراز بیگم قدوس ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں شرمندگی کی لہریں سی دل میں اٹھنے لگیں تو سر جھکا کر خفت سے اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ اس کا کوئی دوش نہیں تھا، کچھ بھی تو قصور نہیں تھا۔ پھر سب اس کی طرف سوالیہ نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ نظروں سے نظروں میں اسے مجرم گرداننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مجرم نہیں تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ناکردہ جرم کے احساس سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ وہ دونوں قدوس صاحب کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور وہ نادم سی بیٹھی مسلسل اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

آہستہ آہستہ ان کی طبیعت بحال ہونے لگی۔

اس دن وہ ہسپتال پہنچی تو قدوس صاحب نے اسے اپنے قریب بلایا۔

''بازغہ بیٹی! ادھر میرے قریب آؤ۔''

وہ اٹھ کر ان کے سرہانے پہنچ گئی۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تو بازغہ کے دل میں ڈھیروں اطمینان اتر گیا۔

''تم اچھی تو ہو نا بیٹی!'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ڈیڈی۔'' بازغہ نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔

''شیراز بزنس کی طرف سے تو لاپروا نہیں رہتا؟'' انہوں نے بازغہ سے پوچھا۔

''نہیں ڈیڈی! انہوں نے تو بہت خوش اسلوبی سے سب کام سنبھالے ہوئے ہیں۔'' بازغہ بولی۔

''ڈیڈی! آپ بازغہ سے میری شکایت سننا چاہ رہے ہیں۔'' شیراز نے بے بسی سے منہ بنا کر کہا تو سب ہنس دیے۔

''نہیں بیٹے! یہ بات نہیں ہے، مجھے معلوم ہے کہ میری بیماری نے تمہارے ذہن پر کیا اثر ڈالا ہوگا۔ میری طرف سے تم کتنے پریشان ہو گئے، اور مجھے ڈر تھا کہ اس پریشانی میں تم کہیں بزنس کی طرف سے غافل نہ ہو جاؤ۔ بیٹا ایک دن کی لاپروائی سے لاکھوں کا نقصان ہوتا ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

''ڈیڈی! اللہ کے کرم سے ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ہم لاکھوں کا نقصان بھی با آسانی برداشت کر سکتے ہیں۔'' شیراز نے ادب سے جواب دیا۔

''نہیں بیٹا! دولت تو ایسے سمندر کی مانند ہے جس کا میلوں دور تک کنارا نہیں ہوتا۔ ہم اتنی دولت اپنے لیے نہیں، اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اکٹھی کرتے ہیں۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری نسلیں ہمارے ہمارے لگائے ہوئے سرسبز و شاداب درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام سے اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسا ہی سوچیں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر محنت کریں۔ سرسبز و شاداب باغ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اپنا لہو دے کر اس باغ کی آبیاری کرنی ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر شادابی پیدا ہوتی ہے۔ میں نے بھی اتنی محنت اس لیے کی کہ میری اولاد سکھ کی چھاؤں میں بیٹھ سکے اور اب تم بھی اتنی ہی محنت کرنا کہ تمہارے محنت سے لگائے ہوئے اس سرسبز شجر کی چھاؤں میں تمہاری آنے والی نسل سکون کے ساتھ سانس لے سکے۔'' قدوس صاحب مسلسل بول رہے تھے اور سب ان کی باتیں سر جھکائے سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوئے تو شیراز نے کہا:

''میں سب جانتا ہوں، ابھی آپ کو اتنا بولنا نہیں چاہیے۔ آپ کچھ دیر آرام کریں ڈیڈی!'' شیراز ان کے اس قدر بولنے سے گھبرا گیا تھا۔

''ہاں! آپ کیوں ذہن پر اس قسم کا بوجھ ڈال رہے ہیں، ابھی تو آپ کو بہت دنوں تک ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔'' بیگم قدوس نے بھی سرزنش بھرے انداز میں کہا۔

''میں تو اسے سمجھا رہا تھا اور یہ میرا فرض ہے۔'' قدوس صاحب بولے۔

''ماشاءاللہ وہ تو خود ہی بہت سوجھ بوجھ والا ہے۔'' بیگم قدوس نے فخریہ انداز میں شیراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو شیراز ماں کی محبت میں مسکرا دیا۔

پندرہ دن تک وہ دونوں امریکہ میں رہے تھے۔ وہ دونوں روزانہ ان کی عیادت کے لیے ہسپتال جاتے۔ قدوس صاحب بہت محبت سے پیش آتے۔ بازغہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور شیراز کو بہت سی ہدایتیں دیتے، بہت سی نصیحتیں کر ڈالتے، کاروباری اونچ نیچ سمجھاتے رہتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شیراز کا امریکہ میں زیادہ عرصہ قیام رہے۔ ان کا اپنا دل بھی تو پاکستان میں اپنے وسیع و عریض کاروبار ہی میں اٹکا رہتا تھا۔ وہ شیراز کو جلد واپس لوٹ جانے کی ہدایتیں کرتے رہتے۔

''بیٹا میں تو اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، تم اب واپس چلے جاؤ، وہاں نہ جانے کیا ہو رہا ہوگا۔'' وہ فکرمندی سے کہتے۔

''ڈیڈی آپ کیوں اتنی فکر کرتے ہیں۔ وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہوگا۔ آپ خواہ مخواہ ہی فکر میں گھل رہے ہیں۔'' شیراز الجھ سا جاتا۔

''نہیں بیٹے، وہاں تمہاری موجودگی ضروری ہے۔ دیکھو میری بات غور سے سنو۔ اگر بھیڑوں کے پاس ان کا گڈریا موجود نہ ہو تو بھیڑیں بھٹک جاتی ہیں اور پھر انہیں ہانکنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تمہارا دفتری نظام تمہارے بغیر متاثر ہو رہا ہوگا۔۔۔'' انہوں نے کچھ دیر توقف کیا۔۔۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

اب ان کے حکم سے انکار ممکن نہیں تھا چنانچہ چند روز بعد دونوں کو واپس آنا پڑا۔

☆☆☆

☆☆☆

اُدھر قدوس صاحب تیزی سے روبہ صحت ہو رہے تھے۔ شیراز ان کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ پاکستان آ کر وہ پھر اپنی مصروفیت میں گم ہو گیا۔ ویسے بھی اب اس کے ساتھ ڈیڈی کی ڈھیر ساری نصیحتیں اور ہدایتیں بھی تھیں۔ وہ نہایت جاں فشانی سے تمام کاموں کی نگرانی کر رہا تھا۔

''ہم لوگوں کا روپے سے کبھی دل نہیں بھرتا، دن رات دولت اکٹھی کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں، ڈھیروں دولت جمع کر لیتے ہیں، پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔'' شیراز نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کیا کرو گے اتنی دولت کا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بس نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے، ہم سے پہلے والوں نے اپنے بعد والوں کے لیے اپنے دن رات ایک کیے، ہم اپنے آنے والوں کے لیے کریں گے۔ بس یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔'' شیراز نے جواب دیا۔

''سرمایہ داری نظام کچھ عجیب سا نہیں ہے، اس نظام کے تحت ہم اپنا سکون برباد کر لیتے ہیں، دن رات اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کہیں یہ ہم سے چھن نہ جائے۔'' بازغہ نے دانشورانہ انداز میں کہا۔

''ہاں! ہے تو ایسا ہی۔'' شیراز نے اس کی تائید کی۔

''ہماری ضرورت سے بڑھ کر۔ سعیدہ اور اس کے بچوں کو دیکھو! دو وقت کی روٹی کھا کر بھی کتنے مطمئن ہیں، اس سے آگے ہوس کا مقام نہیں شروع ہو جاتا کیا؟'' بازغہ نے ذرا گہرائی میں جاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بازغہ! ہوس کا مقام اس سے آگے ہے۔'' شیراز نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''یعنی!'' بازغہ نے پوچھا۔

''جائز اور ناجائز کے امتیاز کو ہم بھول جائیں اور ہر غلط طریقے سے دولت کا حصول شروع کر دیں۔''

''کیا دولت کا حصول جائز بھی ہو سکتا ہے؟'' بازغہ نے بات آگے بڑھانا چاہی۔

''ہو سکتا ہے کیا۔۔۔ ہوتا ہے، اگر ہم کسی کا حق نہ ماریں، کسی سے فراڈ نہ کریں، بس محنت کرتے رہیں اور محنت اور عقل مندی سے کام کرتے رہیں۔''

''اچھا!'' بازغہ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''لیکن میں سوچتی ہوں کہ ہمارے نوکر کتنی محنت کرتے ہیں، دن رات بے چارے ہماری خدمت میں ایک کر دیتے ہیں، انہیں دولت کیوں نصیب نہیں؟'' دکھ کا احساس اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

''بھئی تم یہ حکمت نہیں سمجھ سکتیں بازغہ بی بی!'' شیراز نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''یہ قدرت کی تقسیم ہے۔''

''قدرت کی تقسیم؟۔۔۔ یا ہم انسانوں کے بنائے ہوئے معیار؟ قدرت نے تو سب انسانوں کو ایک جیسا بنایا ہے، ایک جیسا ناک نقشہ ہے سب کا، بس رنگوں اور خدوخال میں کچھ فرق ہے، اور یہ بھی پتا نہیں کیوں؟ بس اس میں کچھ مصلحت ہو گی اس کی۔ لیکن ہم انسان تو ایک جیسے ہیں، جذبات بھی یکساں ہیں اور خواہشات بھی سب کی ایک جیسی۔'' بازغہ نے بھی اسی انداز میں کہا۔

شیراز نے بازغہ کی طرف چونک کر دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے زِچ کرنے پر تُل گئی ہے۔

''بھئی تمہیں اس کی کیا فکر ہے، اللہ نے اگر ہمیں دے دیا ہے تو ہم کیوں اس کی نعمت کا انکار کریں۔''

''آخر ہمیں ہی کیوں؟ سعیدہ اور اس جیسے بہت سے لوگوں کو کیوں نہیں۔'' آج بازغہ کے فلسفۂ انسانیت کی حس جیسے پوری طرح جاگ اٹھی تھی۔

''اس لیے کہ وہ ہم جیسے لوگوں کو آزمائے۔'' شیراز نے مختصر سا جواب دیا۔

''اوہ! اس کا تو مجھے خیال ہی نہ رہا، امریکہ جانے سے پہلے سعیدہ نے ایک مسئلہ پیش کیا تھا۔

''کیا۔۔۔ پھر کوئی مسئلہ؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں!'' بازغہ نے کہا۔ ''اس کے گھر کے ایک کمرے کی چھت بارش سے ٹپکتی رہتی ہے، بے چارے اپنے بچوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں گزارہ کرنے پر مجبور ہیں، اس کا میاں بھی سخت بیمار ہے، اس کے علاج کے لیے میں نے اسے کچھ رقم دے دی تھی لیکن اب چھت کی تعمیر کے لیے۔۔۔''

شیراز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بھئی تمہیں کسی نے روکا ہے کیا، صبح یہ بھی کر دینا۔''

بازغہ اس کی بات سن کر مسکرا دی اور وہ بھی محبت سے مسکرا دیا۔لیکن پھر بازغہ کھو سی گئی۔

''اچھا اب اٹھو، باہر چلتے ہیں، فرصت کی چند گھڑیاں ہی تو آتی ہیں، ان کو یوں گھر میں بیٹھے بیٹھے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''شیراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا تو وہ تیار ہونے چل دی۔

دوائیں بھی ہوں، دعائیں بھی اور خدمت کرنے والے بھی تو پھر صحت یابی آسان ہو جاتی ہے۔قدوس صاحب بہت خوش قسمت تھے کہ ان کو یہ سب کچھ بہت اچھی طرح میسر تھا۔مہنگی سے مہنگی دوائیں خریدنے کی حیثیت خدا نے دے رکھی تھی۔دعاؤں کے لیے اٹھنے والے ہاتھ بھی تھے اور پھر خدمت گزار، مونس و غمخوار بیگم بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک تھیں۔انہوں نے ان پر بہت سی محبتیں نچھاور کی تھیں، بڑے خلوص، بڑی لگن سے اپنے دن رات ان کے لیے وقف کر دیئے تھے۔ان کی وفاداریاں، ان کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں، قدوس صاحب صحت یاب ہو چکے تھے اور شیراز بے حد خوش تھا کہ وہ دونوں بخیریت واپس پاکستان پہنچ گئے تھے۔

''بس بیٹے تم سب ہی کی دعاؤں سے ہمیں زندگی ملی ہے ورنہ تو بس۔۔۔''انہوں نے شیراز کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''بس ڈیڈی اس کے آگے کچھ مت کہیے گا۔''شیراز نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر بات کاٹ دی۔

''کیوں بھئی؟''وہ بولے۔

''بہت تکلیف پہنچی ہے مجھے۔''شیراز نے کہا۔

بازغہ چپ چاپ کھڑی باپ بیٹے کی محبتیں دیکھ رہی تھی۔تب انہوں نے آگے بڑھ کر اسے بھی گلے لگا لیا اور بازغہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سکون کی جنت میں لا متناہی جنتوں کا سامان مہیا کر دیا ہو۔

☆☆☆

☆☆☆

موسم آئے اور گزرتے گئے۔کیلنڈر پر تاریخیں بدلتی گئیں اور یوں ہی ایک سال بیت گیا۔ان کی شادی کی دوسری سالگرہ بھی آ گئی۔شیراز کئی دن پہلے ہی سے مصروف ہو گیا تھا۔بہت سے مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔تقریب میں رنگا رنگ پروگرام رکھے تھے۔سارا گھر خوشیوں کا گہوارہ نظر آ رہا تھا، رونقیں تھیں، ہنگامے تھے، لیکن نہ جانے کیوں اس مرتبہ بازغہ کا دل مرجھایا مرجھایا سا تھا، بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔رونقیں طبیعت پر گراں سی گزر رہی تھیں، چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائے وہ مہمانوں کی تواضع میں لگی ہوئی تھی۔اس میں بیگم قدوس سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، شاید وعدہ وفا نہ ہو سکنے سے دکھ تھا۔موقع پا کر وہ اندر اپنے بیڈروم میں آ گئی، باہر دل نہیں لگ رہا تھا، شیراز دوستوں میں مصروف تھا اور اس وقت وہ نہ جانے کیوں اپنے آپ کو تنہا تنہا سا محسوس کر رہی تھی۔

اس نے الماری کھولی، بیگم قدوس کی دی ہوئی امانتیں ویسی ہی رکھی تھیں، دکھ کی لہر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ننھے منے فراک کو گالوں سے چھوا تو وہ سسک اٹھی، دو آنسو نکل کر فراک میں جذب ہو گئے۔

باہر سالگرہ کے ہنگامے جاری تھے، آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں، اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے باہر آنے لگی۔جب ہی شیراز آ گیا۔

''تم یہاں ہو، میں تمہیں وہاں تلاش کر رہا تھا۔''وہ بولا۔

بازغہ نے نظریں چرا لیں، شاید کوئی نقش اس کی آنکھوں میں رہ گیا تھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟''شیراز گھبرا گیا۔''طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔''اس کے چہرے پر سجی پھیکی پھیکی مسکراہٹ شیراز کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''بس، ایسے ہی سر میں درد ہونے لگا تھا۔''اس نے جان چھڑانی چاہی۔

''گولی کھا لو۔''شیراز کے لہجے میں مزید پریشانی آ گئی۔

''گولی کھانے ہی تو یہاں آئی تھی۔'' بازغہ کو یہاں آنے کا جواز ہاتھ لگ گیا۔

''اب کچھ دیر آرام کرلو'' وہ بولا۔

''نہیں سب لوگ کیا کہیں گے، درد کوئی شدید تھوڑی ہی ہے، میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔'' اب وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی، دل بہل سا گیا تھا، ہنگاموں میں کھو کر جلد ہی وہ سب کچھ بھول گئی اور پوری دلچسپی سے سب کے ساتھ شریک ہوگئی۔ کملایا ہوا چہرہ اب پھول کی طرح کھلا ہوا تھا، بہت خوبصورت جاندار مسکراہٹ لبوں پر آگئی تھی اور شیراز بھی اسے دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا۔

رات گئے تک ہنگامے سرد پڑ گئے، رونقیں ختم ہوگئیں، سب مہمان جا چکے تھے، وہ سب ڈرائنگ روم میں آگئے، میز پر تحفوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

''ممی ہمیں سب سے پہلے آپ سے تحفہ لینا ہے۔'' شیراز کا لہجہ بے حد جاندار تھا۔

''جب تک ہمیں تمہاری طرف سے کوئی تحفہ نہیں ملتا ہماری طرف سے بھی تم ناامید رہو۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں ہلکی سی درشتی تھی۔

''یہ سب ہماری طرف سے آپ کے ہوئے۔'' شیراز میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر بولا۔

''یہ نہیں، جیتا جاگتا تحفہ، اس خاندان کا وارث۔'' وہ بولیں۔

شیراز نے بازغہ کی طرف دیکھا، اس نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ ہونٹ دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔

''آپ نے تحفہ ہمیشہ ہمیں بغیر کسی شرط کے دیا ہے۔'' شیراز نے یاد دلایا۔

''لیکن اب ہماری بھی ایک شرط ہے۔'' وہ بولیں۔ ''تم نہیں جانتے بیٹا! ہم سب کو کس قدر شدت سے اس گھر کے وارث کا انتظار ہے۔ خدا جانے کب ہماری سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے، ایک نظر اپنے پوتے کو دیکھنے کی آرزو میں جی رہے ہیں۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

''ایسی باتیں مت کیجیے ڈیڈی! خدا آپ کو لمبی عمر دے۔'' شیراز بولا۔

''لیکن تم ہمیں لمبے انتظار کی کوفت سے بچانا۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

شیراز نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر کے لیے ماحول پر خاموشی سی چھا گئی۔ قدوس صاحب خاموش تھے۔ شیراز نے ماحول کی خاموشی دیکھ کر تحائف کھولنے شروع کردیے۔ ہر ڈبہ کھولتے ہوئے وہ دلچسپ ریمارکس پاس کرنے لگا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بجھا بجھا سا ماحول پھر سے خوشگوار ہوگیا۔ ایک ڈبے پر لکھا تھا:

''اپنے شیراز اور بازغہ کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ۔'' نیچے ممی ڈیڈی کے نام تھے۔

''ممی، ڈیڈی! یہ رہا آپ کا دیا ہوا تحفہ۔ تو گویا آپ ہمیں سرپرائز دے رہے تھے۔'' شیراز کی آواز میں خوشی کا رس گھل گیا تھا۔

''قدوس صاحب اور بیگم قدوس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''خوشی دینے سے پہلے دکھ کیوں دیتی ہیں ممی!'' بازغہ نے سوچا۔ شاید جذبات سے مجبور ہوکر۔ دماغ نے کہا تو بازغہ گم صم سی ہوگئی۔

''بازغہ دیکھو! کس قدر خوبصورت ہے۔'' شیراز اسے بہت قیمتی ٹیبل لیمپ دکھا رہا تھا۔

''تم دونوں کے لیے خاص طور پر چین سے منگوایا ہے۔'' قدوس صاحب بولے۔

''بہت عمدہ ہے۔'' بازغہ کا لہجہ کچھ دھیما سا تھا۔

''پسند آیا؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''جی بہت، شکریہ!'' وہ بیگم قدوس کو یوں دیکھتے ہوئے بولی جیسے کہہ رہی ہو، ایسے تحفے دینے آپ کے بس میں ہیں لیکن میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔

جب رات خاصی ڈھل گئی تو ممی ڈیڈی کو شب بخیر کہہ کر وہ اپنے بیڈروم میں آگئے۔

''تم ممی کی باتوں کا برا مت ماننا۔'' شیراز بولا۔

''نہیں، وہ تو حق بجانب ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''بعض لوگ جذبات میں آکر بھول جاتے ہیں کہ بندے تو بے بس ہیں، سب کچھ تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' شیراز نے کہا۔

بازغہ چپ رہی۔

''ممی ڈیڈی بھی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہیں، تم ان کی باتوں کو دل پر نہ لاؤ۔'' شیراز سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''مجھے ان کی باتیں کبھی بری نہیں لگیں اور نہ ہی لگ سکتی ہیں کیونکہ یہ تو ان کی فطری خواہش ہے۔'' بازغہ نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

☆☆☆

شیراز کے آفس جانے کے بعد وہ اپنی ادھوری پینٹنگ مکمل کرنے کی سوچ ہی رہی تھی کہ سعیدہ آ گئی۔

''آپ کا فون ہے بیگم صاحبہ۔'' سعیدہ نے بتایا۔

بازغہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی۔

''ہیلو!'' ماؤتھ پیس کے قریب منہ لاتے ہوئے وہ بولی۔

''بازغہ! بیٹی جلدی سے آ جاؤ، تمہارے ابو کی طبیعت سخت خراب ہے۔'' امی کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیا ہوا انہیں؟'' بازغہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''بس تم جلدی آ جاؤ۔'' دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا۔

اور جب وہ وہاں پہنچی تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ امی صبر وضبط کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ بازغہ تڑپ گئی۔ بہت ہی شفیق ہستی کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شیراز، قدوس صاحب اور بیگم قدوس بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے سب کو دلاسا دیا۔ تدفین کے بعد وہ گھر واپس آ گئے۔ شیراز کچھ دیر کے لیے مزید رک گیا۔ وہ بازغہ کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ البتہ جب رات زیادہ ہو گئی تو وہ بھی بازغہ سے اجازت لے کر گھر چلا آیا۔

ادھر بازغہ کا کئی دن وہاں رہنے کے بعد بھی دل نہیں چاہ رہا تھا واپس جانے کو۔ امی کی تنہائی کے خیال سے کلیجہ بیٹھا جا رہا تھا لیکن وہ کب تک یوں رہ سکتی تھی۔ آخر واپس تو جانا ہی تھا۔ بلکہ امی نے خود ہی اصرار کر کے اسے واپس ''قدوس منزل'' بھیج دیا اور وہ ڈھیروں یادوں کے نقوش دل میں چھپائے سسکتے دل سے واپس آ گئی۔

''بہت اچھے انسان تھے تمہارے والد، اللہ ان کی مغفرت کرے۔'' اس شام کھانے کی میز پر قدوس صاحب بولے۔

بازغہ چپ چاپ کھاتی رہی۔

''افسوس! ان کے کوئی بیٹا نہیں تھا۔'' وہ تاسف بھرے لہجے میں دوبارہ گویا ہوئے۔

بازغہ نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے، لیکن بازغہ کو ان کے لہجے کے تاسف میں اپنی پریشانی کی ایک جھلک ضرور محسوس ہو گئی تھی۔

''بیٹا نہ ہو تو خاندان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''نسل آگے چلانے کے لیے بیٹے کا ہونا ضروری ہے۔''

''لیکن یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔'' شیراز بول اٹھا۔

''ہاں بیٹا تم ٹھیک کہہ رہے ہو، انسان کے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

''بے بس انسان آخر کر بھی کیا سکتا ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''کچھ تدبیر کر کے تو دیکھی جا سکتی ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''مثلاً؟'' قدوس صاحب نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''دوسری شادی تو کی جا سکتی ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

نوالہ بازغہ کے حلق میں اٹکنے لگا۔ گھبرا کر وہ پانی کا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بس کھا چکیں بیٹا!'' قدوس صاحب نے پوچھا۔

''جی۔'' بازغہ بولی۔

''اتنا تھوڑا کھایا ہے۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''بھوک نہیں تھی۔'' اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''دراصل ہم لوگوں کو کھانے کے دوران اس کے مرحوم باپ کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہیے تھا، اس کا دل دکھی ہو گیا ہوگا۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

بازغہ کا دل چاہا، کہہ دے کہ ابو کی یادوں سے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ ان کے ذکر سے چین آتا ہے لیکن آپ لوگوں کی باتیں سینہ چھلنی کر رہی ہیں، لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ بس چپ چاپ وہاں سے آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد شیراز بھی وہیں آ گیا۔

''تمہیں واقعی بھوک نہیں تھی یا۔۔۔؟'' شیراز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''یا کیا؟'' بازغہ نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیا ممی ڈیڈی کی باتوں سے دلبرداشتہ ہو گئیں؟'' وہ بولا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، مجھے تو پہلے ہی بھوک نہیں تھی۔ بس زبردستی ہی وہاں تک گئی تھی، پھر کھایا ہی نہیں گیا تو واپس آ گئی۔'' وہ زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے بولی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!'' شیراز غور سے اسے دیکھنے لگا۔

''بالکل!'' وہ بشاش بننے کی کوشش کرنے لگی۔

''لگ تو ایسے رہا ہے جیسے تم بیمار ہو؟'' وہ بولا۔

''جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ زبردستی مسکرا دی۔

''پھر یہ رونی صورت کیوں بنا رکھی ہے؟'' وہ اسے پکڑ کر آئینے کے سامنے لے گیا۔

بازغہ تیزی سے پلکیں جھپکنے لگی۔

''مجھے رونی صورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو ہنستے مسکراتے رہنا ہوگا۔'' انگلی اٹھا کر وہ اسے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور اس کے انداز میں پیار ہی پیار تھا۔

''اچھا جناب!'' بازغہ نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانی چاہی تو آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اب وہ کیسے بتاتی کہ اس کا دل نہ جانے کن خدشوں سے ڈرنے لگا ہے۔ عجیب سا خوف روح پر طاری رہنے لگا ہے۔ وہ جلدی سے وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی کہ کہیں وہ ان آنسوؤں کو دیکھ نہ لے۔ ان آنکھوں میں چھپی پریشانیوں کی تحریر پڑھ نہ لے۔ فکر اور دکھ کی پرچھائیاں اسے نظر نہ آ جائیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ان آنکھوں میں جھانک کر یہ سب دیکھ لیتا، بازغہ وہاں سے ہٹ گئی۔

اس دن مریم آئی ہوئی تھی۔ مریم نے اس کے ابو کے لیے تعزیت کی تو وہ رو دی۔ خود اسے معلوم نہیں تھا کہ ابو کا غم زیادہ تھا یا ان دیکھے مستقبل کے بے رحم تازیانے کا، جواب بڑی تیزی کے ساتھ اس کے گھر میں جنم لے رہا تھا۔

مریم کے بچوں کے دم سے گھر کی رونقیں بحال ہو گئیں تھیں۔ ان کی معصوم چہکاریں، معصوم قہقہے گونج رہے تھے۔ تینوں بچے چھوٹی چھوٹی معصوم شرارتیں کرتے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں بیگم قدوس کے بیڈروم میں ہی بیٹھی تھیں، جب ہی تینوں بچے ریل گاڑی کی طرح چھک چھک کرتے آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

''شور مت کرو! نانی اماں ناراض ہوں گی۔'' مریم نے سرزنش بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں مریم، انہیں مت روکو، ایسے شور سننے کو تو کان ترستے ہیں۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''جب آپ کے گھر میں کئی بچے ہو جائیں گے تو آپ کو کان بند کرنے پڑیں گے۔'' مریم ہنستے ہوئے بولی۔

''اگر ہوں، تب نا۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''کیوں؟ کیا آپ ابھی سے مایوس ہو گئیں؟'' مریم کے لہجے میں کچھ حیرت سی تھی۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں پھوپھی جان! ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔'' مریم بولی۔

''تین سال ہونے کو آئے ہیں۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

''یہ کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہے۔'' مریم بولی۔

''شدت سے انتظار کرنے والوں کے لیے تو یہ تین صدیوں کے برابر ہیں۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''ہاں یہ بات تو ہے، آرزو شدید ہو تو لمحے صدیاں بن جاتی ہیں۔'' مریم بولی۔

''تم اندازہ بھی نہیں کر سکو گی کہ یہ گھر کتنی بے چینی سے بچے کا منتظر ہے۔'' بیگم قدوس بولیں۔

''مجھے اندازہ ہے، خود شیراز بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' مریم نے جواب میں کہا۔

''اس کو تو دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔'' بیگم قدوس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

بازغہ سر جھکائے سب کچھ سن رہی تھی۔ دل میں ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں۔ خود کو مجرم سا محسوس کر رہی تھی۔ ایسا مجرم جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو پھر بھی اس کے چہرے پر ندامت سی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے ہی مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہو۔ ناکردہ گناہوں کا الزام اس کے سر ڈالا جا رہا ہو۔ ان کا ایک ایک لفظ برچھی بن کر بازغہ کے سینے میں کھبا جا رہا تھا۔

''بھابھی! آپ اپنا علاج کرا کے دیکھیں نا!'' مریم اس سے مخاطب ہو گئی۔

''ہوں!'' بازغہ نے چونک کر سر اٹھایا۔
''چیک اپ کرانے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے!'' مریم بولی۔
بازغہ چپ رہی۔ تھوڑی دیر بعد مریم چلی گئی تو بازغہ اپنے کمرے میں واپس آ کر سوچوں کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔
شام کو شیراز گھر واپس آیا تو مریم والی بات بیگم قدوس نے شیراز کو بتائی۔
''بیٹا! واقعی اس میں کوئی ہرج نہیں۔ تم نو بجے رات ڈاکٹر مسز بلوچ کے پاس بازغہ کو لے جاؤ۔ میں نے فون پر اس سے وقت لے لیا ہے۔'' بیگم قدوس نے زور دے کر کہا۔
شیراز ان کی بات سن کر دنگ رہ گیا لیکن حکم سے مجبور تھا۔ ماں کی بات کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے بڑی محبت کے ساتھ یہ بات بازغہ کو بتائی۔
''بازغہ کو تو پہلے ہی سے خبر تھی لیکن وہ شیراز کے منہ سے سن کر سناٹے میں آ گئی۔ تاہم اس نے شیراز کی خوشی کو عزیز جانا اور اس کے ساتھ بلوچ کلینک پہنچ گئی۔
چیک اپ کے بعد ڈاکٹر مسز بلوچ نے بازغہ کے بارے میں کوئی ناامیدی کی بات نہیں کہی تھی لیکن امید کی بات بھی نہیں کی۔ ڈاکٹر نے شیراز کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا چیک اپ بھی ضرور کروائے۔
شیراز ان کی بات سن کر سکتے میں آ گیا۔
گھر واپس آئے تو بیگم قدوس کی نگاہیں سوالیہ انداز میں شیراز پر پڑیں۔ شیراز خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے یہ بات کہتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی کہ ڈاکٹر نے اسے کیا کہا تھا۔
بیگم قدوس نے بازغہ سے سوال کیا۔
''ہاں بیٹا! کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟''
بازغہ خاموش رہی۔ وہ بیگم قدوس سے کیا کہتی۔ لیکن بیگم قدوس سمجھ گئیں، اور ایک سناٹے کے عالم میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔
بازغہ کمرے میں آ گئی تو شیراز مسکرا رہا تھا۔
''تو جناب یہاں بیٹھے ہیں آرام کے ساتھ، ممی کا سامنا کیسے کروں اور کیا بتاؤں انہیں۔'' بازغہ نے پوچھا۔
''بھئی تم کہہ دیتیں کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا، مجھ میں تو ہمت نہیں۔''
''اچھا تو میں کہتی؟'' بازغہ کو حیرانی ہوئی۔
پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔ بازغہ کمرے سے چپ چاپ باہر آ گئی۔ ہمت کر کے بیگم قدوس سے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش رہی کہ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں، واپس پھر کمرے میں آ گئی۔
خیر یہ رات گزر گئی اور صبح شیراز چلا گیا۔ پورا دن بازغہ کے لیے کائنات کا سب سے بھاری دن تھا۔ وہ بار بار شیراز کے دفتر فون کرتی رہی لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا، لگتا تھا فون باقاعدہ انگیج ہے۔
شام کو معمول سے کچھ زیادہ دیر شیراز واپس آیا اور آتے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔
بازغہ نے ہمت کر کے اس سے پوچھ لیا۔
''آج اتنی دیر کہاں رہے؟''
''دفتر!'' شیراز نے مختصر سا جواب دیا۔
''بئی دفتر تو روز رہتے ہو، لیکن آج دفتر کے بعد کہاں چلے گئے تھے؟''
''وہیں۔۔۔ جہاں ڈاکٹر نے کہا تھا''
بازغہ ہنس دی۔ ''پھر؟''
''پھر۔۔۔ پھر یہ کہ میرے بجائے تمہیں دوسری شادی کرنی پڑے گی۔'' شیراز نے سنجیدگی سے کہا۔
بازغہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی ہو۔''
وہ سناٹے میں آ گئی اور اس کی نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی اور شیراز کو پورا کمرہ صحرا کی طرح دکھائی دینے لگا۔
''تم فکر نہ کرو! میں تو مذاق کر رہا تھا۔''
بازغہ کی سانسیں ذرا سی بحال ہوئیں۔
''کیا کہا ڈاکٹر نے؟''
''ہمارے اولاد نہیں ہو سکتی، کم از کم مجھ سے بالکل توقع نہیں۔ ہاں البتہ خدا معجزہ دکھا دے تو اور بات ہے۔'' شیراز غم زدہ ہو گیا۔
''لیکن تم تو بچوں کو بہت چاہتے ہو۔'' بازغہ کی آواز رندھی ہوئی سی تھی۔
''چاہنا اور پانا الگ الگ چیزیں ہیں، چاہا تو ہر چیز کو جا سکتا ہے لیکن پانا اپنے بس میں نہیں ہوتا۔'' وہ بولا۔ ''کچھ دوائیں ڈاکٹر نے تجویز کی ہیں اور امید ظاہر کی ہے کہ ایک دو ماہ میں اس کا نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔'' بازغہ نے اسے حوصلہ دیا۔ لیکن وہ اندر سے بجھ کر رہ گئی تھی۔ خدا جانے اب کیا ہوگا۔ بیگم قدوس کو وہ کیسے بتائے کہ یہ معاملہ میرے بس میں نہیں۔ شیراز ہی اس کا ذمہ دار ہے،

مگر شیراز کا بھی اس میں کیا قصور۔ کوئی بات اس کے منہ سے نکل گئی تو اس کی عزت میں فرق پڑے گا۔ وفا کا تقاضا یہی ہے کہ خاموشی اختیار کرے اور اللہ سے امید کا رشتہ استوار رکھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بیگم قدوس یا کسی بھی کچھ نہیں کہے گی۔ شیراز کو بھی اس نے راضی کر لیا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ آخر کار اس کا نتیجہ اسے ہی بھگتنا ہے۔ وہ شیراز کی محبت میں یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ امید کا پہلو رکھتے ہوئے بھی مایوسیوں کی لہریں اس کے پورے سراپے میں گردش کرنے لگیں۔ اس کی ہنستی مسکراتی زندگی میں فکروں کے بادل نہ جانے کہاں سے آ کر چھا گئے تھے۔ بہاروں جیسے مہکتے گلشن میں خزاں رسیدہ تھپیڑے آنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ مرجھانے سی لگی تھی۔ حالات کی تپش اسے مرجھائے دے رہی تھی۔ وہ بہت چپ چاپ سی رہنے لگی تھی۔

''کیا روگ پال لیا ہے تم نے؟'' ایک روز شیراز اس سے الجھ پڑا تھا۔

''کیوں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہر روز مرجھاتی چلی جا رہی ہو!'' شیراز بولا۔

''محض تمہارا وہم ہے، میں تو بالکل ویسی ہی ہوں۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''آئینے میں صورت دیکھتی ہو اپنی؟'' وہ بولا۔

''روزانہ۔'' وہ مسکرائی۔

''آنکھیں بند کر کے دیکھتی ہو کیا؟'' شیراز بولا۔

''نہیں تو!'' بازغہ نے کہا۔

''پھر تمہیں اپنے چہرے پر پھیلی زردی نظر نہیں آتی۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

بازغہ نے گردن جھکا لی۔

''مجھے معلوم ہے تم کن سوچوں میں غلطاں رہنے لگی ہو۔'' شیراز نے کہا۔

بجھی بجھی سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر آ گئی۔

شیراز کے دل میں پیار کے کئی سوتے پھوٹ اٹھے۔ وہ خود کو بازغہ کا مجرم محسوس کر رہا تھا لیکن سزا بازغہ کو مل رہی تھی۔ تاہم ایک مرد ہونے کے ناتے اس نے بازغہ سے کہا:

''بازغہ دیکھو میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں اولاد دی تو خوش ہو لیں گے اور اگر نہ بھی دی تو پھر بھی کوئی فکر کی بات نہیں ہے، اور اب جب کہ اس معاملے کا ذمہ دار میں ہی ہوں تو تمہیں سزا کیوں ملے، میں ممی سے سب کچھ کہہ دیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں!'' بازغہ چیخ اٹھی۔ ''ایسا مت کرنا، مجھے اپنی جان سے زیادہ تمہاری عزت اور تمہاری محبت عزیز ہے، میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی۔ اگر ایسا کرو گے تو میں واپس امی کے گھر چلی جاتی ہوں۔''

شیراز اس کے مصمم ارادے پر ہکا بکا رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یونیورسٹی کے تقریری مقابلے میں وہ خود نہیں بلکہ بازغہ اول آئی تھی لیکن اسے اول انعام نہیں دیا گیا تھا۔ محبت اور احسان کے بارِ گراں سے شیراز کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

''مجھے روتے ہوئے مرد ذرا اچھے نہیں لگتے۔'' بازغہ نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔

کچھ دیر دونوں کی یہی کیفیت رہی۔ آخر کار شیراز نے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

''کچھ بھی ہو بازغہ! میں تم سے وعدے کے مطابق ممی کو یہ تو نہیں کہوں گا لیکن ایک بات کی اجازت دے دو۔''

''میں اپنی دوسری شادی نہیں ہونے دوں گا۔''

بازغہ اس کی بات سن کر ہنس دی۔ شیراز کو لگا کہ اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلکھلا اٹھا ہے۔

'بہت خوب! لوگ بیوی سے دوسری شادی کی اجازت مانگتے ہیں اور تم شادی نہ کرنے کی اجازت مانگ رہے ہو۔'' بازغہ کے چہرے پر ہنسی پھیلتی چلی گئی۔

شیراز بھی اس کی بات سن کر ہنس دیا۔ اسے یوں لگا جیسے زندگی میں دوبارہ بہار آ گئی ہو۔

☆☆☆

☆☆☆

شام کے دھندلے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ وقت کا احساس ہی نہیں تھا۔ اندھیرے اجالے کا پتہ ہی نہ چلا۔

''اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟'' بیگم قدوس نے اس کے کمرے میں آتے ہی لائٹ جلاتے ہوئے کہا۔

وہ چپ رہی۔

''لائٹ کیوں نہیں جلائی؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''بس اندھیرے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی۔

''یہ لو! میں تمہارے لیے لائی ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''کیا ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''یہ دم کیا ہوا پانی ہے، چالیس روز نہار منہ پینا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

بازغہ نے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔

''یہ پابندی سے استعمال کرنا ہے۔'' وہ بولیں۔

''جی اچھا۔'' بازغہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں وہ، ان کی دعاؤں سے ہزاروں عورتوں کی گودیں بھر گئی ہیں۔'' وہ بولیں۔ ''میں تو ان چیزوں کی بالکل قائل نہیں تھی لیکن کیا کروں، بہت انتظار کے بعد مجبور ہو کر یہ قدم بھی اٹھالیا ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

بازغہ کو ایسا لگا جیسے وہ مجرم سی ہو گئی ہو۔ اس نے سر جھکا لیا۔

''خیر اللہ دینا چاہے تو کسی کے بھی وسیلے سے دے دیتا ہے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

بازغہ چپ رہی۔

''ان ہدایات پر پابندی سے عمل کرنا تمہارے لیے لازم ہے۔'' بیگم قدوس تحکمانہ انداز میں بولیں۔

''جی اچھا!'' بازغہ نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلادی۔

وہ باہر چلی گئیں تو بازغہ نے بجھے بجھے دل کے ساتھ وہ شیشی الماری میں رکھ دی۔

اگلی صبح وہ دم کیا ہوا پانی پی رہی تھی کہ شیراز آ گیا۔

''یہ صبح سویرے تم کیا پینے لگیں؟'' اس نے بلوریں شیشی کی طرف اشارہ کیا۔

''دم کیا ہوا پانی ہے۔'' بازغہ مسکرائی۔

''کہاں سے آیا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ممی نے دیا ہے۔'' بازغہ نے بتایا۔

''کیوں بھئی؟'' شیراز نے بھنویں چڑھائیں۔

''کسی بہت بڑے پہنچے ہوئے بزرگ نے دم کر کے دیا ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''کس لیے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ان کا خیال ہے کہ یہ پانی آپ کو باپ بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔'' بازغہ نے کہا۔

''اچھا۔'' شیراز ہنس پڑا۔ ''مگر یہ مجھے پینا چاہیے۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' بازغہ نے محبت سے کہا۔ ''میں پیوں گی تو اثر تمہیں بھی ہوگا۔''

شیراز اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے شرمندہ سا ہوگا۔

تم بھی تو اتنے ہی بے تاب تھے شیراز، جتنے ممی اور ڈیڈی۔ وہ سوچنے لگی تھی۔

شیراز کے دل میں غم کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ اب اسے اولاد کی کوئی آرزو نہ تھی۔ لیکن اسے غم تھا تو صرف یہ کہ سزا بازغہ کو مل رہی ہے۔

دن آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ ڈھیر سا وقت یونہی گزرتا چلا جا رہا تھا۔ خوشیوں میں ڈوبی سرشار گھڑیاں بھی آتی رہی تھیں اور فکروں میں ڈوبے جاں گسل لمحے بھی اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جا رہے تھے۔ دکھوں نے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ بعض اوقات شیراز کی بے پناہ چاہت بھی اس کے دل میں جنم لیتے وسوسوں کو ختم کرنے میں ناکام ہو جاتی تھی۔ انجانے خدشوں سے دل لرز اٹھتا تھا۔ وہ پریشان سی ہو جاتی۔ دل میں جنم لینے والے ہولناک خیالوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش ناکام ٹھہرتی تو بعض اوقات وہ تنہائی میں سسک اٹھتی۔ اسے شیراز کی محبت پر اعتماد تھا لیکن بیگم قدوس کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے اپنا وجود جھلستا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ بیگم قدوس تدبیروں کی قائل تھیں اور وہ ان کی تدبیروں سے خوفزدہ تھی۔ زندگی عجیب سی ہوگئی تھی جس میں خوشیاں بھی تھیں لیکن غموں کی زیادہ آمیزش تھی اور غم و فکر کی تلخیاں تھیں کہ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ بعض اوقات مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ عجیب انداز سے دن گزرے چلے جا رہے تھے۔ ہر گزرنے والا دن اس کے غم میں اضافہ کر رہا تھا۔ ان دنوں شیراز ایک مہینے کے لیے کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا تو بازغہ اپنے میکے میں آگئی۔ ویسے بھی اب شیراز کے بغیر اس کا دل ''قدوس منزل'' میں نہیں لگتا تھا۔ صرف شیراز کی ذات سے محبت ہی صرف اسے وہاں رہنے پر مجبور کرتی تھی، ورنہ تو اس کے علاوہ اس کے لیے وہاں کیا رکھا تھا۔ ہر طرف سوال کرتی خاموش نگاہیں، اپنے وارث کے انتظار میں خاموش ''قدوس منزل'' جس کی رونقوں میں وہ از خود کوئی بھی اضافہ نہیں کر سکتی تھی، جو ویسے ہی خاموش اور سنسان سا رہتا تھا۔

وہ اپنے میکے میں بہت دن بعد آئی تھی۔ یہاں آ کر اسے بہت سکون ملا۔ امی کے بازوؤں میں آ کر کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول گئی۔ ابھی تک اس کا سارا سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ کوئی چیز بھی تو اپنی جگہ سے نہیں ہلائی گئی تھی۔ اس کا کمرہ ویسے ہی لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی یہاں سے دو منٹ کے لیے باہر گئی ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''امی آپ نے میرا کمرہ ابھی تک ویسے ہی رکھ چھوڑا ہے۔'' اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ہاں بیٹا!'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''لیکن اس سے کیا فائدہ؟ اور آپ کو مفت میں اس کی صفائی کرنی پڑتی ہوگی۔'' بازغہ بولی۔

''یہ کوئی مشکل کام تھوڑی ہے۔'' وہ بولیں۔

''لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟'' بازغہ نے کہا۔

''جب تم ماں بنو گی نا، تب فرق کا پتہ چلے گا۔'' وہ بولیں۔

''نہیں ابھی بتا دیجیے نا۔'' بازغہ ان کی گود میں سر رکھ کر بولی۔

''بیٹا! اگر اولاد نظروں کے سامنے نہ ہو تو ماں باپ اس کی چیزوں کو دیکھ کر ہی دل بہلا لیتے ہیں، تسکین سی مل جاتی ہے اس طرح۔'' امی نے سمجھایا۔

''تو گویا ماں باپ اولاد کی چیزوں سے بھی پیار کرتے ہیں۔'' بازغہ مسکرائی۔

''ہاں! بالکل، وہ ان کی چیزیں بھی بہت عزیز رکھتے ہیں۔'' امی بولیں۔

''لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بیٹا ماں باپ کے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ان کی اولاد ہوتی ہے۔'' وہ بولیں۔

''اچھا بازغہ کا لہجہ بجھ سا گیا، دل میں کوئی چیز ٹوٹ سی گئی، اس نے آنکھیں موند لیں۔ ''کیا ہوا؟'' امی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بڑا سکون مل رہا ہے اس طرح، جی چاہ رہا ہے یونہی لیٹے لیٹے سو جاؤں۔'' اس نے اندرونی کرب کو صفائی سے دل میں چھپائے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

''تو یونہی سو جاؤ۔'' امی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

اور کتنی ہی دیر وہ یونہی لیٹی رہی۔ بڑی عافیت تھی یہاں، بہت سکون مل رہا تھا اسے، اور پھر یونہی لیٹے لیٹے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

تنہائی کا عذاب سہتے سہتے امی اب بہت نڈھال اور کمزور نظر آنے لگی تھیں۔ اندر ہی اندر بیماریاں چھپائے ہوئے تھیں۔ بازغہ کو ان کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ جی چاہنے لگا تھا، امی کی تنہائیاں مٹانے کو اب یہیں رہ جائے، ان کا دکھ بانٹ لے۔ لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو صرف چند روز ہی کے لیے آئی تھی۔ اس شام مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد امی دیر تک ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھیں اور دعا ختم کر چکنے کے بعد انہوں نے منہ پر ہاتھ پھیر کر سامنے پلنگ پر بیٹھی بازغہ پر نظر ڈالی، جو ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میرے لیے بھی کچھ دعا مانگی تھی؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''تیرے سوا میرا کون ہے، تیرے علاوہ میں بھلا کس کے لیے دعائیں مانگ سکتی ہوں۔'' وہ بولیں۔

''امی!'' بازغہ پلنگ سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''آپ میرے لیے خشوع وخضوع سے دعا مانگتی ہیں نا؟'' جذبات کی تپش ایک دم بڑھ گئی تھی۔ اس کی آواز میں لرزش پیدا ہوگئی، جسے امی نے فوراً ہی محسوس کرلیا۔

''میں تیرا دکھ جانتی ہوں بیٹا۔'' انہوں نے اسے گلے لگالیا۔ ''اللہ دینے والا ہے، وہ سب کو دیتا ہے۔'' امی تسلی آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''لیکن اتنی دیر کیوں کر دیتا ہے؟'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''بہت دیر تو نہیں ہوئی۔'' امی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چار سال تو ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کو تو بہت شدت سے انتظار ہے۔'' وہ ایک دم سسک اٹھی۔

''یہ سب تو خدا کے ہاتھ میں ہے، تم کیا کر سکتی ہو بھلا۔'' امی کے ماتھے پر بھی فکر کی لکیریں گہری ہوگئیں۔

''وہ سب تو مجھے ہی ڈستی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، خوف آنے لگا ہے مجھے ان سے۔'' وہ بولی۔

''ان کو کیا نہیں معلوم کہ انسان تو بے بس اور مجبور ہے۔'' امی نے کہا۔

''امی آپ اللہ میاں کی بہت نیک بندی ہیں، آپ ایسے دعا مانگیے کہ اللہ میاں کو ترس آ ہی جائے۔''

بازغہ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ امی کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اور پھر اس نے امی کو زیادہ وقت عبادت ہی میں مصروف دیکھا۔ خدا جانے کون کون سے وظیفے پڑھنا شروع کر دیے تھے انہوں نے۔ بس ہر وقت زیرِ لب ورد کرتی نظر آتی تھیں۔ ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت بازغہ کی آنکھ کھلی۔ امی کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ جائے نماز پر بیٹھی وہ دونوں ہاتھ پھیلائے خدا کے حضور دعا گو تھیں۔ رخساروں پر آنسوؤں کی لڑی بہہ رہی تھی۔ بازغہ کا دل کٹ گیا۔ ان کی آہستہ آہستہ بولنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ اس نے غور سے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں ''خدایا! میری بچی کی گود ہری کر دے، اس کا گھر آباد رکھیو، میرے پاک پروردگار۔'' وہ گڑگڑا رہی تھیں۔ بازغہ کا دل خون ہونے لگا۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ اس کا وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تو وہ اپنے وجود کو گھسیٹتی واپس اپنے کمرے میں آگئی اور میز پر گر کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ امی کے چہرے پر فکروں کی پرچھائیاں دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بوجھل ہوا جا رہا تھا اور امی بھی تو شاید اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے فکر وغم کے بادل دیکھ لیتی تھیں۔ تب ہی تو وہ اس قدر پریشان اور فکر مند دکھائی دینے لگی تھی۔ اسے یہاں آئے پندرہ دن ہو چکے تھے اور ان پندرہ دنوں میں امی کو خوشیاں اور مسرتیں دینے کی بجائے اس نے انہیں فکروں کا بوجھ ہی دیا تھا، اور وہ اس بوجھ تلے دب کر پہلے سے کہیں زیادہ مضمحل اور نڈھال سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ احساسِ ندامت سے بازغہ کا دل کٹا جا رہا تھا۔

☆☆☆

☆☆☆

''امی! کاش میں آپ کو خوشیاں دینے کے قابل ہوتی۔''

وہ دکھ سے سوچتی اور پھر اپنی بے بسی پر خود ہی رو پڑتی۔ اس صبح وہ ناشتے کے بعد اخبار دیکھ رہی تھی، تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو!'' اس نے ماؤتھ پیس منہ کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو! میں بیگم قدوس بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''السلام علیکم ممی!'' وہ بولی۔

''کہو کیسی ہو؟''

''جی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنایئے، ڈیڈی تو اچھے ہیں نا؟'' وہ بولی۔

''ہاں وہ بھی اللہ کے فضل وکرم سے اچھے ہیں۔ آج شام کی فلائٹ سے شیراز آ رہا ہے۔'' بیگم قدوس نے بتایا۔

''اچھا شیراز آ رہے ہیں!'' بازغہ کھل اٹھی۔ ''مگر مجھے تو کل ہی فون پر انہوں نے کہا تھا کہ وہ اگلے ہفتے آئیں گے، اس کا مطلب ہے سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔''

''چلو خوشی کی بات نہیں ہے کہ وہ جلد آ رہا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے، تمہیں تو معلوم ہے کہ ائیرپورٹ پر تم موجود نہ ہو تو وہ کس قدر قیامت کرتا ہے۔'' وہ بولیں۔

''جی!'' دلنشیں سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر پھیل گئی۔ میں شام سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گی۔

''ٹھیک ہے۔'' فون بند ہو گیا اور ادھر بازغہ کے چہرے پر بہت خوبصورت رنگ آ گئے تھے۔ ایک دم ہی تازگی بکھر گئی تھی۔

''کس کا فون تھا؟'' امی اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔

''شیراز آرہے ہیں۔'' وہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

جدائی کے یہ دن زیادہ طویل نہیں تھے لیکن اسے تو شیراز کے بغیر ایک ایک پل صدی محسوس ہوتا تھا۔ جی ہی نہیں لگتا تھا اس کے بغیر۔

''کب جانا چاہتی ہو؟'' امی نے پوچھا۔

''آج شام کو۔'' وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

''اچھا۔'' امی کا لہجہ نہ جانے کیوں بجھ سا گیا۔ شاید انہیں بھی بازغہ سے جدائی کے لمحات گزارنے مشکل لگ رہے ہوں گے۔ اتنے دن بعد تو اس کے دم سے ان کے گھر میں رونق ہوئی تھی۔ چاہنے والوں سے جدائی کا تصور کس قدر روح فرسا ہوتا ہے، بازغہ کو شدت سے احساس ہوا۔

''میں رہنے کے لیے پھر آؤں گی۔'' اس نے امی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''بس بیٹا! تم اپنے گھر میں آباد رہو۔'' انہوں نے رندھے ہوئے گلے سے دعا دی۔

گھر سے چلتے وقت امی کی دی ہوئی دعاؤں اور تسلیوں کا ڈھیر سارا خزانہ اس کے ساتھ تھا۔ امی کی دعاؤں سے اسے بڑا سکون ملا تھا۔ ان کے سسکیوں بھرے لفظوں میں بہت راحت تھی، بڑی مہک تھی۔ بازغہ کا دل مطمئن سا ہو گیا تھا۔ بہت مطمئن سی وہ ''قدوس منزل'' واپس آ گئی۔ جہاز کے آنے میں دو گھنٹے باقی تھے اور وہ بہت دلربائی انداز میں ان کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔ وہ لان میں آ گئی۔ سرخ گلابوں اور تازہ کھلے موتیے کی خوشبو سے سارا لان مہک رہا تھا۔ ڈھیر سارے پھول توڑ کر اس نے آنچل میں بھر لیے اور پھر سرشار سرشار اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے پھولوں سے سارا کمرا بہت خوبصورتی سے سجایا۔ بڑی لگن، بڑی چاہت سے وہ شیراز کا نام لکھ رہی تھی۔ دل میں ڈھیروں چاہتیں امڈ رہی تھیں۔ پیار کے چشمے پھوٹ پڑے تھے، مسرتوں کے سوتے ابل رہے تھے، اس کے پیار کی خوشبوؤں سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا اسے یہ سب کچھ۔ پھولوں کی بہار آ گئی تھی، اور اس بہار میں وہ بھی پھول کی طرح کھلی جا رہی تھی۔ وقتِ مقررہ پر تیار ہو کر بیگم قدوس کے کمرے میں آئی۔

''ممی چلیے۔'' وہ آتے ہی بولی۔ ''جہاز کے آنے کا وقت قریب ہے۔''

''بیٹا! میں نہیں جا رہی۔'' وہ بولیں۔

''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، تم ہی چلی جاؤ۔'' انہوں نے کہا۔

''اچھا!'' بازغہ نے کہا اور پورچ سے گاڑی نکال کر ائیرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر عموماً خود ہی ڈرائیونگ کرتی تھی کیونکہ شیراز ڈرائیور کی موجودگی پسند نہیں کرتا تھا۔ جہاز وقتِ مقررہ پر آ گیا اور جلد ہی شیراز اس کے پاس پہنچ گیا۔

''ہیلو!'' وہ قریب آتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''ہیلو!'' بازغہ کے لبوں پر بھی بے حد جاندار مسکراہٹ تھی۔ حال چال تو ٹھیک ہے نا جناب کا؟'' وہ حسب دستور اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

''بالکل۔'' بازغہ بولی۔

سامان کی چیکنگ کے بعد وہ ائیرپورٹ سے باہر آ گئے۔

''تمہیں تو ایک ہفتے بعد آنا تھا؟'' بازغہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تو واپس چلا جاؤں۔'' شیراز نے ہنس کر کہا۔

''نہیں نہیں۔۔۔! میرا مطلب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو میں پوچھنا چاہتی تھی کہ پہلے پروگرام تو ایسا نہیں تھا، پھر جلدی کیسے آ گئے؟''

''تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگا۔'' وہ گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اچھا!'' بازغہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''جب تک کوئی حسین چیز نگاہوں کے سامنے نہ ہو میرا کام چل ہی نہیں سکتا۔ وہاں میرا کام نہیں ہو رہا تھا، سو میں واپس آ گیا۔'' وہ سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسرور انداز میں کہہ رہا تھا۔

''وہاں حسین چیزوں کی کمی تو نہیں ہے۔'' بازغہ نے اسے ٹٹولنے کے انداز میں کہا۔

''آ گئی نا رسمی بیویوں کے انداز میں۔'' شیراز نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''چلو مان لیتے ہیں۔۔۔ پھر؟'' بازغہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''بس تمہارا خیال کر لیا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''یا مجھ سے بڑھ کر ملا ہی نہیں؟'' بازغہ نے پھر چھیڑ شوخی کی۔

''بہت خوش فہمی میں مبتلا ہو تم۔'' شیراز نے قہقہہ لگایا۔

''خوش فہمی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔'' دلفریب سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر تھی۔

''کیسے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم کسی معمولی چیز کو پسند کرنے والے نہیں ہو۔'' بازغہ کے لہجے میں اس کے لیے اعتماد تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ! سفر وغیرہ تو ٹھیک ٹھاک رہا نا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''جی جناب! سب کچھ تیزی سے ہو گیا۔'' وہ گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکتے ہوئے بولا۔

''یہاں کیوں روک رہے ہو؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' وہ بولا۔

''گھر پر پی لینا۔'' بازغہ نے کہا۔

''گھر پر بھی پی لیں گے۔'' وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ چائے پینے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک گاڑی سڑکوں پر دوڑا کر مسافت طویل کرتا چلا گیا۔

''بھئی اب گھر چلو نا، خواہ مخواہ راستہ طویل کیوں کر رہے ہو۔'' بازغہ اکتا سی گئی۔

''اتنے دن بعد تو تمہارا ساتھ نصیب ہوا ہے، پہلے جی تو بھر لینے دو۔'' وہ بولا۔

خاصی دیر یونہی گھومتے رہنے کے بعد وہ گھر آ گئے۔ بیگم قدوس محوِ انتظار تھیں۔ قدوس صاحب بھی آفس سے آ چکے تھے۔ شیراز بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے بیڈروم میں آ گئے۔

''یہ میں غلطی سے کسی گلستان میں تو نہیں پہنچ گیا؟'' شیراز چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

''جی نہیں! یہ آپ کا بیڈروم ہی ہے۔'' بازغہ مسکرا رہی تھی۔

''یہ سب کس لیے؟'' وہ بولا۔

''تمہارے سواگت کے لیے۔'' بازغہ نے کہا۔

''بھئی! بیوی ہو تو تمہارے جیسی۔'' وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں چاہتوں کے دیپ جلائے محبوبانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ بازغہ کے چہرے پر کئی خوبصورت رنگ بکھر گئے۔

''بہت خوبصورت انداز ہے یہ۔'' وہ بے خودی کے سے عالم میں بولا۔

''پسند آیا؟'' بازغہ والہانہ انداز میں بولی۔

''بے حد!'' وہ جگہ جگہ پھولوں سے لکھے اپنے نام کو محویت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس کو باہر جاتے دیکھ کر بازغہ نے پوچھا۔

''ایک منٹ میں آیا۔'' وہ چلا گیا اور جب واپس آیا تو ڈھیر سارے پھول اس کے ہاتھ میں تھے۔

''یہ کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''شیراز اور بازغہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے۔'' وہ اپنے لکھے ہوئے نام کے ساتھ پھولوں سے بڑے خوبصورت انداز میں اس کا نام لکھتے ہوئے بولا۔

وہ بہت محویت سے لکھ رہا تھا اور بازغہ قریب بیٹھی اسے تک رہی تھی۔

کتنا محبوب ہے اسے یہ شخص، اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے۔ کاش یہ لمحے امر ہو جائیں، وقت تھم جائے، یونہی اس طرح سب کچھ ساکت ہو جائے۔ وہ سوچتی رہی۔

''اب شاہکار مکمل ہوا ہے۔'' اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہوں!'' بازغہ چونک گئی۔

''اب دیکھو! بات اب بنی ہے۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مان لیا تمہیں فنکار۔'' بازغہ مسکرا دی۔

ڈھیر سارے دن پھر یونہی بیت گئے۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ انجانے وسوسوں میں لپٹے جیسے گنگناتے شب و روز تھے، ویسی ہی اجلی اجلی محبتیں تھیں اور وہی نکھری نکھری شامیں۔

جب سے وہ امی کے پاس سے آئی تھی بہت مطمئن سی ہو گئی تھی۔ بڑی ڈھارس بندھائی تھی انہوں نے، اسے پر امید بنا دیا تھا، مایوسیوں سے بچنا سکھایا تھا۔ اس نے پر امید ہو کر انجانے خدشوں کو دل سے نکال دیا تھا۔ ہلکا پھلکا سا کر لیا تھا خود کو۔

ایک شام وہ گھر واپس آئے تو بیگم قدوس کو اپنا منتظر پایا۔

''میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کیوں امی جان! خیریت تو ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''فون آیا تھا، بازغہ کی امی کی۔۔۔''

تب ہی بازغہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''کیا ہوا امی کو؟'' بازغہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

''ان کی طبیعت خراب ہے، تمہیں بلایا ہے انہوں نے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''وہ خیریت سے تو ہیں نا؟'' بازغہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

''ہاں بیٹا! پریشان مت ہو، بس ایسی ہی معمولی سی طبیعت خراب ہو گئی ہو گی۔'' انہوں نے تسلی دی۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' دل سے صدا آئی۔

ایک خدشے سے اس کا دل لرز اٹھا تھا۔ امی نے تو آج تک کبھی اس طرح نہیں بلایا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا، پورا وجود کپکپانے لگا۔

''چلو۔۔۔ چلتے ہیں!'' شیراز نے کہا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے ساتھ ہو لی۔ گھر پہنچی تو اس کے سارے خدشے درست معلوم ہوتے دکھائی دیئے۔ امی کی زیست کا چراغ اب آخری لمحوں پر تھا۔ دروازے پر ٹکٹکی باندھے وہ اس کی راہ تک رہی تھیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی ان کے بے جان ہوتے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ شمع ایک دم ہی بھڑک کر بجھ گئی۔ بازغہ کے آوازیں دینے پر بھی جب انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو بازغہ کو اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔ جب وہ ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔

''اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' شیراز اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

''لیکن شیراز یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''سب کچھ ہو چکا ہے بازغہ، خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں ہے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''امی مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں۔'' وہ روتے ہوئے شیراز سے پوچھ رہی تھی۔

شیراز نے سر جھکا لیا۔ بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ یونہی روتے سسکتے کئی دن بیت گئے۔ تب ہی ممی ڈیڈی اسے لینے آ گئے۔

''بیٹا! اب گھر چلو۔'' وہ بولے۔

''میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔'' بازغہ کی آواز بھرا رہی تھی۔

''جب تک یہاں رہو گی ان کی یادیں تمہیں بے قرار کرتی رہیں گی۔ دوری غموں کو ہلکا کرنے میں بہت مدد دیتی ہے بیٹا!'' قدوس صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ہمارے ساتھ اپنے گھر چلو، دل بہل جائے گا۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

تب وہ دکھے دل سے ان لوگوں کے ساتھ واپس ''قدوس منزل'' آ گئی۔ ویسے بھی وہ کب تک وہاں رہ سکتی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے وہاں سے جانا ہی تھا۔ امی کی یادوں کے ڈھیروں بوجھ لیے وہ واپس آ گئی۔ وہ صدمے سے نڈھال ہو گئی تھی۔ امی تو سایہ دار درخت کی طرح تھیں جس کی گھنی، ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتی تھی۔ بڑی راحت تھی، بہت سکون تھا اس چھاؤں میں۔ ان کا وجود تو پیار، محبت، خلوص اور سچائی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، جس کی گہرائیوں میں ڈوب کر وہ اپنا آپ بھول جاتی تھی۔ کتنی تسکین ملتی تھی اس مہربان ہستی کو دیکھ کر۔ آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی ان پر نظر پڑتے ہی۔ محبتوں کے کتنے انمول خزانے تھے ان کے پاس، جو وہ اس پر بے دریغ لٹایا کرتی تھیں۔ پر اب تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا، جل کر راکھ بن گیا تھا۔ اب تو ڈھارس بندھانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ روشنی دکھانے والا وجود تو کھو گیا تھا۔ بازغہ کو اپنا وجود خالی خالی نظر آنے لگا تھا۔ بہت اداس اور مضمحل سی وہ لان میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ سعیدہ آ گئی۔

''بہت دکھ ہوا مجھے آپ کی امی کا سن کر۔'' وہ اس کے قریب ہی گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

بازغہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر کچھ بولے بغیر ہی آنکھیں جھکا لیں۔

''ماں چیز ہی ایسی ہوتی ہے، اس کا جتنا دکھ ہو کم ہے۔'' سعیدہ نے ہمدردی سے کہا۔

بازغہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟'' سعیدہ نے پوچھا۔

''ایک بھی نہیں، بس ایک ماں تھی وہ بھی چلی گئی۔'' بازغہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

''بہت افسوس ہوا جی!'' اس نے تاسف سے آہ بھری۔

''ماں ایک نعمت ہوتی ہے نا؟'' بازغہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بیگم صاحبہ!'' سعیدہ بولی۔

''ماں اپنی اولاد کو بہت پیار کرتی ہے نا؟'' بازغہ نے کہا۔

''بہت پیار کرتی ہے۔'' سعیدہ نے بے اختیار ہو کر اپنے پلو سے اس کے آنسو صاف کر دیئے اور بولی:

''میں آپ کی ماں بننے کے لائق تو نہیں ہوں، بہت نیچی ذات ہے میری لیکن آپ کو اپنی اولاد کی طرح پیار تو کر سکتی ہوں، چاہ تو سکتی ہوں نا۔'' سعیدہ کے لہجے میں پیار امڈ رہا تھا۔

بازغہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ بڑی مٹھاس تھی اس کی باتوں میں۔ محبتیں پھوٹ رہی تھیں اس کے انداز سے۔ بہت پیار سے وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

بازغہ کو بہت سکون ملا۔

''ماں خلوص اور محبت کا نام ہوتا ہے سعیدہ، حسب و نسب کا نہیں۔'' بازغہ دھیرے سے بولی۔

''سچ!'' سعیدہ کھل اٹھی۔

''آپ مجھے نوکرانی ہی سمجھنا لیکن میں آپ کو اولاد کی طرح پیار دوں گی۔ میرا سینہ چیر کر دیکھ لیجیے، آپ کے لیے میرے دل میں اپنی اولاد سے زیادہ محبت ہے۔'' وہ بہت پیار اور نیک نیتی سے اپنی

محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ بہت خلوص تھا اس کی باتوں میں۔ بازغہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگ اٹھی۔

''اچھا بیگم صاحبہ۔'' سعیدہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''بیٹی کو بیگم صاحبہ کہتے ہیں کیا؟'' بازغہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ہولے سے مسکرادی۔

''بیٹی بنانے سے آپ کا مقام تو نہیں بدل گیا نا!'' اس کے لہجے میں تھوڑی سے افسردگی شامل ہوگئی۔

''نہیں تم صرف میرا نام لیا کرو!'' بازغہ بولی۔

''جی، کیسے؟''

''بازغہ کہا کرو۔'' بازغہ نے محبت سے کہا۔

''نہیں نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے جی، چلو میں بازغہ بی بی کہہ لیا کروں گی۔'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

بازغہ کھل کر ہنس دی۔ ''اچھا چلو یونہی کہہ لیا کرو۔''

''مگر جی۔۔۔!''

''کیا۔۔۔؟''

''وہ بڑی بیگم صاحبہ ہیں نا'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''وہ کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''وہ بہت ناراض ہوں گی۔'' سعیدہ نے کہا۔

''کس بات سے؟''

''آپ کو بازغہ بی بی کہنے سے جی۔''

''اچھا تم ان کے سامنے مت کہنا۔'' بازغہ نے کہا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' سعیدہ خوش ہوگئی اور سلام کہہ کر چلی گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

زندگی عجیب ڈگر پر چل نکلی تھی۔ ہر لمحے منتظر، ہر ساعت کی آہٹ کا انتظار، ہر پل کسی خوشی کی آس میں دن آہستہ آہستہ بیتتے جارہے تھے۔ بوجھل بوجھل سے ہوگئے تھے۔ خوشیوں کا طویل انتظار کوفت بن کر رہ گیا تھا۔ عجیب سی بے بسی طاری رہنے لگی تھی اس کے سارے وجود پر۔ بہت خوشیاں ملی تھیں اسے، لیکن اب تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے خوشیوں بھرے گلستان کے شجر آہستہ آہستہ سوکھتے چلے جارہے ہوں۔ جیسے اس کے مسرتوں بھرے باغ کے اردگرد آگ بھڑک اٹھی ہو اور شعلوں کا رُخ اس کے مہکتے لہلہاتے گلشن کی طرف ہو۔ وہ گھبرانے لگی تھی، ڈرنے لگی تھی۔ اس کے دل ودماغ پر خوف و ہراس سا طاری رہنے لگا تھا۔ دل میں بے بسی کا احساس بڑھتا چلا جارہا تھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کرسکتی تھی۔ کیا تھا اس کے اختیار میں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ کاش ایک انسان کی بے بسی کا احساس دوسرے کو ہو جایا کرے۔ وہ دکھ سے سوچتی۔ لیکن یہاں کے مکین تو اس احساس سے عاری معلوم ہوتے تھے۔

اور کچھ نہیں تو بیگم قدوس کی نگاہ کا تیر اس کے سینے کے آر پار ہوجاتا تھا۔ اسے اپنا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا محسوس ہوتا تھا اور وہ سسک اٹھتی تھی۔

چوری چھپے اس نے شیراز کا بہت علاج کروایا۔ بہت منتیں مانی گئیں۔ ڈھیر سارے وظیفے پڑھے تھے، لیکن کہیں سے بھی روشنی کی ایک کرن آتی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے پتھر کی سیاہی دھونے کو خوشی کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ مرجھانے لگی تھی۔ ایسے ہی جیسے مہکتا گلاب کڑی دھوپ میں مرجھاتا چلا جاتا ہے۔ ہواؤں کے دوش پر رکھا تھا اس کی خوشیوں کا چراغ، اور وہ تندوتیز چلتی ہواؤں کے جھکڑوں کے درمیان کھڑی اپنے وجود کو بکھرنے سے بچانے کی سعی میں لگی رہتی تھی۔

شیراز کو اس کی حالت کا اندازہ کچھ زیادہ ہی ہونے لگ گیا تھا اور وہ اسے خوش رکھنے کی ہر کوشش میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چاہت اور وارفتگی بے حد بڑھ گئی تھی۔ اس کے جذبوں میں اتنی شدت آگئی تھی کہ وہ بکھرتے بکھرتے خود کو سمٹتا ہوا سا محسوس کرنے لگتی تھی۔ اسے شیراز کی حالت پر بہت پیار آتا تھا، لیکن وہ اپنی حالت کو ظاہر کرکے اس کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ مگر شیراز پھر بھی اس سے بے خبر نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بازغہ کے دل پر کیا گزر رہی ہے لیکن وہ کچھ بھی تو نہ کرسکا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ دنیا جہان کی دولت اور ہر قسم کا عیش و آرام اس کے قدموں میں ڈھیر کرسکتا تھا اور وہ کر بھی رہا

تھا۔ وہ ایک مکمل مرد تھا لیکن قدرت کی طرف سے اولاد کے لیے جو عطیہ مرد کی خصوصیت ٹھہرتا ہے وہ اس کے پاس نہیں تھا۔ شوہر سے عورت کو جو کچھ چاہیے وہ مامتا کی دولت تھی، جو اس کے بس میں نہیں تھا، اور اس میں اس کا اپنا قصور بھی کیا تھا۔ یہ تو سب قدرت کا کھیل ہے۔

محبت میں اس کا ہر انداز ٹوٹ کر چاہنے والا تھا لیکن بازغہ کا اپنا دل سہما جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے اس راز کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ وہ خود کو اس کے لیے تیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس دن شام کے سرمئی اندھیرے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ ''قدوس منزل'' میں بہت سناٹا تھا اور کچھ ایسا ہی سناٹا اس کی روح کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آنکھیں موندے بڑی دیر سے چپ چاپ لیٹی تھی۔ سوچ کی گہرائی میں ڈوبی وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر لگ رہی تھی کہ شیراز کی آواز آئی۔ وہ اسے پکار رہا تھا۔

''بازغہ!'' وہ آواز کے ساتھ ہی اندر آ گیا۔ بازغہ نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا بیمار ہو کچھ؟'' وہ بولا۔

''نہیں تو۔'' شیراز میز پر جھکا پیکٹ رکھ رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیک۔'' وہ بولا۔

''کس لیے؟'' بازغہ نے کہا۔

''تمہارا جنم دن ہے آج تم تو بالکل بھلکو بن گئی ہو۔'' اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔

''اچھا!'' بازغہ کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی آ گئی۔

''مجھے تو اب کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔''

''ایسا لگ رہا ہے کہ کسی دن مجھے بھی بھول جاؤ گی۔'' شیراز نے افسردگی سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے حقیقی خوشیوں کا سامان نہ کر سکا۔''

''کیا کہہ رہے ہو شیراز! میں تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم ہی میری زندگی کا سرمایہ ہو، تم ہی میری جان ہو، تم ہی میرا سب کچھ ہو، تم یوں اداس ہو جاؤ گے تو میں مر جاؤں گی، تم ہی میری زندگی ہو، اور زندگی کے بغیر کوئی جی ہی کب سکتا ہے۔'' بازغہ مسلسل بولتی چلی گئی۔ ''تمہارا وجود کائنات کے لیے خدا کی طرف سے انعام ہے اور یہ انعام میں نے جیت لیا ہے۔ میں تمہارے بغیر۔۔۔''

شیراز نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بازغہ تمہیں یاد ہے جب پہلی بار تم یونیورسٹی کی لائبریری میں مجھ سے ملی تھیں تو میں نے تمہیں دیکھ کر تمہارے چہرے اور تمہاری آنکھوں کی معصومیت سے کیا محسوس کیا تھا؟''

''کیا؟'' بازغہ نے اس کی طرف دیکھ کر تجسس کے انداز میں پوچھا۔

''جنت کی حور۔۔۔ جو زمین پر صرف میرے لیے اتری ہے اور مجھے جنت میں لے جائے گی۔''

بازغہ اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بھئی جنت کی حوریں اگر زمین پر نازل ہونے لگیں تو یہ زمین جنت نہ بن جائے۔''

''نہیں یہ ممکن نہیں۔'' شیراز نے تیقن سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''خالق کائنات تمہارے جیسی حوریں زمین پر صرف خاص لوگوں کے لیے بھیجتا ہے۔''

شیراز کے انداز میں شوخی لوٹ آئی۔

''اچھا! تو جناب خاص لوگوں میں سے ہیں؟'' بازغہ نے خاص انداز میں کہا۔

''جی جناب۔۔۔! اسی لیے تو ہماری محبت زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔'' شیراز نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! محبت میں بھی شرطیں؟''

''ہاں۔۔۔! اور وہ یہ کہ جلدی سے کیک کاٹ کر میرا منہ میٹھا کراؤ۔'' اس نے چھری بازغہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

بازغہ ہنس دی اور ایک ٹکڑا کاٹ کر شیراز کے منہ میں ڈال دیا۔

''شکریہ!'' وہ بولا۔ ''یہ لو سالگرہ کا تحفہ۔'' خوبصورت پیکنگ والا ڈبہ اس نے آگے بڑھایا۔ بازغہ کے دل میں ہوک سی اٹھی لیکن اس نے شیراز پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

''مجھے کچھ مت دیا کرو شیراز۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

''جب تم مل گئے تو باقی کوئی تمنا نہیں رہی۔'' بازغہ نے محبت سے کہا۔

''انسان ایک دوسرے کو صرف وہ خوشی دے سکتے ہیں جو اس کے اختیار میں ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

لیکن بازغہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اسے تو بس یہ احساس ستائے ہوئے تھا کہ وہ شیراز کو اس کی چاہتوں کے صلے میں کچھ بھی نہ دے سکے گی۔ ہر چند قدرت کی طرف سے اس کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی تھی لیکن بیگم قدوس تو ایسا ہی سمجھنے پر مجبور تھیں۔ خالی جذبوں سے محبت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

شیراز نے اس کی طرف دیکھا۔ جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو صاف کیے اور بڑے تحمل سے کہنے لگا۔

''بازغہ مجھے تمہاری محبت کے سوا تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں قصوروار ہوں تو ایسا کہہ رہا ہوں، بلکہ تم جانتی ہو کہ میں شروع ہی سے ایسا ہوں اور تمہارے ساتھ میری محبت کسی بھی لالچ سے ہٹ کر ہے۔ میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور کرتا رہوں گا، ہاں اگر حالات کی طرف سے کوئی تھپیڑا میرے منہ پر لگا تو میں برداشت کر لوں گا لیکن تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو چیز اچھی لگتی ہو اسے پانے کو بھی دل چاہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو ہم یتیم خانے سے کوئی بچہ لے کر پال لیں گے۔ تمہاری ممتا کا تقاضا بھی پورا ہو جائے گا اور ثواب کا ثواب بھی۔ کیوں کیسا ہے؟'' شیراز نے اطمینان سے کہا۔

''نہیں، ہمیں کسی بچے کی ضرورت نہیں۔'' بازغہ نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ بس امی کے رویئے سے خوف آتا ہے۔ وہ کہیں اس خواہش میں آپ کو مجھ سے جدا نہ کر دیں۔''

''اول تو ایسا ہو گا نہیں!'' شیراز نے پریقین لہجے میں کہا۔ ''اور اگر ایسا ہوا تو میں ممی کو صاف صاف بتا دوں گا، یوں بھی ممی کی خواہش اس فیصلے بعد بھی پوری ہونے والی نہیں۔''

''لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم ممی کو اس بارے میں ایک حرف نہیں بتاؤ گے۔''

''ہاں کیا ہے، لیکن تمہاری زندگی سے بڑھ کر اس فیصلے کی اہمیت نہیں۔'' شیراز نے دوٹوک کہا۔

''یہی فیصلہ تو میری زندگی ہے، تم سمجھتے کیوں نہیں۔''

''جو تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔'' شیراز نے قدرے غصے سے کہا۔

''بس جو فیصلہ ہو چکا وہ ہو چکا۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گی کہ تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے۔ میری خدا سے یہی دعا ہے کہ اس دن سے پہلے مجھے موت آ جائے۔'' بازغہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

اس کی بات سن کر شیراز کا دل چاہا کہ وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونا شروع کر دے۔۔۔ اور اگلے ہی لمحے ایسا ہوا۔ شیراز نے اپنا سر بے اختیار اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور رونا شروع کر دیا۔

بازغہ اس کی حالت پر گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے شیراز کے چہرے کو اٹھایا۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو صاف کیے اور مسکرا کر کہا:

''کچھ یاد ہے کہ روتے ہوئے مرد نہ تمہیں اچھے لگتے ہیں نہ مجھے۔''

''ہاں! مگر میں تمہاری حالت دیکھ کر اندر سے ٹوٹتا جا رہا ہوں۔''

''بس آج سے یہ توڑ پھوڑ بند، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔'' بازغہ نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

شیراز محبت کی اس بلندی کو دیکھ کر سرشار ہو گیا۔ اس کا پور پور سرشاری کے عالم میں جھوم اٹھا۔

☆☆☆

☆☆☆

''بہت عرصے سے مریم کے ہاں جانا نہیں ہوا، بہت شکایتیں کرتی ہے وہ۔'' شیراز نے بازغہ سے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''چلو، جلدی کرو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائینگ روم میں لے آیا۔

''اچھا! مجھے تیار تو ہو لینے دو!'' بازغہ نے کہا۔

''اوہو! بھئی تم اس حالت میں بھی بہت اچھی لگ رہی ہو، اور پھر ہمیں کون سا کہیں جانا ہے، مریم کے ہاں ہی تو جانا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' بازغہ کو اس کی ہر ادا منظور تھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ مریم کے ہاں تھے۔

مریم بے حد خوش ہوئی۔

''ماموں! آپ اتنے دن تک آئے کیوں نہیں؟'' رومی کا لہجہ شکایتی تھا۔

''یہ دونوں تو روز ہی تمہیں یاد کرتے ہیں۔'' مریم نے بتایا۔

''ہم تو ان سے ناراض ہیں۔'' نومی نے منہ پھلا کر کہا۔

''نہیں، دیکھو بھئی ناراض نہیں ہونا۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' شیراز جلدی سے بولا۔

''اگر آپ ہماری ناراضی ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلیے۔'' رومی نے تجویز پیش کی۔

''تمہاری ناراضی ہم کسی قیمت برداشت نہیں کر سکتے، تمہاری ہر شرط منظور ہے۔'' شیراز ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو پھر باہر لان میں چلیے۔'' رومی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ہلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ماموں کو چائے تو پی لینے دو۔'' مریم نے غصے سے کہا۔

''نہیں۔۔۔ چائے ہم بعد میں پئیں گے۔'' شیراز بچوں کے ساتھ لان میں چلا گیا۔

اس کے اور بچوں کے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھلے دریچے سے بازغہ نے باہر دیکھا۔ بچوں کے درمیان وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ساتھ بہت مگن تھا۔ بچوں کی معصوم حرکتوں پر اونچے اونچے قہقہے لگا کر انہیں چڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بازغہ کا دم گھٹنے لگا۔ گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ہوک سی اٹھنے لگی دل میں۔ دکھ کا زہر اس کی رگوں میں اترنے لگا۔ دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بس بھابھی ابھی سے؟'' مریم نے کہا۔

''سر کچھ بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا ہے، پھر کبھی آؤں گی۔'' بازغہ بڑی مشکل سے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی اور باہر آگئی۔

''چلو!'' شیراز کے قریب پہنچ کر وہ بولی۔

''ارے ابھی سے؟'' شیراز حیرت سے بولا۔

''ہاں!'' بازغہ نے سر جھکا لیا۔

''اچھا! چلو چلتے ہیں۔'' شیراز نے بیٹ پھینک دیا اور بچوں سے کہا: ''بیٹا! ہم پھر آئیں گے۔'' بچے چپکے کھڑے دیکھتے رہے۔

شیراز نے بازغہ کے چہرے پر لرزتے کانپتے تاریک سایوں کا عکس دیکھ لیا تھا۔

''ابھی سے جا رہے ہیں؟'' رومی ان کے قریب آکر بولا۔

''بیٹا کہا نا کہ پھر آئیں گے۔'' شیراز دونوں بچوں کو باری باری پیار کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا خدا حافظ۔'' اس نے مڑ کر ہاتھ ہلایا۔

''خدا حافظ۔'' وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے باہر کار تک چلے آئے۔

''پھر آئیں گے، وعدہ پکا ہے نا؟'' رومی نے تجدید عہد کرنا چاہی۔

''پکا وعدہ۔'' شیراز نے کار میں بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر پیار کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

راستہ بہت خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ بڑی بوجھل بوجھل سی خاموشی تھی۔ بازغہ چپ سادھے بیٹھی تھی اور شیراز بھی چپ چاپ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اچانک اس نے سینما گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ بازغہ نے استفسارانہ نظروں سے دیکھا۔

''بڑی اچھی پکچر لگی ہے۔'' وہ بولا۔

''لیکن میرے سر میں تو درد ہے۔'' اس نے کہنا چاہا۔

''تمہارے سر میں کوئی درد نہیں ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

''اب باہر بھی آئیں محترمہ۔'' اسے بیٹھے دیکھ کر وہ بولا۔

بازغہ بھی زیادہ پس و پیش کیے بغیر باہر نکل آئی۔ وہ ہال کے اندر داخل ہوئے تو سب انہیں نظریں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ شاید سینما کے ماحول میں وہ ایک خوبصورت جوڑی تھی۔ کتنے ہی لوگوں کی نظریں ان پر بے اختیار اٹھ رہی تھیں۔ بازغہ کو ذرا الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھا۔ لیکن شیراز کو شاید اس کا دھیان نہیں تھا۔ پھر وہ دونوں اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پکچر واقعی بہت اچھی تھی۔ بڑی دلچسپ کہانی تھی اور جب پکچر ختم ہوئی تو اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ وہ باہر نکل کر اپنی کار کی جانب بڑھے تو قریب ہی ایک لڑکے کی آواز آئی۔

''یار! ایسے نہیں لگتا جیسے قدرت نے ان دونوں کو تراش کر بنایا ہے، اس فلم کے ہیرو ہیروئن سے زیادہ ہیرو لگتے ہیں دونوں۔''

''واقعی یار! بڑے خوش قسمت ہیں۔''

شیراز کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے لڑکوں کی طرف دیکھا تو وہ شرمندہ سے ہو کر دوسری طرف ہو لیے۔

بازغہ کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

''کیوں جناب! کیسا رہا یہ ماحول اور پکچر؟'' شیراز نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! یہ بھی ایک زندگی ہے۔''

''تمہاری افسردگی دور کرنے ہی لایا تھا تمہیں یہاں۔'' وہ بولا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تمہارا موڈ ٹھیک ہوا۔ پکچر کیسی لگی؟''

''بہت اچھی، تمہیں بھی تو پسند آئی ہوگی۔'' بازغہ نے پوچھا۔

''ایک چیز سے ایک ہی بار لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔'' وہ بولا۔

''تو کیا تم نے یہ پکچر پہلے سے دیکھ رکھی ہے؟'' بازغہ کے لہجے میں ہلکی سی حیرانی تھی۔

''ہاں!'' وہ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے بولا۔

''تو پھر کیوں آ گئے؟'' بازغہ نے کہا۔

''تمہارے لیے۔'' شیراز اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

بازغہ چپ چاپ مسکراتی رہی۔ وہ اس وقت بھی بازغہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے ہر پل کا، ہر کیفیت کا خیال رکھنے، اس کے جذبوں کا احساس کرنے، اس کے دل میں چھپے احساسات کو سمجھنے والا شیراز دل بن کر اس کے سینے میں دھڑک رہا تھا۔ بڑی عقیدت سی ہو رہی تھی اسے اس وقت اس سے۔ بے پناہ پیار آ رہا تھا اس پر۔ وہ وارفتگی کے عالم میں بیٹھی اسے تک رہی تھی اور وہ چپ چاپ سامنے دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''میرے علاوہ دنیا میں اور چیزیں بھی ہیں، ایک نظر ان پر بھی ڈال لو۔'' سامنے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ بازغہ جھینپ گئی اور اس نے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''میرے علاوہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی کیا؟'' شیراز نے گردن موڑ کر اسے دیکھا نہیں تھا، بس جذب کے عالم میں اس نے کہا تھا تو بازغہ اس کی اس ادا پر مسکرا دی۔

شام کی چائے وہ سب لان میں بیٹھے پی رہے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ شیراز اور قدوس صاحب کاروباری مسئلے سلجھانے میں الجھے ہوئے تھے۔ گفتگو میں کہیں کہیں بیگم قدوس بھی اپنے مشوروں سے نواز رہی تھیں اور بازغہ چپ چاپ بیٹھی آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔

''بھئی ہم تو اب تھک سے گئے ہیں۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

''ڈیڈی! ہمارا بزنس بھی بہت زیادہ پھیل چکا ہے۔ کئی ملکوں میں پھیلے اتنے وسیع کاروبار کو سنبھالنا اب خاصا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اتنی دولت اکٹھی کرنے سے بھی کیا فائدہ؟'' شیراز کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

''بیٹا تم جانتے ہو میری خواہش، میں چاہتا ہوں کہ ہمارا پوتا تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو کر آرام و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔'' قدوس صاحب نے کہا۔

''پوتا آئے تب نا!'' بیگم قدوس کا لہجہ تیکھا تھا۔

چائے کی پیالی بازغہ کے ہاتھ میں لرزنے لگی، حلق ایک دم سوکھتا ہوا محسوس ہوا۔

''ہاں!'' قدوس صاحب نے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ ''یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کو باہر جا کر علاج کروانا چاہیے۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔'' قدوس صاحب بولے۔

''شیراز!'' اسے کھویا سا دیکھ کر بیگم قدوس نے پکارا۔

''جی!'' اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''تم دونوں کو علاج کے لیے امریکہ جانا ہوگا۔'' بیگم قدوس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

''خدا کو دینا ہوا تو وہ دنیا کے ہر خطے میں دے دے گا۔'' شیراز نے اکتاہٹ سے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن بعض اوقات انسان کو بہت تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ تب کچھ حاصل کر پاتا ہے۔'' قدوس صاحب بولے۔

''بس تم اسی ماہ اپنے جانے کے انتظامات مکمل کر لو۔'' بیگم قدوس نے کہا۔

''ابھی تو مصروفیت بہت ہے۔'' شیراز نے عذر پیش کیا۔

''وہ سب میں سنبھال لوں گا۔'' قدوس صاحب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

ان کے لہجے میں آرزوؤں کی تڑپ تھی۔ جذبے امیدوں کی ڈوری تھامے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں آس کے دیپ روشن نظر آرہے تھے۔ پریشانی سے بازغہ کا دل بیٹھنے لگا۔ بے بسی چھانے لگی اس کے وجود پر۔ وہ تو اس کے گھر اور اس کے مکینوں کو ہر خوشی دینے کی تمنا رکھتی تھی۔ بڑے سچے جذبے لے کر آئی تھی وہ اس گھر میں، اس گھر سے اسے بہت پیار تھا، اس کے مکینوں سے بے انتہا محبت تھی، اس کے دل میں اس گھر کو ہمیشہ آباد اور پر بہار دیکھنے کی تمنا تھی۔ بہت کچھ دینا چاہتی تھی وہ اسے، لیکن کچھ بھی تو نہ دے سکی تھی، سوائے ایک طویل انتظار کے۔ اپنی اور شیراز کی بے بسی پر دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شیراز نے اس کی جانب دیکھا اور اس کا دل اندر ہی اندر کٹ کے رہ گیا۔ لیکن وہ مرد تھا، ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور بولا:

''بازغہ! کیا خیال ہے تمہارا؟''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' بازغہ آہستہ سے بولی۔ جی چاہا وہ کہہ دے کہ اس گھر کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔

''ہاں بیٹا! ایک بار وہاں جا کر بھی دیکھ لو۔'' بیگم قدوس اس سے مخاطب ہوئیں۔

اور پھر ڈیڈی نے ان کے باہر جانے کے انتظامات بہت جلدی مکمل کروا دیے۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی کسی کام کے انجام کی خبر کا شدت سے منتظر ہو اور درمیان کے سارے مراحل تیزی سے ختم کر کے اختتام تک پہنچنا چاہتا ہو۔

جانے سے ایک دن پہلے وہ سامان کی پیکنگ کر رہی تھی کہ سعیدہ آ گئی۔

''یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔''

''کیا ہے؟'' بازغہ نے سر اٹھایا۔

''امام ضامن، بازو پر بندھوا لیجیے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا! یہ بھی سہی۔'' بازغہ نے ایک طرف ہو کر بازو اس کے آگے کر دیا۔

''خدا آپ کو بامراد لائے، ہزاروں خوشیوں سے آپ کا دامن بھر دے۔'' سعیدہ دعائیں دے رہی تھی۔

''خدا کرے تمہاری دعاؤں میں تاثیر ہو۔'' بازغہ نے سوچا۔

''مجھے تم سب کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے، مجھے دعائیں دیتی رہا کرو۔'' بازغہ کے لہجے میں التجا تھی، بیچارگی تھی اس کی آواز میں۔ عجیب سی بے بسی تھی سارے وجود پر۔ اپنے منہ سے مانگ کر دعائیں لینی پڑ رہی تھیں۔ صرف اس امید پر کہ نہ جانے کس کی دعائیں رنگ لا کر اس کی زندگی میں رنگ بھر دیں۔ جانے کس کے منہ سے نکلا ہوا دعائیہ جملہ اس کے سونے آنگن میں مسرتوں کی پھوار بن کر برسے، اس کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ بازغہ کے وجود میں ایک مدت سے اندھیرے سے اترے ہوئے تھے اور لوگوں کی دی ہوئی دعائیں ان اندھیروں میں ٹمٹماتے چراغ کی طرح محسوس ہوتی تھیں۔ ان دعاؤں ہی سے اس کے دل میں آس بندھی تھی۔ امیدوں کے چراغ روشن رہتے تھے۔ نہ جانے سعیدہ کتنی دعائیں دے کر واپس چلی گئی تھی۔ وہ ابھی تک ان کے سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بڑا سکون ملا تھا اس کے دل کو، بہت امیدیں لیے وہ شیراز کے ساتھ شیراز کے لیے عازم سفر ہو رہی تھی۔ بہت دلوں کی دعائیں زادِ راہ کے طور پر ان کے ساتھ تھیں۔ ممی ڈیڈی ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئے تھے۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا۔ ممی، ڈیڈی کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی، ان کی نگاہوں میں آس بھری روشنی بکھری ہوئی تھی۔

بازغہ کا دل تڑپ اٹھا۔ ان کو ان کے حصے کی خوشیاں دینے کے لیے شدت سے اس کا دل مچل گیا۔ کاش ان آنکھوں کی جوت کبھی ماند نہ پڑے، ان کو ان کا گوہرِ مقصود مل جائے۔ بازغہ کے دل سے دعا نکلی۔

یو ایس اے آ کر کئی دن وہ یونہی گھومتے پھرتے رہے تھے، سیر و تفریح کرتے رہے تھے، پورے ملک کی سیر کر ڈالی تھی، یادگار لمحوں کو دل کے کینوس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

''ہم یہاں کسی اور مقصد کے لیے آئے تھے۔'' بازغہ نے کئی بار یاد دلانا چاہا تھا۔

''معلوم ہے مجھے۔'' شیراز ٹالنے والے انداز میں کہتا رہا۔

''پھر؟'' بازغہ پوچھتی۔

''بھئی پہلے پورا ملک تو گھوم پھر کر دیکھ لیں۔ علاج شروع ہو گیا تو ایک ہی جگہ بیٹھنا پڑے گا۔ میرے ساتھ تم بھی بندھ جاؤ گی۔'' وہ کہتا اور بازغہ چپ ہو جاتی۔

انہوں نے ایک ایک جگہ دیکھ لی تھی۔ چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شیراز کو کوئی فکر ہی نہ ہو۔ لیکن بازغہ اس کے اور اپنے بارے میں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے لمحہ لمحہ یاد کرواتی رہی۔ آخر شیراز کو ٹھہرنا پڑا۔

وہ بہت بڑا ہسپتال تھا۔ ہزاروں مایوس مریضوں کی امیدوں کا مرکز۔ وہ دونوں بھی بہت امیدیں لے کر وہاں گئے تھے۔ چیک اپ کی رپورٹ دو دن بعد آنی تھی۔ اور یہ دن بازغہ کے لیے دو صدیوں سے کم نہیں تھے۔ ہر پل، بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے وقت ٹھہر نا چاہ رہا ہو۔ آگے بڑھتا ہی نہیں تھا۔ ایک منٹ کے بعد دوسرا منٹ بہت مشکل سے آتا محسوس ہو رہا تھا۔ لمحہ لمحہ گن کر ایک دن پورا ہوا تھا اور بڑے انتظار کے بعد اب دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تھا۔ پھر وہی کوفت بھرے لمحے تھے۔ انتظار کی جاں گسل گھڑیاں آہستہ آہستہ بیت ہی گئیں اور وہ آس کے دیپ اپنے دل میں روشن کیے، ہسپتال پہنچ گئے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ انہوں نے شیراز کی رپورٹ وصول کی اور پھر اس پر نظر ڈالتے ہی ایسے لگا جیسے لفظوں کی شکل میں کالے ناگ لہرا رہے ہوں۔ واضح الفاظ میں تحریر تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا۔

شیراز کا دل ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ہی بازغہ کو اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا جیسے وہ زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں آ گئی ہو۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ گرد و غبار کے طوفاں سے اٹھنے لگے دماغ میں، نظروں کے سامنے بگولے ناچ رہے تھے، چنگاریاں سی پھوٹنے لگی تھیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی، اس طرح جیسے کسی طوفان کی زد میں آ کر کوئی ہری بھری شاخ ٹوٹ کر زمین پر آ پڑی ہو۔

اس کا پورا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا۔ شیراز کی آوازیں کہیں، بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ تو شیراز کی اس حیثیت کے بعد کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ انگارے بھر گئے تھے اس کے ذہن میں۔ شعلوں کی زد میں آ گیا تھا اس کا وجود۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راستہ کس طرح طے ہو، اسے کچھ بھی خبر نہیں تھی۔ نہ جانے کتنی ساعتیں، کتنے گھنٹے اسی طرح بیت گئے۔

شیراز کا حال اس سے کچھ مختلف نہیں تھا لیکن وہ اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ چپ چاپ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سسکتے زخموں پر وقت نے مرہم رکھا تو آہستہ آہستہ جلن کا احساس ہوا۔ تقدیر کے ایک ہی کاری وار نے دل کی خوشیاں چھین لی تھیں، آرزوؤں کی مہکتی کلیاں نصیبوں کے پیروں تلے روندی جا چکی تھیں۔ خزاں رسیدہ تھپیڑے اس کی روح کو جھلسانے لگے۔ روح کی گہرائیوں میں سناٹے اتر گئے تو وہ پھر سسک اٹھی۔ نہ اس کا کوئی قصور تھا نہ شیراز کا۔ لیکن شیراز اسے بہت دور جاتا محسوس ہو رہا تھا، اور شیراز کی دوری اس کے لیے موت تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

''بازغہ!'' شیراز نے پکارا۔ ''اتنی کم ہمت مت بنو، دیکھو تمہاری ممتا کی خواہش تو پوری ہو سکتی ہے، دکھ تو مجھے ہونا چاہیے کہ میں کسی صورت بھی باپ نہیں بن سکتا۔''

بازغہ اس کی بات سن کر تڑپ گئی۔ وہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچ چکی تھی۔

''شیراز!'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں نے تم سے محبت کی ہے، تم ہی میرے دل و جان کا اول و آخر سرمایہ ہو، تمہارے علاوہ میں کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، کیا صرف ممتا کی خواہش کے لیے میں تمہیں چھوڑ دوں گی، یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ مجھے تم سے اس بات پر الگ کر دیا جائے گا۔''

شیراز کے چہرے پر ایک دم ایک سایہ سا لہرایا، لیکن پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا:

''بازغہ! میں تمہاری خاطر تم سے الگ ہونے کے لیے تیار ہوں۔''

''کیا؟'' بازغہ کی جیسے چیخ نکل گئی۔ ''شیراز!۔۔۔تم۔۔۔تم یہ بات کہہ رہے ہو؟''

''ہاں! اگر تم چاہو تو۔۔ میرے ذہن میں ایک بہت ہی اچھی تجویز ہے۔''

''کیا؟'' بازغہ نے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ذرا حوصلے سے سننا۔'' شیراز نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ''تمہارے تعاون سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

''تعاون؟ محبت کرنے والوں سے تعاون کی طلب کرتے ہو شیراز، محبت کے سامنے تعاون کا لفظ تو بہت ہیچ ہے۔'' بازغہ نے اسے سمجھتے ہوئے کہا۔

''اسی محبت کے لیے ہی تو تعاون درکار ہے۔''

''اچھا کہو۔'' بازغہ نے خود کو سنبھالا۔ ''میں سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہم یہاں اس وقت امریکہ میں ہیں، اور یہاں بہت سے مسلمان بھی موجود ہیں، کچھ ایسے ہیں جو اپنے ملک سے پیسہ کمانے کی خاطر یہاں آئے ہیں، کوئی بھی کام انہیں مل جائے، وہ پیسے کے لیے کرنے کو تیار ہیں۔'' شیراز چپ ہو گیا۔

''اچھا پھر؟'' بازغہ اس کی ادھوری بات سمجھ نہ سکی۔

''ہم شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک کام کر سکتے ہیں۔'' شیراز نے شدت کے ساتھ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

''شیراز! جلدی سے بتاؤ، میرا دم گھٹنے لگا ہے۔''

''دیکھو یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔''

''بھئی کون سی بات؟''

''حلالے والی۔''

''کیا۔ کیا۔ میں سمجھی نہیں؟'' وہ پھر چیخ پڑی۔

شیراز نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی کیفیت دیکھ کر خاموش ہو کر رہ گیا۔

''بازغہ اس کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی۔ شدت درد سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ گئی تھیں۔

''تم بات مکمل کیوں نہیں کرتے؟'' بازغہ نے عاجزی سے پوچھا۔

''میں تمہیں پھر سمجھاؤں گا، اس وقت تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔''

''لیکن میں سمجھتی جا رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''کیا؟'' شیراز نے آہستگی سے پوچھا۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ تم مجھے طلاق دے دو اور میں کسی اور سے شادی کر کے اس سے طلاق لے لوں۔۔۔ یہی نا؟''

''ہاں۔۔۔!'' شیراز نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''آخر مرد ہو نا!'' بازغہ نے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بازغہ میں تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کرنا چاہتا ہوں، مجھے اب بچے کی ہرگز آرزو نہیں، مجھے تو معلوم ہے کہ میں باپ نہیں بن سکتا، تم تو ماں بن سکتی ہو نا۔۔۔!'' اس نے توقف کیا۔ بازغہ بھی چپ تھی۔ پھر اس نے کہا:

''دیکھو بازغہ! ہم یہاں کم از کم ایک سال کے لیے مزید ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی تقریباً چھ مہینے یا سات مہینے میں مکمل ہو جائے گی، ہم کسی کو بھی نہیں بتائیں گے، پھر جب یہاں سے جائیں گے تو بچے کی پیدائش اپنے ہی ملک میں ہو گی، ممی ڈیڈی کو کیا معلوم کہ معاملہ کیا تھا، میری عزت بھی رہ جائے گی اور تمہاری ممتا بھی بچ جائے گی۔'' شیراز نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''دیکھو شیراز! میری طرف دیکھو۔'' بازغہ نے اسے عجیب سے لہجے میں کہا۔

شیراز نے اپنا سر اٹھایا تو بازغہ نے کہا۔

''بے شک شریعت کے دائرے ہی میں سہی، کیا اس جنت کی حور کو تم کچھ عرصے کے لیے کسی کے حوالے کر دو گے؟'' اس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں کی طرف کیا: ''یہ وہی آنکھیں ہیں نا جسے تم نے دیکھ کر محسوس کیا تھا کہ میں جنت کی حور ہوں۔''

''ہاں!'' شیراز نے کہا۔

''اب کیا تمہاری محبت میں کچھ کمی واقع ہو گئی ہے؟''

''نہیں بازغہ! میں اپنی اور تمہاری محبت کا وہ عروج دیکھنا چاہتا ہوں جو کسی نے نہ دیکھا ہو۔''

''اس عروج میں قربانی کون دے رہا ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''ہم دونوں۔'' شیراز نے وثوق کے ساتھ کہا۔ ''تم اپنے وجود کو میرے لیے مجھ سے جدا کرو گی اور میں تمہارے لیے اپنے ہاتھوں مول لینے والی رقابت برداشت کروں گا۔''

''اچھا!'' بازغہ نے حیرت سے کہا۔ ''تم کر سکتے ہو؟''

''نہیں چاہتا، مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا بازغہ۔ دیکھو تمہارا وہ بچہ تمہارا اپنا ہو گا، اور ممی ڈیڈی کو وارث مل جائے گا، اور پھر ہم مرتے دم تک کبھی جدا نہ ہوں گے۔''

''اگر ایسا کرنے سے بھی خدا کو منظور نہ ہوا تو۔۔۔؟'' بازغہ نے اسے خدشے کے ان دیکھے وجود سے آشنا کرنا چاہا۔

''انسان اپنے اختیار کے مطابق کوشش تو کر سکتا ہے، باقی جو خدا کو منظور ہوا۔''

''شیراز!'' اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔ ''خدا کے لیے مجھ سے یہ امتحان نہ لو۔''

''تو میں سمجھوں کہ۔۔۔'' شیراز جملہ پورا نہ کر سکا۔

''شیراز! میں تمہارے لیے یہ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن ذرا سوچو! کیا اس طرح میں تم سے کبھی نظریں ملا سکوں گی۔''

شیراز جواباً چپ ہو گیا۔ بازغہ نے پھر کہا:

''خدا کے لیے شیراز! ایسی باتیں نہ سوچو۔ بے شک ہمارا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن ایسا کرنے سے میرا اپنا وجود میری اپنی ہی نظروں میں گر جائے گا۔''

بازغہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید۔۔۔ اس لیے کہ خامی تو خود اس میں تھی۔ اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاید یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی، اور پھر وہ تو اس کی ہر خواہش کا احترام بھی کرتی تھی، حتیٰ کہ اپنی ذات کو بھی اس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ اسی لیے اس نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا سوچ لیا تھا، لیکن اب۔۔۔ شیراز کے دل میں اس کی عزت اور بڑھ گئی۔ شیراز کا جی چاہا کہ وہ اس عورت کی عظمت کو سلام کرے۔ لیکن وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بازغہ کا جی چاہا کہ وہ اس کے قدموں میں سر رکھ کر پوری شدت سے روئے لیکن اس لمحے اسے یوں لگا جیسے آنسوؤں کا سمندر اس کی آنکھوں کے ساحل پر آ کر واپس پلٹ گیا ہو۔ وہ ایک سکتے کے عالم میں زمین پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

شیراز امریکہ سے ابھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اب بازغہ میں حوصلہ ہی کہاں رہا تھا کہ کچھ دن اور رک جاتی۔ شیراز اس کے سامنے نظریں نہیں اٹھاتا تھا۔ لیکن بازغہ کو یہ بھی ملال تھا کہ وہ ابھی تک اپنی بات پر شرمندہ ہو کر اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں ہیچ محسوس کرتا ہے۔ بازغہ اپنی ساری تکلیفیں بھول گئی۔ اس نے ہر ممکن شیراز کو خوش رکھنے کے جتن کیے لیکن ایک دم وہ کچھ سوچ کر اداس ہو جاتا اور اس کی نظریں خود بخود زمین پر گڑنے لگتیں۔ بازغہ کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اسے شیراز کی اس کیفیت سے خدشہ سا محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ شرمندگی سے بچنے کے لیے سچ مچ اس سے علیحدگی اختیار نہ کر لے۔ وہ کسی طور اس سے بچھڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''شیراز! اگر تم ایسے ہی رہے تو مجھے لگتا ہے میں بہت جلد تمہاری محبت سے محروم ہو جاؤں گی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' شیراز بول اٹھا۔ ''کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے؟''

''کس بات کی معافی؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بھئی انجان بننا کوئی تم سے سیکھے۔'' شیراز نے اس کی صورت پر ہمت کر کے نظریں گاڑ دیں۔

''اگر تمہارا خیال اس معاملے کی طرف ہے تو شیراز میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ گئی ہے۔''

''بھئی وہ کیسے؟'' شیراز نے حیرت سے پوچھا۔

''تم میری محبت میں دیوانگی کی حد سے بھی گزر جاتے ہو اور نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہو۔''

اس کی بات سن کر شیراز کو اپنا وجود ہواؤں میں اچھلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔

''بازغہ! میں حیران ہوں، تم اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کر لیتی ہو۔''

''تم ہی نے تو یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھ کر سکھائی تھیں۔'' بازغہ کے دل میں پرانے منظر گھوم گئے۔

''بازغہ! مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں۔''

''ایسا نہ کہو شیراز! تم ایک مرد ہو، تمہارا وجود میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، اگر اولاد کا جوہر اللہ نے نہیں دیا تو تمہاری محبت ہی میرے لیے کافی ہے۔ اللہ کرے ممی اور ڈیڈی کو یہ بات سمجھ آ جائے۔''

''اللہ کرے!'' شیراز نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

وہ عقیدت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ شیراز آہستہ آہستہ کافی میں چمچ چلانے میں مصروف تھا۔

''میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف پہنچ رہی ہے۔'' بازغہ کے لہجے میں پریشانی سی تھی۔

''بالکل نہیں، مجھے خدمتِ خلق میں بہت مزا آ رہا ہے۔'' وہ بہت اطمینان سے بولا۔

''اچھا!'' خفیف سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر پھیل گئی۔

''خدایا شکر ہے تیرا، میرے سوکھے چمن میں کوئی کلی تو چٹکی۔'' شیراز نے اس کے مسکراتے ہونٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو بازغہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ کچھ دیر خاموشی سی چھائی رہی۔ دونوں سوچوں میں ڈوبے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔

''ایک بات یاد رکھنی ہے۔'' شیراز نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' بازغہ نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

''ممی اور ڈیڈی کو اس حقیقت کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر نے ہمیں مایوس کر دیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر انہیں بتانا ہو تو پھر سچ سچ بتانا پڑے گا۔''

''لیکن لیکن۔۔۔'' بازغہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اگر ایسا ہوا تو میں اپنے بارے میں صاف صاف بتا دوں گا۔''

بازغہ الجھ سی گئی۔ ''زندگی میں بعض اوقات ایسا کرنا پڑتا ہے۔ وقت اچھا گزر جائے گا اور پھر کچھ عرصے میں ہم کوئی اچھی صورت نکال لیں گے۔'' شیراز کے لہجے میں عزم شامل تھا۔

''وہ پوچھیں گے تو کیا کہیں گے؟''

''تم خاموشی اختیار کیے رکھنا، میں دیکھ لوں گا۔'' وہ بولا۔

''لیکن کب تک؟'' بازغہ نے کہا۔

''جب تک ہم دونوں بوڑھے نہ ہو جائیں۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر بھی آ گئی۔

''اب واپس کب چلنے کا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''سیدھے واپس نہیں جائیں گے۔'' وہ بولا۔

''پھر؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''سارے یورپ کی سیر کرتے ہوئے واپسی ہوگی۔'' شیراز نے جواب دیا۔

''کیوں، اس کی اب کیا ضرورت ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''میں تمہارے ساتھ زندگی کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔''

تم کتنے بلند، کتنے عظیم ہو شیراز، کتنی خوبصورتی سے غموں کو ہلکا کر دیتے ہو۔ بازغہ سوچنے لگی۔ کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔

''کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟''

''پوچھو!'' بازغہ نے محبت سے کہا۔

''تمہیں دکھ نہیں ہوا اس بات کا؟'' شیراز نے کہا۔

''بالکل نہیں! میں خدا کی رضا میں راضی ہوں۔'' اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

شیراز نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو خزاں کا ایک جھونکا سا آ کر گزر گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو دکھ کا عکس لہرایا تھا۔ ایک پل کے لیے غموں کی پرچھائی سی پڑی تھی۔ شیراز کی آنکھوں میں بازغہ کا دل تڑپ اٹھا۔ جی چاہا ان آنکھوں میں سے غموں کی پرچھائیاں نوچ کر ان میں خوشیوں کے دیپ روشن کر دے، لیکن وہ روشنی کہاں سے لاتی۔ اس کے دامن میں خوشیوں کے پھول کہاں سے ڈلتی۔ اگر خوشیاں بازاروں میں بکا کرتیں اور اسے اپنی جان کے عوض بھی خریدنی پڑتیں تو وہ شیراز کے لیے خرید لیتی لیکن خوشیاں بازاروں میں تو نہیں بلتیں، کسی بھی مول سے نہیں خریدی جاسکتیں، یہ تو آسمانوں سے آتی ہیں اور اس کی دعائیں آسمانوں تک نہیں پہنچ سکی تھیں، بس نیچے سے ٹکرا کر خالی واپس ہو جاتی تھیں۔ بے بسی، بیچارگی اور دکھ کی شدت سے اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ آس پاس بادل اکٹھے ہونے لگے۔ برسات شروع ہونے کے آثار ہوئے تو اس نے آنکھیں موند لیں اور غموں کے قطروں کو دل کی گہرائیوں میں جذب کرنے لگی۔ واپس آتے ہوئے انہوں نے یورپ میں کئی ملکوں میں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کیا۔ گھوم پھر کر کائنات کا حسن دیکھا۔ فطرت کی دلکشی کے نظارے دیکھے۔ ہر طرف حسن ہی حسن تھا، بہاریں تھیں، رونقیں اور ہنگامے تھے۔ شور وغل میں ڈوبے خوبصورت شہروں میں، بہت رونقیں ہوتی ہیں۔ زندگی کی حرارتیں، امنگیں ہوتی ہیں۔ سب چیزوں پر نکھار اور تازگی تھی۔ بس ایک اس کا دل ہی مرجھایا ہوا تھا۔ کہیں پر بھی تو دل نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی چیز بھی تو دل کو لبھا نہیں سکی تھی۔ شیراز ہر قدم پر اس کے ساتھ تھا۔ اس کی خوشیوں کی تمنا میں ہمہ وقت مصروف۔ لیکن وہ پھر بھی اکتا سی گئی۔

''شیراز! بس اب گھر واپس چلو۔'' اس کا لہجہ بے حد اکتایا ہوا تھا۔

''دل بھر گیا کیا؟'' شیراز بولا۔

''ہاں!'' اس نے کہا۔

لٹے لٹے سے، بجھے بجھے سے دل کے ٹکڑے لیے، جلے سپنوں کی راکھ سمیٹے وہ دونوں پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

آنکھوں میں امیدوں کے دیے روشن کیے اور سپنوں کی جگمگاتی مسکراہٹیں لیے ممی اور ڈیڈی ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ شیراز نے سب دکھوں کو دل میں مقفل کر کے ہونٹوں پر اتنی جاندار اور خوبصورت مسکراہٹ سجائی تھی کہ بازغہ حیران رہ گئی۔ خود اسے بھی مسکرانا پڑ رہا تھا۔ غموں کی سیاہی دھو کر چہرے پر اطمینان اور سکون کا غلاف چڑھا لیا تھا۔ دکھوں کا تیل ڈال کر آنکھوں میں بجھے دیوں کو دوبارہ روشن کر لیا تھا۔

ممی ڈیڈی نے ان دونوں کو گلے لگا لیا۔ جذبوں کی گرمی تھی ممی کے جسم میں۔ سینے میں مچلتی آرزوئیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

ممی اور ڈیڈی کو شیراز اور بازغہ کے چہروں پر پھیلی طمانیت کے احساس نے اطمینان دلا دیا تھا۔

''بیٹا! علاج تو مکمل ہوا ہے نا؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''جی بالکل!'' شیراز نے بہت اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''تو پھر؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔'' شیراز نے ان کی بات کاٹ دی۔

''سچ ہے۔'' بیگم قدوس کے چہرے پر خوشیوں کے سوتے ابل پڑے۔

''بشرطیکہ صبر کیا جائے۔'' وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''ہم تو صابر ہیں بیٹا!'' وہ بولیں۔

''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' شیراز بولا۔

''لیکن کب تک صبر۔''

''صبر کی کوئی معیاد نہیں ہوتی ہے، ایک دن یہ بہت میٹھا پھل لے کر آتا ہے۔'' شیراز کہہ رہا تھا۔

بازغہ نے نظریں اٹھائیں تو اسے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ بہت دکھی سی مسکراہٹ تھی اس کے لبوں پر، دھواں سا بھرا ہوا تھا اس کی نگاہوں میں۔ نہ جانے یہ دکھوں کی آگ سلگی تھی یا ماں کو بہلاوے دینے کی مشق چل رہی تھی۔ بہت بے چینی تھی شیراز کی آنکھوں میں۔ بازغہ کا دل تڑپ اٹھا، وہ بے قرار ہو گئی، آنکھوں کے آس پاس بدلیاں چھانے لگیں اور اس سے پہلے کہ برسات شروع ہو جاتی، وہ

وہاں سے اٹھ کر آ گئی۔ اس کے دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ آتش فشاں کی طرح جذبے باہر پھوٹنے لگے تھے۔

☆☆☆

☆☆☆

''قدوس منزل'' میں ان دنوں عجیب سی رونقیں چھا رہی تھیں۔ انجانی سی مسرتیں برسنے لگی تھیں در و دیوار پر۔ قدوس صاحب اور بیگم قدوس جو بہت مسرور اور شاد ماں سے نظر آتے تھے، ان کے مزاجوں میں بہت خوشگوار تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ ان کا موڈ ہر وقت اچھا رہنے لگا تھا۔ شیراز مسرتوں کی اس آنکھ مچولی میں ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوشگوار تاثر کو دیکھ کر دل میں چھپے غم کا اندازہ کرنا قطعی ناممکن تھا۔ وہ خوش رہتا اور بازغہ کو بھی غموں کے پردے میں لپٹی ان خوشیوں میں شریک رکھتا۔ وہ بھی دکھتے دل سے ان کا ساتھ دیئے جا رہی تھی۔ لیکن اسے ہر شے اپنے دکھوں میں شامل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کافی دیر تک لان میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے وہ آسمان کی گہری وسعتوں میں نہ جانے کیا تلاش کرتی رہی تھی۔ پرندوں کے جھنڈ وں کی اپنے آشیانوں کی طرف واپسی دیکھتی رہی۔ سرمئی اندھیرے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ نیلگوں آسمان میں سیاہی گھلنے لگی تھی اور وہ یونہی ساکت سی بیٹھی تھی۔ کچھ وقت اور یونہی گزر گیا۔ چاند نکل آیا۔ آسمان پر ستارے ٹمٹمانے شروع ہو گئے۔ کتنے ستارے ہیں آسمان کی گود میں، لیکن میرے نصیب کا ایک بھی نہیں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''بازغہ!'' پیچھے سے بیگم قدوس کی آواز آئی، اس نے گھوم کر دیکھا۔

''کتنی سردی ہو رہی ہے اور تم یونہی بیٹھی ہو، تمہیں ٹھنڈ کا کچھ احساس نہیں۔'' وہ قریب آتے ہوئے بولیں۔

''مجھے تو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا، سب احساس ختم ہو چکے ہیں۔'' بازغہ نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

''چلو! اٹھو، اندر چلو، کم از کم کوئی شال ہی لے لیتیں۔'' وہ بولیں۔

''مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔'' بازغہ کے لبوں پر دکھی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''اپنی صحت کی حفاظت کیا کرو، یوں بے احتیاطی ٹھیک نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

''اچھا!'' وہ بے دلی سے بولی اور تھکے تھکے قدموں سے اندر آ گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ''قدوس منزل'' میں گہرا سناٹا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب تھے، بازغہ کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، عجیب سی بے چینی طاری تھی۔ سارے وجود پر گھٹن کا احساس بڑھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ سردیوں کی زرد دھوپ بلندیوں سے اتر کر سینوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ خزاں کا موسم تھا۔ ہرے بھرے درخت ٹنڈ منڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ سوکھے زرد پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ لان کے ماحول میں اداسی رچی ہوئی تھی اور کچھ ایسی ہی اداسی نے اس کے دل میں بھی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی اور پھر جھک کر ٹوٹے پتے سمیٹنے شروع کر دیئے، زرد سوکھے پتوں کو سمیٹتے ہوئے اس کا جی بہت دکھی ہو رہا تھا۔ بہاروں کے بعد خزاں ضرور آتی ہے اور سارے چمن کی سرسبزی و شادابی نوچ لیتی ہے۔ درختوں پر لگے یہ سرسبز و شاداب پتے خزاں کے بے رحم ہاتھوں سے زخم کھا کر شاخوں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ ٹوٹ کر زمین پر آ گرتے ہیں۔ غموں کی دھوپ میں جھلس کر خزاں کی بے رحمی کی داستاں اڑا اڑ کر سناتے پھرتے ہیں اور پھر پیروں تلے آ کر کچلے جاتے ہیں، مَسلے جاتے ہیں، ریزہ ریزہ ہو کر دھول میں مل جاتے ہیں۔

خوشی کا عرصہ اتنا مختصر کیوں ہوتا ہے۔ وہ سوچتی چلی جا رہی تھی۔ بہاریں اتنی جلدی کیوں چلی جاتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اس نے کئی پتے ایک جگہ اکٹھے کر لیے تھے۔ پھر وہ بڑی دیر بیٹھی شاخوں

سے جدا ان زرد سوکھے پتوں کو گھورتی رہی۔ خزاں کی تباہ کاریوں کا اندازہ کرتی رہی اور پھر جب آنکھیں پتھرانے لگیں تو وہاں سے اٹھ گئی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ پچھواڑے کی طرف نکل آئی۔ پھلوں کے درخت پھلوں کے بوجھ تلے جھک رہے تھے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سائے تھے۔ خوشبوئیں رچی ہوئی تھیں۔ عجیب سی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں ماحول کی ٹھنڈک کا احساس اس کے تپتے ذہن پر پھوار بن کر گرنے لگا تھا۔ بہت سکون ملا تھا اسے یہاں۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ مہندی کی باڑ کے پیچھے سعیدہ اپنے گھر کے آگے بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی اس تک پہنچ گئی۔

''ارے بیٹا آپ۔'' سعیدہ کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

وہ چپ چاپ مسکراتی رہی۔

''اندر آیئے نا۔'' وہ بولی۔

''نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

اب وہ کیسے بتاتی کہ اندر کی فضاؤں میں اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ اب تو کھلی فضاؤں میں بھی سانس لینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ تب ہی اندر سے نسیمہ گود میں بچے کو لیے ہوئے باہر آ گئی۔

''سلام بیگم صاحبہ!'' وہ بولی۔

''وعلیکم السلام!'' بازغہ کی نظریں گول مٹول بچے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سینے میں اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ جذبات کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ نسیمہ اسے بہت بلندیوں پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ دنیا جہان کی دولت جو سمیٹے ہوئے تھی وہ اپنے بازوؤں میں۔ اس دولت کے بغیر عورت کتنی بے وقعت، کتنی بے حیثیت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس نے سوچا۔ نسیمہ کے آگے اسے اپنا وجود بالکل بے معنی، یکسر بے وقعت لگ رہا تھا۔

''تمہارا نواسا بہت پیارا ہے سعیدہ!'' اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔

معمولی کپڑوں میں ملبوس وہ بچہ اسے پھولوں سے زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ بڑی انوکھی سی مہک آ رہی تھی اس کے وجود سے۔ وہ تو آج تک نا آشنا ہی رہی تھی اس مہک سے۔ بازغہ کے دماغ پر وہ مہک بن کر چھانے لگا۔ نرم نرم گوشت کے اس ننھے سے وجود میں دنیا جہان کا حسن سمایا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ممتا کی لہریں موجزن ہونے لگیں۔ عجیب سی بے خودی طاری ہو گئی تھی۔ بے اختیار ہو کر اس نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس پر۔ بہت سکون مل رہا تھا اسے۔ ممتا کے میٹھے میٹھے جذبے انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھے تھے۔

''بہت شریر ہے یہ۔'' نسیمہ کی آواز سنائی دی۔

''تمہیں کیسے پتا؟ ابھی تو اسے بولنا بھی نہیں آتا۔'' وہ خوابوں کی کیفیت سے نکل آئی۔

''ماں کو تو بچے کے ہر اشارے سے اس کے جذبات کا پتہ چل جاتا ہے نا۔'' سعیدہ نے کہا۔

''ہوں۔'' وہ کھو سی گئی۔ وہ تو ایسے تجربے سے گزری ہی نہیں تھی۔

''جب سے یہ آئی ہے، بہت رونق ہو گئی ہے میرے گھر میں۔'' سعیدہ نے نسیمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بچوں سے بہت رونق ہوتی ہے کیا؟'' بازغہ نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔

''گھر کی خوشیاں، رونقیں تو بچوں کے دم ہی سے ہوتی ہیں بیٹا! جس گھر میں بچے نہ ہوں، گھر نہیں ویرانہ لگتا ہے۔'' سعیدہ بے خیالی میں بولتی چلی گئی۔

''اچھا!'' بازغہ کا دل بجھ سا گیا۔

''جب ''قدوس منزل'' میں آپ کی اولاد کھیلے گی نا، تب آپ کو فرق محسوس ہوگا۔''

سعیدہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی لیکن بازغہ کے دل پر ایک گہری چوٹ لگی۔ شدتِ جذبات سے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

ایسے جیتے جاگتے کھلونے سب کے نصیب میں تو نہیں ہوتے۔ دکھ سے سوچتے ہوئے اس نے زور سے بچے کو بھینچ لیا۔

بچہ گھبرا کر ایک دم رونے لگا۔

''لایئے، مجھے دے دیجیے۔'' نسیمہ نے ہاتھ آگے بڑھائے۔

بچہ زور سے رونے لگا تھا اور بہلانا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماں کی گود میں دینا پڑا۔

''اور کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' اس نے پوچھا۔

''دو اس سے بڑے ہیں۔'' وہ بولی۔

''بس اللہ کی دین ہے، ہر سال ایک کا اضافہ ہو رہا ہے۔'' سعیدہ نے کہا۔

''بہت خوش نصیب ہے۔'' بازغہ نے رشک سے سوچا اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

''چائے تو پیتی جائیں۔'' سعیدہ نے روکنا چاہا۔

''نہیں وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

بوجھل قدموں سے وہ واپس آ گئی۔ اس ننھے سے وجود کی گرمی سے اس کی گود ابھی تک گرم تھی۔ سانسوں میں اس کی انوکھی سی مہک بس گئی تھی۔ جی مچل اٹھا تھا۔ ایسا کھلونا پانے کے لیے ممتا کے

سوتے ابل رہے تھے سینے میں، لیکن ایسے کھلونے بازاروں میں تو نہیں ملتے۔اپنی بے بسی کے احساس سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔بہت تھکی تھکی سی وہ واپس آئی تو چائے کی میز پر سب اس کے منتظر تھے۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''ذرا پچھواڑے تک گئی تھی۔'' کرسی پر بے دلی سے بیٹھتے ہوئے وہ بولی۔

''شام کے وقت درختوں کے سائے میں مت جایا کرو، ذرا سی بے احتیاطی نقصان پہنچا سکتی ہے۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں ہلکا سا خوف در آیا۔

بازغہ سے ان کی طرف دیکھا نہیں گیا۔اس نے نظریں جھکا لیں۔

''یہ لو! میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنوایا ہے۔'' انہوں نے بادام کے حلوے کی پلیٹ اس کے آگے رکھی۔

''جی شکریہ!'' بازغہ نے کہا۔

بیگم قدوس ان دنوں اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھیں۔ان کی امیدیں جو وابستہ تھیں اس کے وجود سے۔''روز کھانا ہے تمہیں۔'' وہ بولیں۔

''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''صحت کے لیے بہت اچھا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''لیکن میری صحت تو بہت اچھی ہے ممی!'' بازغہ ہنس پڑی۔

''تمہیں نہیں معلوم، عورتوں کو کتنا صحت مند ہونا چاہیے۔'' وہ بولیں۔

بازغہ چپ ہو گئی۔

''دوائیں تو تم پابندی سے استعمال کر رہی ہو نا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی۔'' اس نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''دواؤں کے ساتھ دعائیں بھی ضروری ہوتی ہیں، میں نے کل سے نیا وظیفہ شروع کر دیا ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

بازغہ کا دل کٹ سا گیا۔سر جھکائے وہ دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔محرومیوں کا زہر گھونٹ گھونٹ اپنے وجود میں اتار رہی تھی۔اسے یوں لگا جیسے وہ سب کو دھوکے میں مبتلا رکھے ہوئے ہے۔لیکن اگر معاملہ اس کے اپنے بارے میں ہوتا تو شاید وہ بتا بھی دیتی۔اب شیراز کے بارے میں کیا بتائے۔جبکہ خود اس نے شیراز کو بھی منع کر رکھا تھا۔

چائے پی کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔اندھیرا پھیل رہا تھا اور کچھ ایسے ہی اندھیروں نے اس کے دل میں پھیلی روشنیوں کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔تاریکیاں چھانے لگی تھیں۔دل کے نہاں خانوں میں اندھیرا ہی اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔امیدوں کی جلتی شمع تقدیر کے بے رحم جھونکوں نے بجھا دی تھی اور اب حسرتوں اور محرومیوں کی تاریکی چھانے لگی تھی۔اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ سسک اٹھی۔

کچھ دن اور یونہی بیت گئے تھے۔بوجھل سے، اداسیوں میں ڈوبے ہوئے، محرومیوں پر ماتم کناں، بجھے بجھے سے، ویرانیاں بکھیرتے دن دھیمی رفتار سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔طبیعت اچاٹ اچاٹ سی رہنے لگی تھی۔اپنے دل کی حسرتوں اور پر امید افسانوں کے اس بھرے ماحول میں رہنے وحشت سی ہونے لگی تھی۔اس کے دل میں آس کے دیپ بجھ چکے تھے۔مگر ممی ڈیڈی کے دل تو روشن تھے نا۔انہوں نے تو ابھی تک آس کی ڈوری تھامی ہوئی تھی۔حالانکہ ڈوری کے دوسرے سرے پر وحشت نے اپنا مقام بنا لیا تھا۔اس ماحول میں رہنے سے بازغہ کو بہت وحشت ہونے لگی تھی۔بہت گھبراہٹیں طاری رہنے لگی تھیں۔

اس نے اجازت لے کر امی کے گھر جانا چاہا۔بیگم قدوس نے بڑی مشکل سے اجازت دی۔ان کا خیال تھا کہ اب ادھر ادھر پھرنا اس کے لیے مناسب نہیں۔

وہ اپنے پرانے گھر میں آئی تو کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں۔خالی بھائیں بھائیں کرتا گھر تھا لیکن اسے یہاں آ کر بہت سکون ملا تھا۔چپے چپے پر ہر طرف یادیں تھیں، گئے دنوں کے نقش کندہ تھے، ماضی کی یادگاریں تھیں، چاہتوں کی نشانیاں تھیں، ہر شے پر امی ابو کے عکس کا احساس تھا۔اس نے بے اختیار ہو کر ان سب چیزوں کو سینے سے لگا لیا۔محبت سے چوم لیا۔جی بھر آیا۔سیاہی کی راکھ سمیٹتے ہوئے۔بڑی دیر وہ یونہی بیٹھی رہی۔وقت کی دبیز تہیں مٹاتا مٹا کر گزرے دنوں کا ایک ایک نقش ڈھونڈتی رہی۔یادوں کے طلسم میں کھوئی رہی۔چاہتوں کے سحر میں جکڑی رہی۔بہت چاہتیں ملی تھیں اسے اس چھوٹے سے گھر سے۔خوشیوں کے پڑاؤ رہتے تھے یہاں۔لیکن اب تو سب کچھ اجڑ گیا تھا۔رونقوں کی جگہ ویرانیوں نے لے لی تھی۔چاہنے والی شفیق مہربان ہستیاں دوسرے نگر میں جا بسی تھیں۔پرنور چہرے خاک میں پوشیدہ ہو گئے تھے۔اب تو صرف یادیں تھیں، اندوہناک یادیں، دل کو تڑپاتی یادیں، ایک کے بعد ایک دل میں گھسی چلی آ رہی تھیں، تڑپانے لگی تھیں۔وحشت بھرے دو دن ہی گزرے تھے کہ شیراز آ گیا۔

''چلو بھئی! اب اکیلی یہاں رہ کر کیا کرو گی۔'' وہ بولا۔

''تو ابھی سے آ گئے؟'' بازغہ نے کہا۔

''تو کیا تم طویل عرصے کے ارادے سے آئی تھیں۔'' شیراز بولا۔

''ہاں!'' بازغہ بولی۔

''کیا مل رہا ہے اس ویرانے میں؟'' وہ بولا۔

''سکون!'' بازغہ کے چہرے پر سکون تھا۔

''حالات سے گھبرا گئیں کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں تو!'' بازغہ نے کہا۔

''پھر ان ویرانوں میں پناہ کیوں ڈھونڈ رہی ہو؟'' وہ بولا۔

''پناہ نہیں ڈھونڈ رہی بلکہ بے حد سکون محسوس کر رہی ہوں۔'' بازغہ بولی۔

''کچھ میرے سکون کا بھی احساس کرلو، تمہارے بغیر میں کیا ہوں؟'' اس نے اپنے آپ پر بے چارگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''کہاں لٹا دیا تم نے اپنا سکون؟'' بازغہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم لوٹ کر اپنے ساتھ نہیں لے آئیں؟'' وہ بولا۔

''میں تو بالکل تنہا آئی تھی۔'' بازغہ نے کہا۔

''اور مجھے تنہائی کا عذاب دے آئی تھیں۔'' وہ بولا۔

''دو دن میں تنہائی محسوس کرنے لگے ہو شیراز؟'' بازغہ نے کہا۔ ''آخر تم کاروباری سلسلے میں پہلے مجھ سے کئی کئی دن کے لیے جدا ہو چکے ہو۔''

شیراز اس کی بات سن کر ہنس دیا۔ ''اچھا اب چلو!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھولی بسری یادوں کو ذہن میں مقفل کر کے وہ شیراز کے ساتھ ''قدوس منزل'' آ گئی۔ پھر شب و روز وہی سلسلہ چل نکلا۔ وہی پر امید چہرے، وہی آس بھرا ماحول۔ جی کی بے چینیاں بڑھنے لگیں۔ دل کا بوجھ اور زیادہ ہونے لگا۔ اداسیاں رچنے لگیں طبیعت میں۔ اکتاہٹ دور کرنے کے لیے اس نے پینٹنگ میں دل لگانا چاہا۔ بڑی خوبصورت پینٹنگ بنا رہی تھی وہ۔ اپنے لٹے سپنوں، ٹوٹی آرزوؤں، جذبات، تڑپتے ارمانوں کو بہت خوبصورتی سے کینوس پر بکھیر رہی تھی۔ خونِ دل میں برش ڈبو کر سسکتے ارمانوں کا خون پھیلا رہی تھی کینوس پر۔ اپنے جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ محرومیاں نظر آ رہی تھیں۔ دور افق پار ٹکٹکی باندھے، جہاں پہنچنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا، ان کے درمیان کئی آسمان حائل تھے۔ ناقابل عبور راستہ تھا۔ شکستہ آرزوؤں کا دھواں عورت کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ بے بسی کی کیفیت شدید تھی۔ بہت خوبصورت پینٹنگ تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اور اب وہ آخری ٹچ دے رہی تھی کہ بیگم قدوس اس کے کمرے میں آ گئیں۔

''کیا بنا رہی ہو بیٹا؟'' وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولیں۔

''یہ تصویر مکمل کی ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

بیگم قدوس نے تصویر پر نظر ڈالی تو ناگواری کے اثرات ان کے چہرے پر پھیل گئے۔

''یہ تم نے کیا بنایا ہے؟'' ان کے لہجے میں خاصی کرختگی آ گئی۔

''جی! تصویر!!'' بازغہ نے سادگی سے جواب دیا۔

''اتنی حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی تصویر، اتنے آسمانوں کا فاصلہ کر دیا تم نے ان دونوں کے درمیان۔'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

آسمانوں کا فاصلہ یوں ہی تو ہے۔ بازغہ نے دل میں سوچا۔

''مایوسی میں ڈوبی چیزیں مجھے قطعی پسند نہیں۔'' انہوں نے برش لے کر تصویر پر بڑا سا کراس بنا دیا۔

''ایسی پینٹنگ بناؤ جس میں بچہ ماں کی گود میں ہو۔ ہماری یہی آرزو ہے۔'' بیگم قدوس نے حکم دیا۔

''ایسی تصویر بنانا میرے بس میں نہیں ہے، مصور اپنے جذبوں کی عکاسی کرتا ہے اور میرے جذبات سسک رہے ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔

''مصور کینوس پر اپنے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ تمہارے خیالات اتنے بے حوصلہ کیوں ہو گئے؟'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''تلخ حقیقتوں سے آشنا ہو کر۔'' بازغہ نے دل میں جواب دیا مگر منہ سے چپ رہی۔

''یہ پینٹنگ ضائع کر دو اور میری بتائی ہوئی تصویر جلد مکمل کر کے مجھے دے دو۔'' کمرے سے باہر جاتے ہوئے وہ بولیں۔

''آپ کی بتائی ہوئی تصویر بنانا صرف میرے بس میں نہیں ہے ممی۔'' وہ اندر ہی اندر سسک اٹھی۔ ''میں امید کے دیئے روشن نہیں کر سکتی۔ سوکھے پڑے ہیں یہ دیئے۔ ایک بوند تیل نہیں ہے ان میں، پھر میں انہیں کس طرح روشن کروں، تاریکیاں پھیلی ہیں میرے چاروں طرف اور مجھے ان ہی تاریکیوں میں جینا ہوگا کہ یہی میرے مقدر کا فیصلہ ہے اور مقدر کے فیصلے بدلے نہیں جا سکتے۔ سوچتے سوچتے اس کی سسکیاں بڑھنے لگیں اور ایک دردناک احساس کے ساتھ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

اگلے دن وہ بیگم قدوس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ وارڈروب کے سامنے کھڑی تھیں۔

''کیا کر رہی ہو ادھر؟'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''ادھر آؤ دیکھو!'' بیگم قدوس نے کہا۔

اس نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر ان کے قریب چلی گئی۔

''یہ دیکھو! کتنے پیارے پیارے فراک ہیں۔ کچھ تو میں امریکہ سے لوٹتے ہوئے ساتھ لیتی آئی تھی اور کچھ مسز عثمانی نے باہر سے منگوائے ہیں۔'' انہوں نے کئی ننھے منے خوبصورت فراک اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

بازغہ کو یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ میں انگارے آ گئے ہوں۔ آگ کی تپش نے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آندھیاں سی چلنے لگی تھیں دماغ میں۔

''میں نے تو بہت سا سامان جمع کر لیا ہے۔'' بیگم قدوس الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہ جانے کیا کیا دکھا رہی تھیں۔ لیکن اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نظروں کے سامنے دھندی چھا گئی تھی۔

''وقت پر ایسا نفیس اور خوبصورت سامان ملنا مشکل تھا نا، اس لیے جو بھی باہر جاتا ہے میں ایک دو چیزیں منگوا لیتی ہوں۔'' وہ بولے چلی جا رہی تھیں۔

اور ننھی منی خوبصورت چیزیں بازغہ کے دل میں ہلچل مچا رہی تھیں۔ تڑپ اٹھا تھا جی، جیتا جاگتا کھلونا پانے کے لیے، جذبات مچل رہے تھے، ممتا کے دریا ابل پڑے تھے سینے میں، باہیں بے قرار ہو گئی تھیں ننھے منے وجود کو ان میں بسانے کے لیے۔ تصور میں اس نے ننھے سے وجود کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ اس کی سانسوں کی گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے بدن کی انوکھی سی خوشبو بازغہ کے مشامِ جاں میں پھیلتی چلی گئی۔ وہ بے خودی کے عالم میں کھڑی تھی۔ خواب کی سی کیفیت میں تھی۔ محبت کے خزانے لٹا رہی تھی اس تصوراتی ہنڈولے پر۔ ممتا کی پیاس بجھا رہی تھی اسے چوم چوم کر۔

''پسند آیا یہ سب تمہیں؟'' بیگم قدوس کی آواز آتی سنائی دی۔

''جی!'' وہ چونکتے ہوئے خواب کی سی کیفیت سے نکل آئی۔ بے قرار باہیں خالی تھیں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ تپتی گود ویسے ہی سونی پڑی تھی۔

''کہاں کھو گئی تھیں تم؟'' بیگم قدوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اس کی کیفیت بھانپ چکی تھیں۔

''جی!'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''زیادہ سوچا مت کرو، آنے والے کے دل پر برا اثر پڑتا ہے۔۔۔ اور ہاں!'' انہیں کچھ یاد آیا۔۔۔ ''دوائی باقاعدہ کھا رہی ہو نا، میں ہر روز تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔''

بازغہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شفقت ہی شفقت تھی۔ محبت ہی محبت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چاروں طرف امیدوں کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔ بازغہ کا دل اندر ہی اندر کٹ سا گیا۔ دکھ کے زخموں سے خون رسنے لگا۔ جذبوں کی ماری ممتا کی پیاس، بیگم قدوس کو امید کی جھوٹی تسلیوں سے، بہلاووں سے بہلائے رکھنا اس کے بس سے باہر ہونے لگا۔ بڑی گھٹن سی ہونے لگی دل میں۔ سانس لینا مشکل ہونے لگا۔

''کیسا لگ رہا ہے تمہیں یہ سب؟'' ان کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

''ہوں!'' وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔

''اب کیا سوچنے لگی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

ان کی بات سن کر بھی بازغہ کے دماغ میں سوچ کے ہتھوڑے چلتے رہے۔

ایسی محبت کرنے والی ساس کسے ملے گی۔ کتنی محبت بھری ہوئی تھی ان کے دل میں۔ پوتے کی خواہش تو سارے والدین کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے کی تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ آہ شیراز! میں کیا کروں؟ کس سے یہ دکھ شیئر کروں۔ تمہیں بھی تو کہہ نہیں سکتی کہ تم اور دکھی ہو جاؤ گے۔۔۔ میں کب تک۔۔۔ ان کو بہلاووں تسلیوں کے سہارے۔۔۔ آخر کب تک۔۔۔ اس کی سوچ پر پے در پے چوٹیں پڑتی رہیں۔

''ممی! آپ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں نا؟'' ایک دم اس نے بیگم قدوس سے سوال کر دیا۔

''ہاں بیٹا!۔۔۔ کیوں نہیں، تم میری بہو بھی ہو اور بیٹی بھی۔'' بیگم قدوس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''اللہ نے ہمیں کوئی بیٹی نہیں دی تھی۔ بس ایک بیٹا ہی بیٹا تھا۔ سو میں نے قدوس

صاحب کی بہن یعنی اپنی نند سے مریم کو لے کر پال لیا۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور پھر اس کی شادی کر دی۔ وہ بھی میری بیٹی ہے۔ اور تمہیں تو میں نے بہو بعد میں بنایا ہے، بیٹی ہی سمجھا ہے تمہیں۔ اور یوں بھی تم میرے شیراز کی پسند ہو۔'' بیگم قدوس بولتی چلی گئیں۔ ''جس دن ہم لوگ تمہیں دیکھنے گئے تھے تو میں نے تمہیں دیکھنے سے پہلے قدوس صاحب سے کہا تھا کہ ہم تو بس رسم نبھانے جا رہے ہیں۔ لڑکی جیسی بھی ہوئی، شیراز کی پسند ہے، ہم انکار نہیں کریں گے۔ قدوس صاحب کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن جب میں نے تمہیں دیکھا تو پتا ہے مجھے کیا محسوس ہوا؟'' بیگم قدوس نے بازغہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''جی۔۔۔کیا؟'' بازغہ کی آواز رُندھ گئی۔

''یہ تو میری بیٹی ہے۔۔۔ جنت کے حور کے روپ میں۔۔۔ اللہ نے زمین پر میرے ہی لیے اسے اتارا ہے۔'' بیگم قدوس نے یہ کہتے ہوئے بازغہ کو سینے سے لگا لیا۔

اور بازغہ کو خود پر قابو نہ رہا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

بیگم قدوس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

''نہیں نہیں بیٹا! روتے نہیں، دل ہلکا نہیں کرتے، تمہاری ماں اس دنیا سے چلی گئی تو کیا ہوا، میں جو تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم اپنی ماں کو بھول جاؤ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ جب تمہیں ان کا خیال آئے، مجھے دیکھ لیا کرو۔'' بیگم قدوس نے محبت کی انتہا کر دی۔

بیگم قدوس کا یہ روپ اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔۔۔ وہ اپنے مجموعی رویئے سے ایک شفیق خاتون تھیں لیکن انتظامی امور میں حد درجہ سخت تھیں۔ انہوں نے اپنا ایک معیارِ زندگی بنا رکھا تھا۔ لیکن وہ اندر سے اس سے بھی کہیں زیادہ شفیق ہوں گی، اسے آج پہلی بار اندازہ ہوا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ کتنی بدبخت ہے وہ۔۔۔ اس نے اندر ہی اندر خود کو کوسا۔ بیگم قدوس تو ایک فرشتہ سیرت عورت ہیں۔ میں زندگی بھر ان کو اپنی طرف سے اور شیراز کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دوں گی۔

شیراز۔۔۔ شیراز! اس کے دل نے پکارا۔ شیراز کیا کر سکتا ہے۔ وہ بہت مجبور ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کو ان کی حقیقی خوشیاں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ مگر اس میں اس کا کیا قصور۔ اوپر سے میرے لیے ہنستا رہتا ہے مگر وہ اندر سے بہت دکھی ہے۔ اور میرا دکھ بھی تو اسی کی وجہ سے ہے۔ میں اس کو مزید دکھی نہیں ہونے دوں گی۔ لیکن ممی ڈیڈی کا دکھ کیسے دور کروں۔ یہ میرے بس میں نہیں۔ ان کی حقیقی آرزو کو پورا کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ وہ سوچتی رہی۔ ان کی یہ آرزو اس کے دماغ میں دیمک کی طرح چمٹ گئی تھی اور اس کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

بیگم قدوس مسلسل اسے تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔ اور بازغہ کے دل میں احساس سا بیٹھنے لگا کہ کب تک تسلیاں دے دے کر ان کے دل میں جلے امیدوں کے چراغ میں تیل ڈال کر انہیں روشن رکھ سکتی تھی۔ کچھ بھی تو اختیار میں نہیں رہا تھا۔ بڑی بے بسی سی طاری ہونے لگی اس پر۔ اس کے دماغ میں تند و تیز ہواؤں کے جھکڑ سے چلنے لگے۔ دل بے اختیار ہونے لگا، اپنے آپ پر قابو نہیں رہا، بے بس ہو گئی تو تیزی سے اٹھی اور جلدی سے اندر جانے لگی۔

''بازغہ!'' بیگم قدوس نے آواز دی۔ ان کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا اس کا چہرہ۔

''یہ ایک دم تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ جلدی سے دوبارہ پلٹ گئی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔

''ابھی آ رہی ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔

الماری میں سے ڈاکٹری رپورٹ نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ لٹے لٹے قدموں سے وہ بیگم قدوس کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

بیگم قدوس جیسی شفیق خاتون، جذبوں اور امیدوں میں ڈوبی ہستی کو ایک تکلیف دہ منظر سے آگاہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آس کے دیپ بجھانے کے لیے بہت بڑا جگر چاہیے تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا اپنا وجود ریزہ ریزہ ہوا جا رہا تھا۔

اس کی سانسوں میں اتنی گرمی نہیں تھی کہ وہ بیگم قدوس کے دل میں جلتے امیدوں کے چراغ کو پھونک مار کر ہمیشہ کے لیے بجھا دے۔ اس کے بندھن توڑ ڈالے۔ بہت مشکلوں سے ہمت مجتمع کر کے وہ ان تک پہنچ ہی گئی اور چپ چاپ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا ہے یہ؟'' بیگم قدوس نے حیرت سے پوچھا۔

''پڑھ لیجیے!'' وہ آہستہ سے بولی۔

ان کے سپنوں، آرزوؤں، امیدوں کے فلک بوس محل کو گرتے دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ امیدوں کی شمع کو دم توڑتے، گل ہوتے دیکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ بہت تیزی سے وہ واپس پلٹ آئی۔

☆☆☆

☆☆☆

شام کے گہرے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔ ''قدوس منزل'' میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بڑا بھیانک سناٹا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے زلزلہ آنے کے بعد شہر میں تباہی مچتی ہے۔ فلک بوس عمارتیں پیوند خاک ہو جاتی ہیں۔ سب کچھ اجڑنے کے بعد بہت بھیانک سناٹا چھا جاتا ہے سارے شہر پر۔ موت کا سا سکوت پھیل جاتا ہے ماحول پر۔ اسی طرح ''قدوس منزل'' میں بھی ان دنوں بہت گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ خاموشی میں ہزاروں راز پنہاں تھے۔ طوفان گزر چکا تھا جو ساری امنگوں، آرزوؤں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا، حسرتوں کے سوا۔ زلزلہ آ چکا تھا۔ سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ اور اب گھٹن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔

بیٹھے بیٹھے اس کا کمرے میں دم گھٹنے لگا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی لمحے شیراز کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے شیراز کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' شیراز نے آتے ہی تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

بازغہ خاموش تھی۔

''ڈاکٹری رپورٹ کہاں سے لی تم نے؟'' شیراز نے پھر سخت لہجے میں کہا۔

بازغہ مسلسل خاموش تھی۔

''بتاتی کیوں نہیں۔۔۔'' شیراز نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

سناٹے کے عالم میں بازغہ بستر پر بیٹھ گئی۔

اب شیراز تقریباً رو دیا۔ ''خدا کے لیے بتاؤ بازغہ! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔''

بازغہ کے وجود میں کوئی حرکت نہیں تھی۔

شیراز نے اپنے دونوں ہاتھ بستر پر ٹکا دیے اور نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔

''کیا مجھے میرے جرم کی سزا دینے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

بازغہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس کی آنکھوں سے ایک دم آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔

شیراز نے جیب سے رومال نکالا اور اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

''جرم میرا اور سزا تم بھگتو، یہ نہیں ہو سکتا۔'' شیراز نے صاف صاف کہا۔ ''میں ابھی ڈیڈی سے بات کرتا ہوں۔''

بازغہ نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اور وہ میرا وعدہ؟'' اس نے جیسے پہلی بار اپنے لب کھولے ہوں۔

''لیکن تم نے بھی تو وعدے کا پاس نہیں کیا۔'' شیراز نے جواب دیا۔

''ہاں! لیکن وعدہ تمہارے بارے میں تھا، اپنے بارے میں نہیں۔'' بازغہ نے روکھائی سے کہا۔

''یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اپنے بارے میں جھوٹی ڈاکٹری رپورٹ پیش کر دو گی۔'' شیراز کی آنکھوں میں دردناک استعجاب تھا۔

''محبت کسی کی میراث نہیں!'' بازغہ نے جواب دیا۔

شیراز نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

''خدا کے لیے بازغہ! یونیورسٹی کے ماحول سے باہر نکل آؤ۔ اب ہم میاں بیوی ہیں اور ایک ذمہ دار زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟'' بازغہ نے ایک دم سوال کیا۔

''ہاں بازغہ۔۔۔! کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔''

''تو پھر تم اپنی محبت نبھاؤ اور میں اپنی۔'' بازغہ نے دوٹوک جواب دیا۔

''میری محبت کا تقاضا ہے کہ میں سچ سچ سب کو بتا دوں۔'' شیراز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''تم میری محبت کو رسوا کرنا چاہتے ہو؟'' بازغہ کے لہجے میں جیسے پوری کائنات کا درد سمٹ آیا تھا۔

''ہرگز نہیں!'' شیراز نے کہا۔

''تو پھر اپنے وعدے کا پاس کرو۔''

''تو گویا تمہاری جان کا دشمن بن جاؤں۔''

''میری جان تو تم ہو۔'' بازغہ نے اٹھ کر اس کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

شیراز زچ ہوگیا۔ ''بازغہ آخر تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟''

''بس اس معاملے میں خاموش رہو!''

شیراز ٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے بازغہ سے کہا:

''یہ صریحاً خودکشی ہے۔'' وہ ایک دم چپ ہوگیا۔

کمرے میں ایک سکوت سا چھا گیا تھا۔ پھر خود ہی اس نے یہ سکوت توڑا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں، تم کہاں تک یہ سب کچھ برداشت کرتی ہو۔''

بازغہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''دیکھتے رہو۔''

شیراز نے اس کی بات سن کر یوں محسوس کیا جیسے بازغہ نہیں بلکہ عزم کا ایک ناقابل عبور پہاڑ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شدت درد کے ساتھ وہ کمرے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

☆☆☆

معلوم نہیں کہ کتنا وقت گزر گیا، شیراز پلٹ کر نہ آیا۔ رات کا سناٹا دل پر ہول بن کر چھا رہا تھا۔ ایک دم بازغہ کو کچھ خیال آیا۔ اس نے الماری سے شیراز کی انگلینڈ سے لی گئی ڈاکٹری رپورٹ نکالی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ پھر ان ٹکڑوں کے مزید ٹکڑے کر کے احتیاط سے ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ اس کے بعد لاشعوری طور پر ایک نظر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف اٹھی تو وہ کھڑکی کے پاس آگئی اور اس کا پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بہت دور چاند اپنے آدھے وجود کے ساتھ آسمان سے جھانک رہا تھا۔ بازغہ سے یہ منظر نہ دیکھا گیا۔ اس نے کھڑکی کا پردہ گرا دیا اور بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ بازغہ نے دروازے کی سمت دیکھا تو بیگم قدوس کے کھنکارنے کی آواز سنی۔ پھر بیگم قدوس کمرے میں داخل ہوئیں اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر جان لیوا خاموشی چھائی رہی۔ بازغہ کا دم اٹکنے لگا۔

''بازغہ!'' کچھ دیر بعد انہوں نے آہستہ سے پکارا۔

''جی!'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ شیراز ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

بازغہ کچھ نہیں بولی۔

''تمہیں یہ بھی معلوم ہے نا کہ تم کتنے بڑے بزنس مین کی بیوی ہو۔'' ان کا لہجہ ایک دم سپاٹ ہوگیا۔

''جی!'' بازغہ نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''اور بیویوں کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔'' وہ بولیں۔

بازغہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔

''یہ بھی تمہیں اندازہ ہوگا کہ ہمارے پاس کتنی دولت ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''جی!'' بازغہ کا لہجہ بدستور دھیما تھا۔

''اور تمہیں یہ احساس ہونا بھی ضروری ہے۔۔۔'' ان کا لہجہ بے حد کھردرا تھا۔

بازغہ کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل سینے کی قید و بند توڑ کر ابھی باہر آ جائے گا۔ بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ بنجر زمین اور بانجھ عورت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی دوسروں کو کچھ نہیں دے سکتیں۔'' وہ بے دردی سے کہہ رہی تھیں۔

بازغہ کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں پھاڑے وہ ان کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔

''تمہیں طلاق لینی ہوگی بازغہ۔'' وہ بولیں۔ بہت سپاٹ تھا ان کا لہجہ۔ بازغہ نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چٹانوں کی سی سختی آگئی تھی ان کے چہرے پر۔ آج ہی دوپہر کو ظاہر ہونے والی شفیق ماں تند مزاج ساس کی سختیوں سے بھی آگے کی منزل پار کر گئی تھی۔ بازغہ کو لگا جیسے کسی بہت بلندی پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا ہو اور وہ تیزی سے لڑھکیاں کھاتی نیچے کی طرف آگئی ہو۔ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ گھومنے لگا تھا نگاہوں کے سامنے۔ ہر چیز چکر کھا رہی تھی۔ زمین و آسمان ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ خدا جانے کتنی دیر میں بلندی سے پستی کی طرف کا یہ فاصلہ طے ہوا۔ راستے میں پڑے کتنے نوکدار پتھروں نے اس کے جسم کو لہولہان کر دیا۔ اس کی روح کو زخمی کر ڈالا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ وہ جب ہوش و حواس میں واپس آئی تو کمرے میں تنہا تھی۔ بیگم قدوس جا چکی تھیں۔

شدت کرب سے دل پھٹنے لگا۔شیراز سے جدائی کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی وہ۔ایسا جان لیوا خیال تو کبھی نہیں آیا تھا۔شیراز کے بغیر وہ جی ہی کب سکتی تھی۔وہ تو اس کی روح تھا،اور اگر جسم میں روح ہی نہ رہی تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔شیراز کے بغیر زندگی،اس روح فرسا خیال ہی سے وہ تڑپ اٹھتی۔شدت کرب سے دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔بہت دیر تک وہ سسکتی رہی۔ناکردہ گناہوں کی سزائیں تجویز ہونے پر دل خون کے آنسو رونے لگا۔

اور جب شیراز آیا تو اس کے چہرے پر گزرے طوفان کی تباہیوں کے آثار تھے۔زردی سی آ گئی تھی منہ پر۔

''کیا ہوا تمہیں؟''شیراز نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''کچھ نہیں۔''اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

''پھر؟''وہ سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''سر میں شدید درد اٹھا تھا۔''اس کی نظروں کا مفہوم پا کر بازغہ نے بہانہ بنایا۔

''اچھا!''شیراز الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔

''دوائی وغیرہ لی؟''ڈرائینگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔اور اس سے پہلے کہ بازغہ کوئی جواب دیتی،وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔اسے شیراز سے اس رویئے کی توقع نہیں تھی۔

ایک دن اور گزر گیا۔گزشتہ رات وہ اس کے کمرے میں آیا بھی تو چپکے سے لیٹ گیا۔خاموشی کے عالم میں نہ جانے کب بازغہ کو بھی نیند کے جھونکے نے آلیا۔کہتے ہیں کہ نین تو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔کسی طرح وہ سو ہی گئی۔مگر رات بھر اس کے سپنوں میں لمحوں کے ڈراؤنے عفریت اس کو نگلنے کی کوشش کرتے رہے اور وہ بار بار ان سے بچتی رہی۔جب اس کی آنکھ کھلی تو شیراز بستر پر نہیں تھا۔کمرہ خالی تھا۔

پہلی بار!بالکل پہلی بار سعیدہ ناشتے کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

''بازغہ بی بی سلام!''اس نے پیچھے سے دروازہ بند کر کے کہا۔

وہ اس کے سلام کا جواب نہ دے سکی،بس سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔

''بازغہ بی بی!''وہ دوبارہ بولی۔''بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ آپ کو کمرے ہی میں ناشتہ پہنچایا جائے۔ان دنوں آپ کے آرام کا انہیں بڑا خیال ہے۔لگتا ہے میرا اللہ میری دعائیں سن رہا ہے۔۔۔میری دعاؤں میں اثر آ گیا ہے۔''سعیدہ مسلسل بول رہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔اس نے سعیدہ کا حال پوچھنا چاہا لیکن آواز اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔

ناشتہ رکھ کر سعیدہ کمرے سے باہر چلی گئی تو اس کا جی چاہا کہ ناشتے کی ٹرالی کمرے سے باہر دھکیل دے،لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔اسے اس گھر کی عزت کا ہر طرح خیال تھا۔اور پھر چپکے سے اس نے ناشتے کے چند لقمے اپنے گلے میں اتار لیے۔

شیراز کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔اس نے عقبی کھڑکی کا پردہ پوری طرح کھول دیا۔اداس سورج کی زرد شعاعیں کمرے میں آ گئیں۔کتنی ہی دیر وہ ان شعاؤں سے کھیلتی رہی اور پھر اس نے دروازہ کھولا تو راہداری میں شیراز کھڑا تھا لیکن اس کی نگاہیں دوسری جانب تھیں۔

اسے حیرت ہوئی کہ وہ یہاں کیوں کھڑا ہے۔اس نے آواز دی

''شیراز!''

شیراز اپنے دھیان میں تھا۔اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ بہت الجھا الجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔سوچوں میں گم،کھویا کھویا سا۔

بازغہ سے برداشت نہ ہو سکا۔''تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔''اس نے پوچھا۔

شیراز نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔بہت تپش تھی اس کی نگاہوں میں۔بازغہ کو اس سے نگاہیں ملانا دشوار سا ہو گیا تو اس نے نگاہیں ہٹالیں۔

کچھ دیر یونہی خاموشی سی رہی۔دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے۔اسے اداس دیکھنا بازغہ کے بس سے باہر تھا۔

''اندر نہیں آؤ گے کیا؟''بازغہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اور شیراز اندر آ گیا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''خاصے توقف کے بعد بازغہ نے دوبارہ پوچھا۔

''کون سی بات کا؟''اسے شاید کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

''یہی کہ تم اتنے پریشان کیوں رہنے لگے ہو؟''بازغہ نے کہا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''پھر بھی؟''بازغہ نے اصرار کیا۔

''ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی ہے۔''وہ رکھائی سے کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

بازغہ کا دل دکھی سا ہو گیا۔ خوشیوں کی ناؤ بڑی تیزی سے منجدھار کی جانب بڑھ رہی تھی۔ سب کچھ ڈوبنے والا تھا۔ اجڑنے والا تھا۔ بیگم قدوس کے کہے ہوئے جملے اس کے دماغ میں ہر وقت ہتھوڑے کی طرح برستے رہتے تھے۔ ضربیں کھاتے کھاتے دماغ سن رہنے لگا تھا۔ خوف سا طاری رہنے لگا تھا۔ زندگی سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ شیراز سے جدائی کا جان لیوا تصور ہر وقت ڈسنے لگا تھا۔ شیراز سے دائمی جدائی اس کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ اور پھر وہ بھلا کس طرح اپنے ہاتھوں موت کے گڑھے میں گر سکتی تھی۔ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنے اور اس کے درمیان جدائی کی ناقابل عبور کھائی کھود سکتی تھی۔

دوپہر کو بیگم قدوس پھر اس کے کمرے میں بیٹھی تھیں اور وہ سانس روکے ان کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی۔

''تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولیں۔

بازغہ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ تکتی رہی۔

''بازغہ!۔۔۔ دیکھو اور ٹھنڈے دل سے سنو۔ ہمارے خاندان کی بقاء کے لیے تمہیں طلاق لینی ہی پڑے گی۔'' انہوں نے اپنا عزم ظاہر کیا۔

''میں خود طلاق نہیں لوں گی۔'' ایک دم بازغہ کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی آ گئی۔

''پھر؟'' بیگم قدوس نے اسے چونک کر دیکھا۔

''آپ خود دلوا سکتی ہیں بے شک۔'' اس کے سینے میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔

''لیکن!'' وہ کچھ کہتے کہتے الجھی گئیں۔

''یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہے۔ آپ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے۔'' زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

''لیکن شیراز نہیں مانتا۔ بہت ضدی ہے وہ۔'' بیگم قدوس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

بازغہ کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے ایک دم جلتی آگ سے کھینچ لیا ہو۔ بہت حوصلہ ملا تھا اسے شیراز کے رویے کے متعلق سن کر۔ دل کو اتنا سکون ملا کہ شاید پہلے کبھی نہ ملا ہو۔

''بہت سمجھایا ہے میں نے اسے لیکن وہ نہ تمہیں طلاق دینے پر آمادہ ہے اور نہ تمہاری موجودگی میں دوسری شادی کرنے پر۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

بازغہ کو قرار سا آنے لگا۔ تپتے ذہن پر شیراز کی چاہتوں کی پھوار سی پڑنے لگی۔ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔

''میں اس کی ماں ہوں، اس کے دل میں جھانک کر اس میں چھپی ہوئی تمناؤں کو دیکھ سکتی ہوں۔ خواہشوں کے ڈھیر دیکھے ہیں میں نے اس کے دل میں۔ لیکن تمہاری وجہ سے اس کی ساری خواہشیں، ساری آرزوئیں راکھ کا ڈھیر بنتی جا رہی ہیں۔'' بیگم قدوس نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

اب وہ بیگم قدوس کو کیا بتائے۔ اس نے سوچا۔ بس وہ اتنا کہہ سکی:

''میں بھی تو اس کی ایک خواہش ہوں۔''

بیگم قدوس اٹھ کر چلی گئیں تو وہ بھی باہر آ گئی۔ بہت گہرا سناٹا چھایا تھا سارے گھر پر۔ کوئی بھی تو دلکشی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر چیز پر سوگواری کا گماں ہو رہا تھا۔ سناٹوں کا راج تھا پوری ''قدوس منزل'' پر۔ اور یہ سب اس کی وجہ سے تھا۔ اسے احساس جرم سا ہونے لگا۔ ناکردہ گناہوں پر وہ اپنے آپ کو مجرم سی محسوس کرنے لگی۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ احساسات جل اٹھے۔ تپش پورے وجود میں پھیلنے لگی۔ اس کے وجود میں بگولے سے اڑنے لگے۔ ذہن کے پردے پر پھول جیسی سوچیں پتھروں میں تبدیل ہونے لگیں۔ سارا بدن سوچوں کی آگ میں جلنے لگا۔ ندامت پسینہ بن کر سارے وجود سے پھوٹ نکلی۔ کھڑا رہنا مشکل ہوا تو وہ بوجھل بوجھل قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اس دن شیراز کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا وہ نک سک کی درستی میں لگا ہوا تھا۔ خاصا خوشگوار موڈ تھا اس وقت اس کا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

بازغہ نے پوچھا۔

''بازار۔۔۔ تم چاہو تو ساتھ چلو۔'' وہ بولا۔

''میں کیا کروں گی جا کر۔'' بازغہ نے کہا۔

''جو دل چاہے، لے لینا۔'' وہ بولا۔

''مجھے تو بس اب ایک ہی چیز لینی ہے۔'' بازغہ کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''کیا؟'' شیراز کے لہجے میں محبت اتر آئی۔

''طلاق!'' بازغہ نے کہا۔

''کیا؟'' وہ تیزی سے پلٹا کھا گیا۔ ''کیا لینا ہے تمہیں؟'' وہ چونک سا گیا تھا۔

''طلاق!'' بازغہ کے لہجے میں سمندر کا سا سکون تھا۔

''ہوش میں تو ہو تم؟'' بڑی گرج تھی اس کی آواز میں۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ اس کے قریب آ گیا۔

''بالکل!'' زخمی سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر آ گئی۔

کچھ لمحے بڑی خشمگیں نظروں سے وہ اسے گھورتا رہا۔ بجلیاں سی تڑپ رہی تھیں اس کی آنکھوں میں۔ کوندے سے لپکنے لگے تھے نگاہوں میں۔ بازغہ ان کی تاب نہ لاسکی اور اپنی نظریں جھکالیں۔

''سچ بتانا تم سے یہ کس نے کہا ہے؟'' شیراز نے اسے شانوں سے پکڑلیا۔

بڑی سختی تھی اس کے ہاتھوں میں۔ وہ گھبرا سی گئی۔ ایک لفظ بھی تو نہیں نکلا زبان سے۔

''بتاؤ!'' وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''کسی نے بھی نہیں!'' بازغہ نے حواس جمع کرلیے۔

''جھوٹ مت بولو! مجھے سب معلوم ہے۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔

بازغہ چپ رہی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارا دماغ بھی خراب ہوجائے گا'' بہت غصہ تھا شیراز کے لہجے میں۔

بازغہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

''تمہارے دماغ کی درستی کی دوا لینے جاتا ہوں۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

بازغہ پریشان ہوکر بالکونی میں کھڑی ہوگئی اور نیچے اس کو جاتا دیکھنے لگی۔ بہت غصے میں گیا تھا وہ۔ گاڑی اندھادھند ریورس کرتے ہوئے بڑی تیزی سے گیٹ سے باہر لے گیا تھا۔ بازغہ کا دل کانپنے لگا۔ اس کے مزاج کی ایک ایک کیفیت سے وہ آشنا تھی۔ جانتی تھی غصے میں وہ کس قدر دیوانہ وار ڈرائیونگ کرے گا۔ کچھ بھی تو نہیں دیکھے گا۔ کچھ بھی تو نہیں سوچے گا۔ وسوسوں نے بازغہ کو گھیرلیا۔ پچھتاوے کی آگ بھڑک اٹھی۔ اسے ایسی بات کہنے کے لیے اس قدر غلط وقت کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ پچھتانے لگی۔ جان بوجھ کر تو اس نے اس وقت کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ بس ایسے ہی سب کچھ ہوگیا تھا۔ وسوسوں میں ڈوبی بالکونی میں کھڑی وہ گیٹ پر ٹکٹکی جمائے ہوئے تھی۔ دل بیٹھا سا جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہ واپس آگیا۔ اسے دیکھ کر بازغہ کی جان میں جان آگئی۔ اب بھی اس کے مزاج میں تیزی نظر آرہی تھی۔ بہت تیزی سے کار لاکر اس نے پورچ میں کھڑی کی تھی۔

''بہت تیز ڈرائیونگ ہورہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کسی حادثے کا شکار ہوجاتا خیال آیا کہ مرنے سے پہلے تم سے کم ازکم تمہارے دعوؤں کے متعلق تو باز پرس کرلوں۔'' وہ اوپر آتے ہی بولا۔

بازغہ کچھ نہیں سمجھ سکی۔ ''دعویٰ تو تمہارا تھا کہ عورت وفا کی پتلی ہوتی ہے، بڑی بڑی قربانیاں آسانی سے دے دیتی ہے، تم کیسی عورت ہو کہ ذرا سا مشکل وقت آیا تو راہیں بدلنے کی سوچ لی؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''اچھا کیا تم نے، تم نہیں رہتے تو میں کیسے جی سکتی تھی۔'' بازغہ شدت محبت سے اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ''خریداری کرلی کیا؟''

''تم نے پریشان ہی اتنا کردیا، اتنا غصہ دلایا کہ کچھ خریدنے کو دل ہی نہیں چاہا۔'' وہ بولا۔

''میری دوا بھی نہیں؟'' بازغہ کو اس کا موڈ خوشگوار کرنا تھا۔ وہ مسکرانے لگی۔

''میں نے سوچا، خود ہی فتح کرلوں گا تمہارا دماغ۔'' وہ بھی مسکرادیا۔

بازغہ سوچنے لگی۔ حالات کے تند و تیز تھپیڑے اب اس قدر لگنے شروع ہوگئے ہیں کہ میرا خراب دماغ تم سے بھی شاید صحیح نہ ہوسکے۔ کیا پتہ تم بھی ہار جاؤ ان حالات سے۔

''بازغہ! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ بہت دکھ دیا ہے تم نے مجھے اس وقت۔'' وہ شکستہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

''شیراز!'' بازغہ نے کہا ''امریکہ جا کر تم نے کیا چاہا تھا؟ یہی کہ میں تم سے طلاق لے لوں۔ بلکہ اس وقت تو تم طلاق دینے پر آمادہ بھی ہوگئے تھے۔ میں ہی نہیں مانی تھی۔''

''ہاں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ وہ محض عارضی جدائی کی حد تک تھا۔ میں نے یہ تھوڑا چاہا تھا کہ میں تم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوجاؤں۔ تمہاری ممتا کے جذبے نے مجھے کچھ وقت کے لیے ایسا سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔'' شیراز نے اسے یاد دلایا۔

''شیراز تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ممتا کا جذبہ شوہر کی عزت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ تم شاید عورت کی ذات کو سمجھ نہیں سکے۔'' بازغہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔

شیراز اس کی بات سن کر شرمندہ سا ہوگیا۔

''ہاں! شاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اب میں ایسا نہیں سوچتا۔ اور نہ ہی ایسا ہونے دوں گا۔''

''اور اگر ایسا ہوگیا تو؟'' بازغہ نے وثوق کے ساتھ کہا۔

''تو تم جانتی ہو، میں پھر بھی رسوا ہی رہوں گا۔'' شیراز کے لہجے میں دکھ بھر گیا۔ ''میری محبت بھی تم ہو اور میری عزت بھی تم ہو۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

کچھ دیر دونوں میں خاموشی رہی۔ پھر شیراز بول پڑا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں طلاق کا یہ منحوس لفظ کس نے سکھایا ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' اس نے ٹالنا چاہا۔

''نہیں، میں غلط نہیں سمجھ رہا۔ ممی کی ان باتوں نے مجھے ان دنوں بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں، اور اب تم نے بھی انہی کی زبان میں بولنا شروع کردیا ہے۔'' شیراز کے انداز میں شکوہ تھا۔

''شیراز پھر میں کیا کروں، تم ہی بتاؤ؟'' بازغہ نے عاجزی سے کہا۔

''بہرحال یہ سارا کھڑاگ یونہی نہیں کھڑا ہوگیا۔ کاش تم اپنی حیثیت کو اس طرح پیش نہ کرتیں۔'' شیراز نے افسوس سے کہا۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولا ''بازغہ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ میں ممی کو

صاف صاف بتادوں۔تم نے خواہ مخواہ ضد کرلی ہے۔اس ضد سے نہ تمہیں کچھ حاصل ہوگا اور نہ مجھے کچھ۔۔۔''

بازغہ نے اس کی بات کاٹ دی۔''کچھ بھی ہو،لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گی کہ تم ایسا کرو۔

''لیکن بازغہ یہ بھی تو سوچوں کہ ممی کیا چاہتی ہیں۔مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑرہا ہے کہ وہ تمہیں طلاق دلوا کر گھر میں بچوں کی رونقیں دیکھنا چاہتی ہیں جبکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسا پھر بھی نہ ہوگا۔پھر اس بے معنی چپ سے کیا مل جائے گا؟''

''اپنے دل وجان سے عزیز محبوب کی عزت۔''

''بازغہ!''شیراز چیخنے کے انداز میں بولا۔''تم بے وقوف تو نہیں ہوگئیں۔یہ عزت تو میری تمہارے ساتھ وابستہ ہے،کسی اور کے ساتھ نہیں۔طلاق ہوگئی تو مجھے کسی اور کے ساتھ بندھنا پڑے گا اور پھر وہی کچھ ہوگا جو ہورہا ہے۔بلکہ بدترین حالات کا سامنا بھی شاید کرنا پڑے۔''

''بس آگے کچھ بھی مت کہنا۔''بازغہ نے اس کے منہ پر رکھ دیا۔

''پھر آخر تم چاہتی کیا ہو؟''شیراز سٹپٹا گیا۔

''تمہارا گھر آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔''

شیراز اس کی بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑا۔''بھلا وہ کیسے؟''

''وقت کا انتظار کرو۔''بازغہ کے اندر ایک عزم جاگ اٹھا۔

''آخر کچھ تو بتاؤ۔تمہارے پاس اس کا کیا حل سامنے آگیا ہے؟''

''بس دیکھتے جاؤ،مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔''

شیراز نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔جنت کی حور کا یہ روپ بھی اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک جاگ اٹھی تھی۔ایسی چمک جو شیراز نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

☆☆☆

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا لیکن شیراز کو اچانک کوئی کام پڑگیا تھا،اس لیے وہ گھر سے باہر تھا۔اسی دن مریم آئی ہوئی تھی۔وہ سب ڈرائینگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

''بہت سناٹا ہورہا تھا۔میں تو سمجھی تھی اب آپ لوگ گھر میں نہیں ہیں۔''مریم نے کہا۔

''یہ سناٹے تو اب اس گھر کا مقدر بن چکے ہیں۔''بیگم قدوس کے لہجے میں چبھن تھی۔

''ایسا تو مت کہیے پھوپھی جان!''مریم بولی۔

''پھر کیا کہوں؟''بیگم قدوس بولی۔

''آپ شاید ٹھیک ہیں،تقدیر نے بہت ستم کیا ہے شیراز پر۔''مریم نے کہا۔

''تقدیر نے نہیں،ستم وہ اپنے آپ پر ڈھا رہا ہے۔''تلوار کی سی کاٹ تھی اس کی آواز میں۔

''اولاد کی خاطر لوگ کئی کئی شادیاں کرلیتے ہیں اور وہ دوسری پر بھی رضامند نہیں ہوتا۔''وہ بولیں۔

''بہت چاہت ہے دونوں میں۔''مریم بولی۔

''چاہت تو اس کے دل میں بچوں کی بھی ہے۔''

''بچوں کی چاہت ختم کر رہا ہے وہ۔'' مریم نے کہا۔

''نہیں! وہ بچوں کی چاہت ختم نہیں کر سکتا۔'' ان کے لہجے میں سختی تھی۔

مریم چپ رہی۔

''اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔ ہمیں بھی چاہت ہے بچوں کی۔'' بیگم قدوس کے لہجے میں وہی سختی تھی۔

''پھر؟'' مریم بولی۔

''اسے بازغہ کو طلاق دینی ہوگی۔'' وہ اپنی ہٹ پر قائم تھیں۔

''اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو؟'' مریم بولی۔

''اسے ایسا کرنا پڑے گا۔ اتنی دولت کا مالک بننا آسان نہیں ہوتا ہے۔ دولت کو سنبھالنے والے بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں۔'' وہ بولیں۔

بازغہ بھی موجود تھی۔ یہ ساری باتیں اس کے سامنے ہی ہو رہی تھیں۔ مریم نے بازغہ کی طرف غور سے دیکھا اور سوچنے لگی کہ پھوپھی جان کو ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ کم از کم اس کی عدم موجودگی میں یہ باتیں کرتیں۔ اور بازغہ جو ساری باتیں خاموشی سے سن رہی تھی۔ سوچنے لگی:

کاش شیراز تم کسی غریب کی کٹیا میں پیدا ہوئے ہوتے جہاں تمہارے اور میرے درمیان دولت کی دیوار کھڑی نہ ہوتی۔ جہاں دولت سنبھالنے کے لیے کسی وارث کی ضرورت نہ ہوتی۔ محبت کی دولت کے سوا اور کوئی بھی سرمایہ نہ ہوتا۔

مریم کے دل میں بازغہ کے لیے نرم گوشہ موجود تھا، مگر وہ کیا کر سکتی تھی۔ بس ایک تجویز پیش کر کے رہ گئی۔

''اگر بھابی اجازت دے دیں تو ان کی موجودگی میں شیراز کی دوسری شادی ہو سکتی ہے۔'' مریم نے بازغہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بازغہ خاموش تھی۔ بیگم قدوس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا:

''اس کے لیے بھی یہ کسی طرح راضی نہیں ہے۔''

''خود سوچنا سمجھنا چاہیے۔'' مریم بولی۔

''اس کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا، پتھر جیسی ہے اس کی سمجھ۔''

''اولاد کو ماں باپ کی خوشی کا بھی احساس کرنا چاہیے۔'' مریم نے کہا۔

''شیراز نے کبھی ہماری خوشی کا احساس نہیں کیا۔'' بیگم قدوس نے جواب دیا۔

''شاید شروع ہی سے بہت ضدی ہے وہ۔'' مریم بولی۔

''ہاں!'' انہوں نے کہا۔ ''ماں باپ کی خوشی عزیز نہیں ہے اسے، اسے تو صرف بازغہ کی خوشی عزیز ہے۔ اور کسی کی خوشی سے کوئی سروکار نہیں۔'' بیگم قدوس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ناانصافی ہے۔'' مریم بولی۔

''کیا کریں بیٹا! ہمارے ساتھ تو دونوں ہی ناانصافی کر رہے ہیں۔ وہ طلاق نہیں دے رہا مگر یہ تو زبردستی لے سکتی ہے نا۔'' انہوں نے کہا۔

اس کے بغیر جینے کا حوصلہ رکھتی تو کب کی لے لیتی۔ بازغہ نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

مریم نے بازغہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ کئی سوال تھے اس کی آنکھیں میں۔ وہ بازغہ کی آنکھوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی رہی کہ بیگم قدوس بولیں:

''اسے ہمارے حال پر بالکل رحم نہیں آتا۔ کاش! اللہ اسے سمجھ دے دے۔''

بازغہ نے کوئی جواب نہ دیا، بس چپ چاپ اپنی نظریں جھکا لیں۔

اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کون کلہاڑی مار سکتا ہے۔ اپنا گلا کون خود گھونٹ سکتا ہے۔''

مریم نے بازغہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''گلے تو ہمارے ارمانوں، ہماری خوشیوں، ہماری آرزوؤں کے گھونٹے جا رہے ہیں۔ بہت خود غرض ہے یہ۔'' بیگم قدوس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر کے لیے بڑی بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد نومی اور مومی آ گئے۔

''کھیل ختم ہو گیا کیا؟'' مریم نے پوچھا۔

''ہاں۔'' نومی۔۔۔ انداز میں صوفے پر بیٹھتے ہو بولا۔

''کیوں تھک گئے اس لیے؟'' مریم نے پوچھا۔

''ہاں!'' رومی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ادھر میرے پاس آؤ!'' بیگم قدوس نے انہیں بلایا۔

''کیا ہے نانی اماں؟'' وہ دونوں قریب آتے ہوئے بولے۔

''جب بھی آتے ہو، بس کھیلتے ہی رہتے ہو۔ کبھی مجھ سے بھی باتیں کرلیا کرو۔ بہت اچھی اچھی کہانیاں آتی ہیں مجھے۔'' وہ دونوں کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے بولیں۔

''سچ نانی اماں!'' رونی کھل اٹھا۔

''مجھے بچوں کی بہت ساری کہانیاں یاد ہیں، سوچا کرتی تھی کہ رات کو بستر میں لیٹ کر اپنے پوتے پوتیوں کو سنایا کروں گی۔ بہت خواب دیکھتی تھی میں۔ پر اب تو سب خواب، ساری آرزوئیں حسرتوں میں بدلتی جارہی ہیں۔'' بیگم قدوس نے مریم سے مخاطب ہوکر کہا۔

''نانی اماں! سنایئے نا کہانیاں!'' نومی بولا۔

''کہانیاں سننے کا لطف تو رات کو لحاف میں لیٹ کر آتا ہے۔ اس وقت مزا تھوڑی آئے گا۔'' وہ بولیں۔

تو پھر؟'' رونی پریشان سا ہوگیا۔

''تم یہیں رہ جاؤ۔ میں بہت مزے کی کہانیاں سناؤں گی۔'' انہوں نے رونی کے گال کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں تو رہ جاؤں گا۔'' نومی راضی ہوگیا۔

''اور تم؟'' بیگم قدوس نے رونی سے پوچھا۔

''کہانیاں تو مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔'' رونی نے کہا۔

''پھر؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میرے امتحان قریب ہیں نا، ابو رات کو پڑھاتے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''تو ایک دو دن میں کیا ہرج ہوجائے گا۔'' وہ بولیں۔

''یہ دونوں ہی کہانیاں سننے کے بہت شوقین ہیں مگر انہیں کہانی کون سنائے۔ یوں بھی ٹی وی پر بس کارٹون ہی دیکھتے رہتے ہیں۔'' مریم نے بتایا۔

''تو پھر چھوڑ دو نا، دو چار دن کو یہاں رونق ہوجائے گی۔'' ان کے لہجے میں التجا تھی۔

''ٹھیک ہے پھوپھی جان! جیسے آپ کی مرضی۔'' مریم کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔

بچوں کے ساتھ ساتھ بیگم قدوس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

''نانی اماں آپ کو پریوں کی کہانیاں آتی ہیں یا مسافروں کی؟'' نومی نے پوچھا۔

''بیٹا مجھے پریوں، جنوں، مسافروں، شہزادوں، سب کی ڈھیر ساری کہانیاں یاد ہیں۔'' بیگم قدوس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ساری سنائیں گی نا؟'' نومی نے کہا۔

''ہاں بھئی ساری سناؤں گی۔'' انہوں نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔'' نومی نے رونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' رونی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

بچوں کے درمیان گھری وہ بہت مسرور نظر آرہی تھیں۔ بچوں کے لیے ان کی محبت کا عملی مظاہرہ دیکھ کر بازغہ کے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی۔

''پھوپھی جان تو بچوں میں مصروف ہوگئیں۔'' مریم اس سے مخاطب ہوگئی۔

''ہاں!'' بازغہ دل سے مسکرادی۔

بیگم قدوس کے چہرے پر بہت خوبصورت رنگ نظر آرہے تھے۔ بچوں کے ساتھ وہ مگن ہوتے ہوئے بہت مسرور نظر آرہی تھیں۔

کاش میں اس گھر کو خوشیاں دینے کے قابل ہوتی۔'' بازغہ نے دکھ سے سوچا اور اوپر بالکونی میں آکر بچوں کو لان میں کھیلتا ہوا دیکھنے لگی۔

''ممانی جان! آپ بھی ہمارے ساتھ کھیلئے نا۔'' رونی اسے کھڑا دیکھ کر کھڑکی کے نیچے آکر بولا۔

''مجھے کھیلنا نہیں آتا۔'' وہ بولی۔

''یہ کوئی مشکل تھوڑی ہے، خود بخود آجائے گا۔'' وہ بولا۔

''نہیں بیٹا، تم جاکر کھیلو، وہ دونوں تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

وہ واپس چلا گیا تو بازغہ بھی وہاں سے ہٹ گئی۔ ایک بار پھر عجیب سی بے کلی طاری ہوگئی تھی اس کے سارے وجود میں۔ وہ دوبارہ کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔

ابھی وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ شیراز آگیا۔ ریکٹ اور شٹل کاک وہیں پھینک کر وہ دونوں اس کی طرف لپکے۔ شیراز کا چہرہ کھل اٹھا۔ باری باری اس نے دونوں کو اٹھا کر پیار کیا۔ یہ سب ہونے کے خواب تو بازغہ نے بھی دیکھے تھے۔ ایسا ہی ہنستا مسکراتا، آباد گھرانا۔ کچھ ایسا ہی تھا اس کے خوابوں کی دنیا میں۔ لیکن ہر خواب کی تعبیر کہاں ملتی ہے، ہر آرزو پوری نہیں ہوتی۔ بعض آرزوؤں کا دھواں آنکھوں میں بھر کر

ساری زندگی عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بازغہ سوچ چلی جا رہی تھی۔ شیراز بھی وہیں رک گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ باتیں کیے جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ان کی معصوم غلطیوں پر اونچے اونچے قہقہے لگا کر انہیں چڑا رہا تھا۔ بازغہ چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ تب ہی شیراز کی نظر اس پر پڑی تو اس نے وہیں سے ہاتھ ہلایا۔ بازغہ نے بھی ہاتھ ہلایا۔ کھڑے کھڑے تھکن سی ہونے لگی تو وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

کچھ دیر بعد شیراز اوپر آ گیا۔

''معاف کرنا آج تمہارے درشن کرنے میں کچھ دیر ہو گئی۔''

''اور آتے ہی بچوں میں گھر گیا۔'' بازغہ نے دھیمی مسکراہٹ سے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''ہاں نہ جانے کیوں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ بہت معصوم معصوم حرکتیں کرتے ہیں وہ۔'' شیراز نے بے اختیاری میں کہا۔ لیکن پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بولا:

''بچے کوئی بھی ہوں، کسی کے بھی ہوں، بچے ہی ہوتے ہیں، سب بچے ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''بچے فرشتوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں، بھولے بھالے، پھولوں کی طرح پیارے۔'' بازغہ نے جواب دیا تو وہ بازغہ کے چہرے کی طرف چپ چاپ دیکھنے لگا۔

ویسے یہ دونوں بالکل بھولے نہیں ہیں۔ ذرا ذرا سی غلطی فوراً پکڑ لیتے ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' وہ دھیرے سے ہنس دی۔

''کبھی تم نے ان کے ساتھ کھیل کر دیکھا ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''نہیں!'' بازغہ نے کہا۔

''کھیل کر دیکھو! بہت ماہر فن ہیں۔'' شیراز نے مشورہ دیا۔

''کھیل لیں گے۔'' بازغہ ہنسنے لگی۔ ''میں ان کا کھیل دیکھ رہی تھی اور تمہیں بھی۔''

''ہاں! میں نے دیکھ لیا تھا تمہیں۔ شریر بھی بہت ہیں، ذرا سی دیر میں سارے گھر میں رونقیں کر دیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں!'' بازغہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''باہر ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج گھر میں رونق ہو رہی ہے۔'' شیراز نے بات کرتے ہوئے بازغہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ عجیب سی کیفیت طاری نظر آ رہی تھی اس پر۔

رات کے کھانے کے بعد جب وہ کمرے میں آئے تو شیراز ایک رسالہ ہاتھ میں پکڑ کر ورق گردانی کرنے لگا۔ بازغہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا:

''آج مریم آئی تھی۔''

''پھر؟'' وہ رسالے پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

''اس کا بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں دوسری شادی کر لینی چاہیے۔'' وہ بولی۔

شیراز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم آخر لوگوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔'' بازغہ نے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، میں اپنی زندگی دوسروں کے خیالوں کے مطابق گزاروں گا۔''

بازغہ چپ رہی۔

''میری زندگی ہے، میں جس طرح چاہوں گزاروں، یہ دوسرے کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں۔''

''تمہارے بھلے کے لیے کہتے ہیں۔''

''اور تم جانتی ہو کہ اس میں میرا کوئی بھلا نہیں۔''

''خدا پر بھروسہ رکھو!''

''تو پھر یہ بھروسہ تمہارے ہوتے ہوئے ہی کیوں نہ رکھا جائے۔''

''میرے ہوتے ہوئے ممکن نہیں رہا اب۔'' بازغہ نے خاص انداز میں کہا۔

''میں سمجھ نہیں سکا، کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''میں ماں نہیں بن سکتی!'' بازغہ نے جیسے کمرے میں دھماکہ کر دیا۔

''کیا۔۔۔کیا!'' اس کے دماغ کو جیسے کسی نے کرنٹ لگا دیا ہو۔

''ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

''کیوں مذاق کر رہی ہوں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ جبکہ میں۔۔۔۔'' وہ سکتے میں آ گیا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ میں دو روز پہلے اسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنا چیک اپ کروایا تھا۔ اس کے بعد اسے تمہارے بارے میں بتایا تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ انہوں نے اس خیال سے میرا دوبارہ چیک اپ کیا تو مجھے ایک خاص بات بتائی۔'' بازغہ بولتے بولتے رک گئی۔

''وہ کیا؟'' شیراز نے جلدی سے پوچھا۔
''بس یوں سمجھ لو کہ میرے اور تمہارے ستارے نہیں مل رہے۔''
''کیا مطلب؟''
''میرے لیے مشکل ہے یہ سمجھانا۔'' بازغہ کے لہجے میں ایک درد سا تھا۔
''تو کیا تم بھی؟'' شیراز کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''ہاں! بس یونہی سمجھ لو۔'' بازغہ نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
''تو پھر۔۔۔ پھر تو ساری مشکل ہی حل ہوگئی۔۔۔''
''اب میں تم سے کیا ہوا وعدہ توڑ سکتا ہوں۔ہم دونوں جب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں تو کیوں نہ ڈیڈی کو اپنے بارے میں مکمل کر بتادوں۔''
''نہیں شیراز! ایسی حماقت نہ کرنا۔ہم ایک کشتی کے سوار تو ہیں مگر ایک منزل کے مسافر نہیں۔ہمارے راستے جدا جدا ہونے والے ہیں۔''
''میں نہیں سمجھ سکا، تم کیا فضول باتیں کر رہی ہوں۔''
''فضول نہیں! بہت اہم باتیں بتا رہی ہوں تمہیں۔'' بازغہ نے کہا۔''تمہیں ایک بار اپنا چیک اپ یہاں کے سب سے بڑے سپیشلسٹ سے دوبارہ کروانا چاہیے۔ مجھے لیڈی ڈاکٹر نے بھی مشورہ دیا تھا۔''
''میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔''
''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔
''اس لیے کہ تمہاری حالت مجھ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔میں ٹھیک بھی ہو گیا تو کیا فرق پڑے گا۔'' شیراز نے واضح کیا۔
''پڑے گا۔تمہاری دوسری شادی ہوسکتی ہے اور میں اس کے لیے تمہیں اجازت دیتی ہوں۔''
''کیا تمہاری خوشی اسی میں ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔
''ہاں! میں اس گھر میں خوشیوں کی بہار دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ اب میری سب سے بڑی یہی خواہش ہے۔''
''ایسا تو ہرگز نہیں ہوگا۔لیکن میں تمہارے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے تیار ہوں۔''
''تو پھر صبح ہم ضرور چلیں گے۔'' بازغہ نے اس بات کو غنیمت جانا۔
اور صبح جب وہ دونوں تیار ہو کر باہر نکلے تو بیگم قدوس نے شیراز سے پوچھا۔
''بازغہ تمہارے ساتھ جا رہی ہے، دفتر نہیں جا رہے کیا؟''
''نہیں ممی!''
کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟'' ان کے لہجے میں تعجب اور درشتی تھی۔
''ممی! ایک بار پھر قسمت آزمائی کرنے جا رہے ہیں۔بس آپ دعا کریں۔'' شیراز نے جھک کر دعا کے لیے درخواست کی۔
''کہاں؟'' بیگم قدوس کے چہرے پر ابھی تک حیرت تھی۔
''یورولوجسٹ کے پاس؟''
''کیا مطلب؟'' بیگم قدوس کی حیرانی بڑھنے لگی۔
شیراز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''بازغہ کو لیڈی ڈاکٹر نے کچھ امید دلائی تھی۔اسی نے دوبارہ ملنے کو کہا ہے۔
''ہیں۔۔۔یں۔۔۔ں'' بیگم قدوس کی آنکھوں میں حیرت آمیز امید جاگ اٹھی۔
''جی ممی!۔۔۔بس آپ دعا کریں۔''
''اچھا بیٹا! میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔'' بیگم قدوس خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔
بازغہ کے چہرے پر پورا اطمینان دیکھ کر انہیں مزید خوشی ہو رہی تھی۔
شیراز نے گاڑی پورچ سے باہر نکالی اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ دونوں شہر کے سب سے بڑے پرائیویٹ ہسپتال کے یورولوجسٹ کے پاس تھے۔
ایک طویل پراسس کے بعد شیراز کو فارغ کر دیا گیا۔بازغہ ویٹنگ روم میں تھی کہ شیراز وہاں آ گیا۔
''ایک گھنٹے میں رپورٹ متوقع ہے۔کیوں نہ ہم اتنے وقت کے لیے کیفے میں چل کر بیٹھیں۔''
بازغہ اس کی بات سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔باہر آ کر انہوں نے پارکنگ سے گاڑی نکالنا چاہی کہ ایک گاڑی ان کی گاڑی کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔شیراز نے اسٹیئرنگ پر بیٹھے شخص کو سرسری سا دیکھا اور گاڑی آگے بڑھانا چاہی لیکن پھر وہ رک گیا۔اس نے چونک کر دوبارہ اس کی جانب دیکھا۔اسے وہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔اتنے میں وہ شخص گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

''ہیلو شیراز!'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر شیراز سے چمٹ گیا۔

تب شیراز نے بھی اسے پوری طرح پہچان لیا۔ وہ اس کا کلاس فیلو نعیم تھا۔

''کہاں رہے یار اتنا عرصہ؟ کیا شادی ہوگئی۔۔۔ کتنے بچے ہیں۔۔۔؟'' اس نے کھڑے کھڑے پے در پے کئی سوال کر ڈالے۔

''بھئی دم تو لو۔'' شیراز اس کے اتنے سوالوں سے بوکھلا گیا۔

''آؤ میں تمہیں اپنی بیگم سے ملاتا ہوں۔''

''اچھا۔۔۔ کہاں ہے؟'' ''اسی ہسپتال کے گائنا کالوجی میں۔''

''کیا مطلب؟'' شیراز نے تعجب سے پوچھا۔

''بھئی واہ!'' وہ ہنس دیا۔ ''سمجھتے کیوں نہیں۔ مابدولت باپ بننے والے ہیں۔''

''اوہ۔۔۔!'' شیراز بھی ہنس دیا۔

اچانک شیراز کو بازغہ کا خیال آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ شیراز نے نعیم سے اس کا تعارف کروایا۔ نعیم نے آگے بڑھ کر کہا ''یہ تو اور بھی اچھا ہے، بھابھی سے بھی بیگم کی ملاقات ہو جائے گی۔ اور ایسے موقع پر ان سے بہتر رہنما اس کے لیے کون ہوسکتا ہے۔'' نعیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بھابھی آپ بھی آجائیں۔'' نعیم نے بڑے احترام سے کہا۔

بازغہ نے شیراز کی طرف دیکھا تو شیراز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر میں وہ دونوں نعیم کے ساتھ اس کی بیگم فریحہ کے پاس گائناکالوجی میں تھے۔

نعیم نے دونوں کا تعارف کروایا۔ پھر بازغہ سے پوچھا: ''بھابھی بچے کہاں ہیں؟''

''بچے!'' بازغہ نے شیراز کی جانب دیکھا تو شیراز نے کہا۔

''بھئی ہمیں تمہاری طرح بچوں کی ابھی جلدی نہیں ہے۔''

''جلدی!'' نعیم متعجب ہوا۔ ''شادی کب ہوئی؟''

''چار سال ہوگئے۔'' شیراز نے جواب دیا۔

''بھئی واہ!'' نعیم نے قہقہہ لگایا۔ ''ایک جیسا ہی حال ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شیراز نے پوچھا۔

''بھئی شادی کے چار سال بعد ہمارے ہاں پہلے بچے کی آمد متوقع ہے۔'' نعیم نے خوش دلی سے بتایا۔

''لیکن۔۔۔'' نعیم بولتے بولتے رک گیا۔ اس نے غور سے بازغہ کی طرف دیکھا اور پھر شیراز کی طرف۔ شیراز نے اس کی آنکھوں میں چھپا سوال پڑھ لیا تھا۔

''ہاں بھئی! ہم اس معاملے میں ذرا تم سے بھی زیادہ ایڈوانس ہیں۔'' شیراز نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اچھا! لیکن میرے ساتھ تو کچھ اور معاملہ تھا۔'' نعیم کو یہ کہتے ہوئے اچانک خیال آیا کہ وہ ابھی تک کھڑے ہیں۔ وہ ہسپتال کے ایک پرائیویٹ روم میں تھے۔ اس نے انہیں سامنے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود فریحہ کے بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا معاملہ تھا؟'' شیراز کے ذہن میں تجسس تھا۔

''بھئی ہمیں ڈاکٹروں اور ان کی رپورٹوں نے تقریباً مایوس کر دیا تھا۔ پھر اللہ کے فضل و کرم سے فریحہ نے اپنی دادی جان یعنی میں گرینڈ مدر ان لاء سے کچھ دعائیں یاد کرلیں۔ ایک وظیفہ ہے، روزانہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ کے فضل سے اب ہم پرامید ہیں۔''

''پرامید ہم۔۔۔ یعنی تم دونوں یا صرف بھابھی!'' شیراز کو اس کی بات سن کر مذاق سوجھ گیا۔

بازغہ اور فریحہ اس کی بات سن کر بے اختیار ہنس دیئے۔

نعیم کھسیانا سا ہو گیا لیکن ڈھٹائی سے بولا: ''بھئی ایک ہی بات ہے۔''

کچھ دیر یوں ہی باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ بازغہ فریحہ سے کچھ پوچھنے لگی۔ فریحہ آہستہ آواز میں اسے کچھ بتانے لگی۔ شیراز نے محسوس کیا کہ نعیم کو باہر لے جائے۔ اس صورت حال سے وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ نعیم نے جیسے اس کے چہرے کا حال پڑھ لیا۔

''آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔ ان دونوں کو بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

وہ دونوں اٹھ کر باہر ہسپتال کے کوریڈور میں آگئے۔

''ہاں شیراز! تمہارا کوئی مسئلہ لگتا ہے، ہمارے ہی جیسا ہے شاید؟'' نعیم نے بات شروع کی۔

شیراز پہلے تو اس کی بات سن کر خاموش رہا۔ پھر اس نے بہت مختصر طور پر نعیم کو سب کچھ بتا دیا۔

''اوہ! تمہاری کہانی مجھ سے تھوڑی سی مختلف ضرور ہے لیکن مسئلہ ایک ہی ہے۔ بھابھی کو کہو کہ وہی وظیفہ کریں جو فریحہ نے کیا تھا۔ مجھے پوری امید ہے کہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' نعیم نے اسے تسلی دی۔

شیراز نے اس کی بات سنی اور امید کی ایک کرن اس کے سینے میں جاگ اٹھی۔ اس نے گھڑی کی جانب نظر دوڑائی تو تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اس نے نعیم سے اجازت چاہی۔ نعیم اس کے ساتھ اندر کمرے میں آ گیا۔ بازغہ اور فریحہ خوش دلی کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔

شیراز نے کہا ''اچھا بھابھی ہم اجازت چاہیں گے۔''

فریحہ نے بازغہ کو دوبارہ آنے کے لیے کہا تو بازغہ نے حامی بھر لی۔ اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے نکل کر سیدھے یورولوجسٹ کے پاس پہنچے۔ حسب توقع رپورٹ وقت پر مل گئی۔ رپورٹ تفصیلی تھی۔ شیراز کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ رپورٹ لے کر اندر یورولوجسٹ کے پاس چلا گیا۔ وہاں کمرے میں ان کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے شیراز کے ہاتھ سے رپورٹ لیتے ہوئے اسے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

شیراز چپکے سے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے لیے بیٹھ گیا تو انہوں نے کہا:

''میں آپ کی رپورٹ سے مایوس نہیں ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ۔۔۔'' پھر انہوں نے شیراز کو سمجھانا شروع کیا۔ اور شیراز بڑی توجہ سے ان کی بات سنتا رہا۔

''ڈاکٹر صاحب میں نے اپنا چیک اپ انگلینڈ میں بھی کروایا تھا۔ لیکن وہاں تو۔۔'' شیراز بولتے بولتے رک گیا۔

''ہاں! یہ مسئلہ کسی وقت ہو سکتا ہے۔ محض اتفاق کی بات ہے، لیکن آپ کے ساتھ بہر حال ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور اگر یہ ہو بھی تو بہت کم وقت کے لیے۔''

''جی میں سمجھا نہیں۔۔۔ وہاں تو بڑے بڑے ماہرین موجود ہیں۔''

''بھئی وہ بھی تو انسان ہیں آخر۔ غلطی ان سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم کیوں یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ان کی ماہرانہ رائے حتمی ہو سکتی ہے۔ خدا کی طرف سے کچھ بھی ظہور میں آ سکتا ہے۔''

''تو ڈاکٹر صاحب! کیا میرا معاملہ کلیئر ہے؟'' شیراز نے وثوق کے ساتھ معلوم کرنا چاہا۔

''بالکل صدفی صد!۔۔۔ ہاں ایک خاص بات ہے۔۔۔''

''جی وہ کیا؟''

''اس معاملے میں ذہنی اطمینان کی بہت ضرورت ہے۔''

شیراز مطمئن ہو کر باہر آ گیا۔ اور جب اس نے بازغہ کو رپورٹ کے مثبت ہونے کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔

کچھ دیر میں وہ ہسپتال سے باہر تھے۔ راستے میں شیراز نے کہا ''کیوں نہ سارے کام آج ہی مکمل ہو جائیں۔''

بازغہ خاموش رہی۔ شیراز نے گاڑی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک کی طرف موڑ دی۔

کلینک پہنچ کر بازغہ لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں چلی گئی اور شیراز باہر ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ چپراسی نے شیراز کو اندر آنے کے لیے کہا۔

شیراز اندر داخل ہوا تو لیڈی ڈاکٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر تفصیل کے ساتھ اسے سمجھانا شروع کر دیا۔

ان کی بات سن کر شیراز کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچے۔ امید اور ناامیدی، ایک سی بات لگتی تھی۔ شاید لیڈی ڈاکٹر کلیئر کٹ کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

اس نے بازغہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی افسردہ سی بیٹھی تھی لیکن اس کی حالت سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اسے یہ سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔

''مسٹر شیراز!'' لیڈی ڈاکٹر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا:

''میں آپ سے۔۔۔ صرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی کیا مطلب؟''

''کچھ خاص باتیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے آپ کی بیگم کا یہاں رکنا ضروری نہیں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے بازغہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کی بات سن کر بازغہ مزید پریشان ہو گئی لیکن شیراز نے اسے تسلی دی تو وہ چپکے سے باہر آ گئی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اپنا پہلو بدلا اور شیراز سے مخاطب ہوئیں:

''شیراز صاحب! میں حیران ہوں کہ ایک جیتا جاگتا وجود کس طرح مرجھا گیا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آپ کی بیگم کا چیک اپ کیا تھا تو یہ بالکل ٹھیک تھیں۔ لیکن اب مایوسی ہی مایوسی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہوا۔ تاہم ایک وجہ ہو سکتی ہے۔''

''جی وہ کیا؟'' شیراز نے پوچھا۔

''میرے خیال میں دماغی۔۔۔ دماغ کی حالت ڈسٹرب ہے!''

''جی۔۔۔!'' شیراز کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''میں اپنی حد تک ایک خدشے کا اظہار کر رہی ہوں۔ آپ کی بیگم کے دماغ میں کوئی مسئلہ ہے۔ تاہم میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے آپ کو کسی دماغی ماہر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ میرا مطلب سائیکاٹرسٹ نہیں بلکہ نیورولوجسٹ ہے۔''

یہ بات سن کر شیراز کی اپنی ذہنی حالت ڈگمگانے لگی تھی۔اس نے بازغہ میں کبھی دماغی خرابی محسوس نہیں کی تھی اس لیے ڈاکٹر کی بات پر اس کا یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔تاہم وہ اس کے مشورے سے انکار بھی نہیں کر سکا۔

وہ لیڈی ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر آنے لگا تو لیڈی ڈاکٹر کی آواز ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونجی۔

''شیراز صاحب! ذرا سنیے!''

شیراز کے قدم وہیں رک گئے اور اس نے پلٹ کر دیکھا''جی ڈاکٹر صاحبہ!''

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی بیگم میں بانجھ پن کا مرض نہیں ہے۔بس وقتی طور پر کچھ خلل واقع ہوا ہے،لیکن میں نے ان کی دماغی صحت کے بارے میں ان سے کچھ نہیں کہا۔یوں بھی میں پورے وثوق سے یہ بات نہیں کہہ سکتی۔آپ کی اپنی رپورٹ اور اس کے تفصیلی معائنے کے بعد میں نے یہ اندازہ کیا ہے۔لیکن اسے اس مرض کے بارے میں بتانا خطرے سے خالی نہیں۔''

''جی، بہت بہت شکریہ!'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر آ گیا۔

بازغہ اس کی منتظر تھی۔اس نے شیراز کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں نمی سی اتری ہوئی تھی۔بازغہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''کیا بتایا لیڈی ڈاکٹر نے؟''

''وہی جو تم سن چکی ہو، لیکن ایک امید افزا بات بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' بازغہ نے تیزی سے پوچھا۔

''تمہارا مرض وقتی طور پر ہے، باقاعدہ نہیں۔''

''لیکن یہ بات وہ میرے سامنے بھی کہہ سکتی تھیں۔'' بازغہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''وہ کچھ اور بات تھی۔''

''کیا؟''

''پھر بتاؤں گا۔''

''نہیں ابھی بتاؤ!''

''انہوں نے کہا تھا کہ اگر اپنی بیگم سے مایوس ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔''

بازغہ نے برا سا منہ بنایا۔''شیراز! اصل بات بتاؤ۔۔۔وہ عمر میں تم سے دوگنی ہیں۔''

''اصل بات۔۔۔اصل بات یہ ہے کہ بیگم سے تمیز کے ساتھ پیش آیا کرو۔''

''شیراز! اس وقت بھی تمہیں شرارتیں سوجھ رہی ہیں اور میری جان پر بنی ہوئی ہے۔۔۔وہ شپٹا سی گئی۔۔۔بس تم مجھے اصل بات بتاؤ!''

''بھئی اصل بات بتا تو دی ہے۔'' اسے کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔

''میں نہیں مانتی۔''

''مان جاؤ گی! مجھے منانا آتا ہے۔'' شیراز نے بے نیازی سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے! مجھے یہیں اتار دو۔'' بازغہ نے ناراضی کا اظہار کیا۔

''کیا جدا ہونے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں۔۔۔ میں ٹیکسی لے کر ڈاکٹر کے پاس خود پوچھنے چلی جاتی ہوں۔''

''اوہو! تم سنجیدہ ہو گئیں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''تو اصل بات سنو!'' شیراز نے کمال مہربانی سے کہا۔

''جلدی بتاؤ!'' ''ہم اگلے سال اپنے بچے کے ساتھ وادیٔ سوات جائیں گے۔''

''کیا واقعی۔۔۔! تم سچ کہہ رہے ہو'' خوشی کے ساتھ بازغہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

''ہاں! بالکل سچ!!''

''لیکن تمہاری آنکھوں میں نمی کیسی تھی اس وقت؟'' بازغہ کو شک سا ہونے لگا۔

''خوشی برداشت نہیں کر سکا تھا۔'' شیراز نے مختصر جواب دیا۔

☆☆☆

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیگم قدوس سے ان کا سامنا ہوا۔ وہ شدت سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

ان دونوں نے ادب سے سلام کیا۔ بیگم قدوس نے ان کے چہروں کی طرف دیکھا تو وہ خوشی سے کھل رہے تھے۔ البتہ شیراز کے چہرے پر کچھ تھکن کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا بنا؟'' بیگم قدوس نے بے چینی سے پوچھا۔

شیراز ایک دم کھلکھلا اٹھا۔ ''امی آپ کی دعائیں ہمارے کام آ گئیں۔''

''خدایا تیرا شکر ہے۔'' بیگم قدوس کے چہرے پر بے پناہ رونق آ گئی۔ وہ جلدی سے اندر جانے لگیں۔ پھر ایک دم پلٹیں اور سعیدہ کو آواز دی۔

''جی بیگم صاحبہ!''

''جلدی سے باغ سے جتنے پھول مل سکتے ہیں توڑ کر لے آؤ۔ میں آج سارے کے سارے پھول اپنی بہو اور بیٹے کے راستے میں بچھانا چاہتی ہوں۔''

سعیدہ نے بیگم صاحبہ کا حکم سنا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بیگم صاحبہ نے کیا حکم دیا ہے۔ وہ جلدی سے قدوس صاحب کے کمرے میں چلی گئی اور انہیں جا کر یہ خوش خبری سنائی اور پھر وہاں سے تیزی سے چلتی ہوئی پیچھے باغ میں چلی گئی۔ اس کے وجود میں نہ جانے ایک دم کہاں سے تیزی آ گئی تھی۔ وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔

بازغہ، شیراز، بیگم قدوس اور قدوس صاحب اس کی خوشی دیکھ کر خود بھی پھولے نہیں سما رہے تھے۔

قدوس صاحب نے فوراً بازغہ کو سینے سے لگا لیا۔ اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''یا اللہ! اس گھر پر اپنی رحمتیں نازل کر دے۔''

بیگم قدوس کا جی چاہا کہ وہ بازغہ بڑھ کر چوم لے۔ پھر ایک دم ان کے ذہن میں اپنا پچھلا رویہ یاد آ گیا۔ لیکن پھر انہوں نے خوشی سے بازغہ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا:

''بیٹی! مجھے معاف کر دینا۔ اللہ تو بڑا کریم ہے، میں ہی بے صبری ہو گئی تھی۔''

''جی آپ مجھے کیوں گناہ گار کرتی ہیں۔ بھلا آپ نے کیا کیا، اور اگر کچھ ہوا بھی تو اس میں آپ کا کیا قصور، یہ تو آپ کا حق تھا۔''

بیگم قدوس نے اس کی بات سنی تو ان کی آنکھوں میں خوشی سے موتی چمکنے لگے۔ بیٹی اللہ ہمیں معاف کرے۔ ہم نے بہت غلط راستے کا انتخاب کرنا چاہا تھا۔ تم بھی ہمیں دل سے معاف کر دو۔''

''نہیں نہیں ممی! مجھے کوئی ملال نہیں ہے، پھر آپ ایسا نہ کہیں، آپ تو میری ماں کے درجے پر ہیں۔''

اسی لمحے سعیدہ ایک بڑی سی ٹوکری میں رنگ برنگ پھول بھر لائی۔ بیگم قدوس نے جلدی سے ٹوکری میں دونوں ہاتھ ڈال کر پھولوں سے بھر لیے اور پھر انہیں بیٹے اور بہو کے آگے بچھانا شروع کر دیا۔ بازغہ نے روکنا چاہا مگر شیراز نے چپکے سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے آہستہ سے کہا: ''ممی کی خوشی ہے، انہیں جو کرتی ہیں کرنے دو۔ یہ لمحے تو کبھی کبھی آتے ہیں۔''

پھر باقی پھول سعیدہ اوپر جانے والے راستے سے ان کے کمرے تک بچھاتی چلی گئی۔ جب واپس آ رہی تھی تو اس احتیاط سے کہ کوئی پھول اس کے پیروں تلے مسلا نہ جائے۔

بازغہ اس بوڑھی عورت کی محبت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ان غریب لوگوں کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے۔ سوچ کر رشک سا آنے لگا اسے۔

پھر ان دونوں کو بیگم قدوس نے اس راستے سے اوپر جانے کو کہا۔ بازغہ شرمائی شرمائی سی شیراز کے ساتھ اوپر آ گئی۔

ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ اپنی جنت گم گشتہ میں آ گئے ہوں۔ وہ کچھ دیر یونہی مسحور سے کھڑے رہے۔ پھر شیراز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا۔

''بازغہ!'' شیراز نے انتہائی محبت کے ساتھ بازغہ کو پکارا۔

''ہاں!'' اس کی سانسیں یوں چل رہی تھیں جیسے وہ آج ہی ایک دوسرے سے ملے ہوں اور وہ خوشیوں کے بے پناہ رنگا رنگ اجتماع میں سمٹ گئی ہو۔

''یہ لمحے کتنی مدت بعد آئے ہیں۔'' شیراز نے کہا۔

''بڑی جلدی!'' بازغہ نے پُرسرور آواز میں جواب دیا۔

’’ہاں! ایسے ہی لگتا ہے کہ ایک بھیانک خواب تھا جو ہم نے کل رات دیکھا اور آج اس کی تعبیر الٹ گئی ہو۔‘‘ شیراز نے سرشاری کے عالم میں کہا۔

’’ہماری محبت سچی ہے نا! اسی لیے۔‘‘ بازغہ نے جواب دیا۔

’’ہاں! اسے کبھی نظر نہ لگے۔‘‘ کہتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک سایہ سا لہرایا۔ شاید اسے لیڈی ڈاکٹر کی بات یاد آ گئی تھی۔

شیراز نے شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔

☆☆☆

☆☆☆

سنگِ مرمر کی بنچ پر ستاروں کی مانند ٹکے ہوئے سفید سفید پھولوں سے لدے چھوٹے چھوٹے پودے بے حد خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ کائنات کو رنگین اور حسین بنانے میں ان پھولوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ یہ پھول، یہ پیڑ پودے سرسبز و شاداب رہ کر ہی کائنات کو اصلی حسن بخشتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو دنیا اتنی حسین معلوم نہ ہو۔ جو حصہ دنیا کی رونقیں بڑھانے میں پھولوں کا ہے وہی حصہ گھر کی رونقیں بڑھانے میں بچوں کا ہے۔ بچوں کے بنا گھر کتنے سونے سونے، کتنے بے رونق سے لگتے ہیں۔ لیکن اس کائنات کو اور کائنات میں انسانوں کے بنائے ہوئے گھروں کو رونقیں بخشنے والی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ انسان بیچارہ تو پھول کھلانے پر بھی قادر نہیں۔ وہ تو ٹنڈ منڈ درختوں پر ایک بھی پھول نہیں کھلا سکتا۔ بنجر زمینوں سے فصلیں نہیں اگا سکتا۔

لیکن خدا چاہے تو اس کی قدرت سے سب کچھ ظہور میں آ جاتا ہے۔ سب کچھ اسی کی مہربانیوں سے ہوتا ہے اور اللہ نے جب اس کے وجود کو بنجر بنایا ہی نہیں تھا تو کسی کونپل کے پھوٹنے کی کوئی امید کیوں نہ کی جاتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں ہوتی ہیں بندوں کے لیے جو بندوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کی حقیر سی ذات پر کتنی آزمائشیں اتار دی گئی تھیں۔ پھولوں پر ٹکٹکی باندھے وہ سوچتی رہی۔ رات کتنی بیت گئی، اسے پتہ ہی نہ چلا۔ وہ تو بس ماضی کی دردناک یادوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک شیراز کی آواز سے چونک پڑی۔

’’آج کی رات یونہی بتانے کا ارادہ ہے کیا؟‘‘ اس کے لہجے میں ذرا سی برہمی تھی۔

’’ہوں!‘‘ بازغہ چونک پڑی تھی۔

’’کتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور تم کسی گرم کپڑے کے بغیر بیٹھی ہو۔‘‘ وہ بولا۔

بازغہ چپ رہی۔ تب ہی شیراز نے قریب آ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ ’’ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں تمہارے ہاتھ، تمہیں احساس نہیں ہے موسم کا۔‘‘ اس کی آواز میں ترشح تھا۔

’’بس کچھ احساس ہی نہیں ہوا سردی کا۔‘‘ وہ بولی۔

’’بس گہری سوچ میں ڈوب کر تمہارے سارے احساس ختم ہو گئے تھے۔‘‘ شیراز بولا۔ ’’میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو گی۔‘‘

’’کیا؟‘‘ بازغہ نے سرسری انداز میں پوچھا۔

’’بچے کے بارے میں؟‘‘ شیراز نے مسکرا کر کہا۔

’’جانتے ہو تو پھر پوچھ کیوں رہے ہو۔‘‘ بازغہ بھی مسکرائی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بیڈروم میں آ گئے تھے۔ بیگم قدوس کی خواب گاہ کی کھڑکی ابھی تک کھلی تھی۔ اونچے تکیے پر سر رکھے وہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔ شاید سو گئی تھیں۔ دونوں بچے موی اور نومی ابھی تک ان کے دائیں بائیں لحاف میں لپٹے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ بازغہ کے قدم وہیں رک گئے۔

’’چلو نا بھئی۔‘‘ شیراز اس کا شانہ ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’کیا ممی کو جگانے کا ارادہ رکھتی ہو۔‘‘

’’دیکھو شیراز! ایسے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ممی کے چہرے پر کتنا سکون ہے۔‘‘ بازغہ نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ہاں ہے تو۔‘‘ شیراز بھی کچھ کھو سا گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

’’تم یہ سب کر دو نا۔ ممی کے چہرے کو دائمی آسودگی بخش دو۔‘‘ بازغہ کی آواز میں التجا تھی۔

’’پھر وہی بات شروع کر دی تم نے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔‘‘ شیراز اس کو وہاں سے کھینچتا ہوا اپنی خواب گاہ میں لے آیا۔

موسم بے حد سرد ہو گیا تھا۔ یخ بستہ ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ دن جلدی ڈھل جاتے اور شام تیزی سے زمین پر اتر آئی۔ پھر سرِ شام ہی اندھیرا پھیلنے لگتا اور ایسا ہی اندھیرا بازغہ کے دل میں بھی ایک بار

پھر سے پھیلنے لگ گیا۔ گو کہ یہ دن ان کی خوشگوار زندگی کے لحاظ سے پچھلے دنوں سے کئی گنا بہتر تھے۔ مگر خوف بازغہ کے دل کو کبھی کبھی خوف کا سایہ اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ اگر اب بھی ایسا نہ ہوا تو وہ شاید۔۔۔شاید اب مر ہی جائے۔۔۔سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہونے لگتا تھا، اور اس شش و پنج میں کئی مہینے اور گزر گئے۔

دل کی گہرائیوں میں امید کا ایک ننھا سا دیا جل رہا تھا اور اس کی تابنا کی کچھ بھی نہیں تھی۔ خوف اور وسوسوں کی دھند زیادہ گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ پھر سے بہت مضمحل رہنے لگی تھی اور اب اس کی زندگی پھر سے بوجھل ہو گئی۔ ''قدوس منزل'' میں پھر نا امیدی کے خوفناک سایوں نے اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔

اس عالم میں تین مہینے اور گزر گئے اور برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ بازغہ کو اپنی ذہنی حالت پہلے سے بھی زیادہ متغیر محسوس ہونے لگی۔ بارش کے موسم میں بالکونی میں کھڑی وہ ہلکی ہلکی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چلنے سے کبھی کبھی پھوار اس کے جسم سے بھی ٹکرا جاتی تو اسے یک گونہ راحت سی محسوس ہوتی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ چکر سا آ گیا اور وہ وہیں بالکونی کے فرش پر بے اختیار بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ بے ہوش ہو چکی۔

جب اسے ہوش آیا تو اپنے بستر پر تھی اور شیراز اس کے سرہانے موجود تھا۔ سعیدہ قدرے دور کھڑی تھی۔ اس نے آنکھیں جھپکائیں اور دھیرے سے پوچھا: ''میں کہاں ہوں؟''

''اپنے کمرے میں۔''

''کیا ہوا تھا مجھے۔'' بازغہ نے اسی دھیمی آواز میں پوچھا۔

''بھئی یہی تو میں بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر کیا ہوا تھا، تم بالکونی میں بے ہوش پڑی تھیں کہ سعیدہ نے مجھے فون کر کے بلایا۔ وہ تو اتفاق تھا کہ سعیدہ تمہیں نیچے سے دیکھ رہی تھی، ورنہ نہ جانے کب تک پڑی رہتیں۔'' شیراز نے تفصیل بتائی۔

بازغہ نے سعیدہ کی طرف ممنونیت کی نگاہ سے دیکھا۔ سعیدہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''بازغہ بی بی! اب آپ کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بھئی ابھی لیٹی رہو!'' شیراز نے کہا۔ ''ابھی ابھی تو تمہیں ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔''

''ڈاکٹر آیا تھا؟۔۔۔کیا بتایا ڈاکٹر نے؟'' بازغہ نے گھبرا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں! فکر کی کوئی بات نہیں۔ بس اتنا ہی کہا کہ ایک بار ہسپتال میں مکمل چیک اپ کروانا ہو گا۔''

''کیوں؟'' بازغہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ تو مجھے بھی پتا نہیں کیوں؟'' شیراز نے بھی حیرت ظاہر کی۔ ''آخر تم بے ہوش کیسے ہو گئیں۔''

بازغہ چپ رہی۔

''کیا محسوس ہوا تھا تمہیں؟'' شیراز نے پھر پوچھا۔

''بس یونہی چکر سا آ گیا تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔'' اس نے حقیقت بتائی۔

''ہوں!'' شیراز گہری سوچ میں چلا گیا۔

اگلے روز شیراز اسے ہسپتال لے گیا۔ وہاں تمام چیک اپ کروانے کے بعد جو رپورٹیں حاصل ہوئیں وہ سب کی سب تسلی بخش تھیں۔ تاہم ڈاکٹر نے اس کی ساری بات سن کر مشورہ دیا کہ ماہر امراض دماغ کو بھی دکھا لینا چاہیے۔ شیراز کو لیڈی ڈاکٹر کی بات یاد تھی۔ وہ ڈاکٹر کی بات سن کر پریشان سا ہوا۔

''بھئی نہیں! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس احتیاطاً یہ بھی کر لینا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے اس کے چہرے کی متغیر حالت سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' شیراز نے جواب دیا۔

وہ دونوں گھر آ گئے اور اسی شام کو شیراز شہر کے مشہور دماغی سپیشلسٹ سے رابطہ کیا اور لیے گئے وقت کے مطابق بازغہ کی رپورٹیں لے کر اکیلا ہی چلا گیا۔ تفصیلی گفتگو کے بعد شیراز نے کہا کہ اگر وہ اپنی مسز کو یہاں لے کر آیا تو وہ مزید پریشان ہو گی۔ میں آپ کو منہ مانگی بلکہ اس سے بھی زیادہ فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ براہِ مہربانی اس کا معائنہ گھر پر آ کر کر لیں۔

انہوں نے کہا: ''شیراز صاحب یہ ہمارے کیریئر کے خلاف ہے، لیکن میں آپ کی پریشانی دیکھتے ہوئے فیس کے بغیر یہ خدمت سرانجام دینے کے لیے تیار ہوں۔''

شیراز نے جذبۂ ممنونیت سے ان کے ہاتھ چوم لیے۔

جب گھر کے سارے مکین سو چکے اور رات کے گیارہ بج گئے تو شیراز چپکے سے ان کے ساتھ بازغہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ بازغہ شیراز کے ساتھ انہیں دیکھ کر حیران ہوئی۔ شیراز نے ان کا تعارف ایک عام ڈاکٹر کی حیثیت سے کروایا۔

''تو بیٹا!'' بازغہ سے مخاطب ہوتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اب کیا حال ہے آپ کا؟''

''جی میں ٹھیک ہوں۔''

''سر میں درد تو نہیں رہتا؟''

''جی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔''

''چکر زیادہ آتے ہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی! اور آنکھوں میں اندھیرا سا ہونے لگتا ہے۔''

''اب تک کتنی بار یہ ہو چکا ہے؟''

''جی اندھیرا؟''

''ہاں!''

''پہلی بار ہوا ہے۔'' بازغہ نے گھبرا کر جواب دیا۔

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے بیٹا!'' ڈاکٹر نے تسلی دی۔

''کیا آپ میرے کلینک آسکتی ہیں، کچھ ضروری چیک اپ کرنا پڑے گا، جو یہاں نہیں ہو سکتا؟''

بازغہ نے شیراز کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جی ڈاکٹر صاحب!''

''اچھا شیراز صاحب! انہیں کل شام پانچ بجے میرے کلینک لے آئیے گا۔ اور اب مجھے اجازت دیں۔''

وہ ان کے ساتھ باہر آ گیا۔ اس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف دیکھا تو وہاں اندھیرا تھا۔ اس نے پورچ سے گاڑی نکالی اور ڈاکٹر صاحب کو بٹھا کر ان کے گھر ڈراپ کرنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں ڈاکٹر صاحب اسے کچھ سمجھاتے رہے اور شیراز صبر و تحمل کے ساتھ سنتا رہا۔

واپس آیا تو بازغہ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔

''میں ٹھیک ہوں، اس کی کیا ضرورت تھی۔''

''نہیں۔'' شیراز نے اس کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اطمینان کر لینا بہتر ہوتا ہے، بروقت علاج ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔''

''بروقت علاج؟'' بازغہ چونک اٹھی۔ ''مجھے کیا مرض ہے؟''

''یہی کہ تم اپنی مرضی بہت کرتی ہو۔''

بازغہ ہنس پڑی۔ ''مجھے صحیح بتاؤ!''

''بھئی اصل بات یہ ہے کہ مسلسل سر درد رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اب دیکھو نا اگر تم بالکونی سے باہر گر جاتیں تو۔۔۔'' شیراز نے پریشانی سے کہا۔

''تو۔۔۔ تو تم مجھے آ کر کیچ کر لیتے۔''

''بھئی میں کوئی کرکٹ کا کھلاڑی نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو جس انداز میں تم گرتیں، مجھ سے کیچ مس بھی ہو سکتا تھا۔'' شیراز کی آواز میں درد جاگ اٹھا۔

''اچھا اب یہ دوا کھا کر سو جاؤ، میں تمہارے لیے راستے سے لے آیا ہوں۔''

''راستے سے؟''

''اوہو! مطلب یہ کہ میڈیکل سٹور سے۔''

بازغہ نے اٹھنا چاہا تو شیراز نے خود ہی اسے بیڈروم فریج سے پانی نکال کر دیا اور دو قسم کی سٹرپ سے ایک ایک گولی نکال کر اس کے منہ میں ڈال دی۔

''جلدی سے نگل جاؤ اور پانی پی لو۔'' شیراز نے جلدی سے کہا۔

بازغہ نے پانی پیا اور پھر لیٹ گئی۔ شیراز سے کہا کہ وہ بھی لیٹ جائے۔

کچھ ہی دیر میں بازغہ نیند کی گہری وادیوں میں تھی۔ شیراز کتنی ہی دیر تک جاگتا رہا اور پھر اس کو بھی نیند نے آ لیا۔

اگلے روز پانچ بجے کے طے شدہ وقت کے مطابق پہنچنے کے لیے گھر سے نکلنے لگے تو بیگم قدوس نے پوچھا۔ ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

''بس امی آج ذرا سیر کو جی چاہ رہا تھا۔'' بیگم قدوس نے بازغہ کی طرف دیکھا، اسے کچھ اس کی حالت پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، چلے جاؤ!'' لیکن ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ بازغہ نے ان کی طرف دیکھ کر محسوس کیا کہ وقت کا گرداب پھر ایک بار اسے اپنے شکنجے میں لینے کے لیے منہ کھولے کھڑا ہے۔

وقت کے مطابق وہ کلینک پہنچ گئے۔ کلینک کا بورڈ پڑھ کر بازغہ سناٹے میں آ گئی۔ لیکن شیراز نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں جو وہ سمجھ رہی ہے۔ ان کے مستقبل کی امیدوں کے لیے یہ ٹیسٹ بھی ضروری ہے اور محض ایک روٹین کی کارروائی ہے۔

ضروری ٹیسٹوں کے بعد شیراز نے گاڑی ریس کورس پارک کی طرف موڑ لی۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بھئی ذرا کھلی فضا کی سیر بھی تو کر لینی چاہیے۔''

''ہم کون سی گھٹن میں رہتے ہیں، ہمارا گھر تو بہت کشادہ ہے۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''ہاں مگر۔۔۔اندر کی گھٹن سے بھی تو نکلنا پڑتا ہے۔''

اس کے پاس شیراز کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ تو اس کے ساتھ ہو ہی رہا تھا۔

پارک میں چاروں جانب رنگ برنگ غباروں کا منظر تھا۔ ننھے ننھے بچے اچھل اچھل کر کھیل رہے تھے۔ بازغہ کی آنکھوں کو یہ منظر بہت ہی خوبصورت لگا۔

شیراز نے کہا: ''ہمارے بچے ہوں گے تو ہم بھی غباروں سے کھیلا کریں گے۔''

''ہم یا بچے؟'' بازغہ نے ہنس کر پوچھا۔

''بچوں کے ساتھ۔'' شیراز نے اپنی تصحیح کی۔

وہ دونوں چلتے چلتے ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھنے لگے۔ ایک غبارہ اڑ کر ان کے پاس آ گیا۔ شیراز نے اٹھ کر غبارہ پکڑ لیا۔ بچہ دوڑتا ہوا شیراز کی جانب آیا۔ شیراز نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تین سال کا خوبصورت سا بچہ تھا۔ بازغہ نے بھی اس کی طرف دیکھا اور اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ہمارا بچہ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔۔۔ شیراز نے بچے کو پیار کیا اور غبارہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور غبارہ اپنے ننھے سے ہاتھوں میں تھامے چھوٹے چھوٹے قدموں سے بھاگتا ہوا واپس چلا گیا۔

شیراز واپس بنچ پر بیٹھ گیا تو بازغہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شیراز! چلو واپس چلتے ہیں۔''

اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں ابال سا تھا۔

شیراز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور واپس گاڑی میں آ گئے۔

''کیا ارادہ ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔ ''کچھ درد کم ہوا یا نہیں؟''

''گھر چلتے ہیں۔۔۔ڈاکٹر نے کیا بتایا تھا؟''

''رپورٹ کل ملے گی۔'' حالانکہ ڈاکٹر نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس نے گاڑی تیزی سے ریورس کی اور کینال روڈ کی طرف رواں ہو گئے۔

راستے میں ایک جگہ پھلوں کی دکان نظر آئی تو شیراز نے گاڑی روک لی۔

''شاید گھر میں فروٹ ختم ہو چکا ہے، کچھ لے لیتے ہیں۔''

بازغہ چپ رہی۔ شیراز نیچے اترا اور پھلوں کے دو تو کرے ڈگی میں رکھوا کر گاڑی سٹارٹ کی تو بازغہ نے پوچھا: ''کیا لیا؟'' حالانکہ گاڑی کے شیشے سے وہ دیکھ چکی تھی۔

''سیب!۔۔۔تمہارے گالوں جیسے۔۔۔وہی تو پسند ہیں نا تمہیں۔''

''اور تمہیں بھی۔'' بازغہ ہنسنے لگی اور ساتھ ہی شیراز کا ہلکا سا قہقہہ سا گونج اٹھا۔

☆☆☆

☆☆☆

برسات کا موسم قدرے اطمینان سے گزر گیا۔ شیراز کو شاید ایسا ہی لگا لیکن بازغہ کا دل مسلسل اداس اور بے چین سا رہتا تھا۔ ستمبر کی سرد و گرم ہواؤں کے ساتھ اس کے دل کا موسم بھی سرد و گرم رہنے لگا۔ کبھی بہت امید۔۔۔ اور کبھی مایوسی ہی مایوسی۔ اس پر بیگم قدوس کا رویہ پھر پہلے جیسا ہونے لگا۔ وہ بار بار بازغہ کو کڑے تیوروں سے دیکھنے لگتیں اور بازغہ کو ان کے یہ تیور زہر میں ڈوبے نشتروں کی طرح محسوس ہوتے۔ وہ ان کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکتی تو چپکے سے ان کے سامنے سے ہٹ جاتی۔

بظاہر بازغہ کی حالت بہتر تھی۔ شیراز کی لائی ہوئی دوائیاں وہ شاید خود وقت پر نہ کھاسکتی لیکن شیراز نے اس میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دی اور دفتری مصروفیات کے بعد سائے کی طرح اس کے ساتھ چمٹا رہتا۔ لیکن آخر مرد تھا۔۔۔ کب تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ اسے دفتری مصروفیات کے علاوہ بھی کبھی کبھی گھر سے باہر جانا پڑتا تھا اور بازغہ کے لیے یہی وقت زیادہ کٹھن ہو جاتا تھا۔ خوف کے سائے اس کی آنکھوں میں لہرانے لگتے تھے۔ بیگم قدوس کی نگاہیں روز بہ روز شعلوں کی طرح بھڑکنے لگ گئی تھیں۔ شیراز ہوتا تو ان کے سامنے ان کا رویہ قدرے مختلف ہوتا لیکن اس کے جانے کے بعد جیسے وہ اس کے وجود کو برداشت ہی نہیں کر پا رہی تھیں۔

ایک روز اسی طرح شیراز گھر سے باہر تھا کہ انہوں نے سعیدہ کے ذریعہ بازغہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

بازغہ دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔ انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپکے سے بیٹھ گئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا:

''بازغہ! کیا تم مجھے یونہی مار دو گی؟''

''جی۔۔۔جی! آپ کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں؟'' بازغہ ان کی بات سن کر اندر ہی اندر آدھی مر سی گئی۔

''میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔'' انہوں نے توقف کیا۔ بازغہ سر جھکائے ان کی بات سن رہی تھی۔ ''شیراز کو زور دو کہ وہ جلد از جلد شادی کر لے۔ ورنہ میں اب زیادہ دن نہیں رہنے والی۔''

''جی ٹھیک ہے۔۔۔'' بازغہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جا سکتی ہو!'' بیگم قدوس نے تحکم سے کہا۔

وہ جلدی سے باہر آ گئی۔ دیکھا تو سعیدہ راہداری میں کھڑی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے بیگم صاحبہ کو؟'' اس کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

بازغہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ سعیدہ پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''بازغہ بی بی! مجھ سے آپ کی یہ حالت برداشت نہیں ہوتی۔''

''تو کیا کرو گی؟'' بازغہ سسک اٹھی۔

سعیدہ نے بلا تکلف بازغہ کو سینے سے لگا لیا اور بازغہ کی بے اختیار ہچکیاں جاری ہو گئیں۔ سعیدہ بھی ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

ایک دم شیراز آ گیا۔ وہ ہکا بکا سا تھا۔ بازغہ کو سعیدہ سے چمٹے ہوئے دیکھ کر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دونوں بری طرح رو رہی تھیں۔

سعیدہ کو محسوس ہوا کہ شیراز کھڑا ہے، وہ گھبرا کر اس سے الگ ہو گئی۔

بے اختیار اس نے بازغہ سے پوچھنے کی بجائے سعیدہ سے پوچھا:

''تم دونوں کیوں رو رہی ہو؟''

''جی صاحب جی!۔۔۔ میری ہمت نہیں ہو رہی آپ کو بتانے کی۔''

شیراز نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''بے خوف ہو کر بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟''

''جی بڑی بیگم صاحبہ نے بازغہ بی بی کو ڈانٹا ہے۔'' وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

''تو اس پر دونوں کیوں رو رہی ہو؟ وہ بڑی ہیں، ہماری ماں ہیں، ڈانٹ سکتی ہیں۔'' شیراز کی آواز بلند ہو گئی۔

''جی بات یہ نہیں ہے۔''

تو کیا بات ہے؟''

اتنی دیر میں بازغہ نے اپنی حالت پر قابو پا لیا تھا۔

''سعیدہ چپ رہو، شیراز کو کیوں پریشان کرتی ہو۔''

''نہیں میں پوچھ کر رہوں گا۔'' شیراز نے سختی کے ساتھ کہا۔ ''ہاں بتاؤ سعیدہ! کیا معاملہ ہے؟''

''جی وہ۔۔۔'' وہ ڈر سی گئی۔

''ہاں ہاں! کہو!'' شیراز نے اسے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

بازغہ نے پھر روکنا چاہا لیکن اب سعیدہ میں کچھ ہمت پیدا ہو گئی تھی۔

''جی بڑی بیگم کہتی ہیں کہ آپ کی دوسری شادی ہونی چاہیے اور اس کے لیے وہ بازغہ بی بی کو زور دے رہی تھیں کہ وہ آپ کو مجبور کریں۔'' سعیدہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔

شیراز سن کر سکتے میں آ گیا۔ ''اچھا تم جاؤ میں ان سے بات کرلوں گا۔''

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے چلی گئی تو شیراز نے بازغہ کا بازو پکڑا اور اندر کمرے میں آ گیا۔

''بازغہ یہ ہماری نوکرانی ہے نا!'' شیراز نے کہا۔

''جی!'' بازغہ کی آواز میں صرف ترشح باقی تھا۔

''تمہاری کتنی خیر خواہ ہے!'' شیراز نے کہا۔ ''شاید اس لیے کہ تم نے اس کی مدد کی تھی۔''

''نہیں شیراز! ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ''ان لوگوں کے دل میں جھانک کر دیکھا کرو، اس میں ذرا بھی کھوٹ نہیں ہوتا۔''

''ہاں مگر شاید بہت کم لوگ ایسے ہوں۔'' شیراز کو حیرت تھی۔ '' کچھ لوگوں کو تو میں نے مالکوں کو ڈستے بھی دیکھا ہے، چوریاں کرتے ہیں، پیسوں میں ہیر پھیر کر جاتے ہیں، گھروں میں نفرت کا بیج بھی بو جاتے ہیں۔'' شیراز نے اسے بتایا۔

''ایسے لوگ تو ہر طبقے میں موجود ہوتے ہیں۔'' بازغہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''یعنی!'' شیراز کے چہرے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ جاگی۔

''یعنی یہ لوگ تو پھر بھی بے ضرر ہوتے ہیں، کچھ وقت کے لیے نقصان کرتے ہیں، لیکن بڑے لوگوں کا مرض اس سے کہیں زیادہ ہے۔'' اس کے لہجے میں اب تلخی سی تھی۔

شیراز اس کی بات کا مطلب صاف سمجھ رہا تھا۔

''میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تمہارا دل تو میرے ہی جیسا ہے، میں تڑپ جاؤں تو تم تڑپ جاتے ہو اور خواہ مخواہ میرے لیے اپنا دل ہلکا کر لیتے ہو۔''

''تو میرے علاوہ کون کرے گا۔۔۔ اپنا دل۔۔۔ ہلکا؟'' شیراز نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

بازغہ اس کے انداز سے ایک دم ہنس دی۔

کچھ دیر وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر شیراز نے کہا: ''میں ابھی آتا ہوں۔''

''اب کہاں جا رہے ہو؟''

''بس ابھی آیا نا۔''

اور شیراز جب واپس آیا تو خاصی رات ہو چکی تھی۔ بازغہ نے شیراز کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بس اتنا کہا:

''اب خدا نے چاہا تو میری دوسری شادی کی بات کبھی نہیں ہو گی۔''

یہ سن کر بازغہ کا دل شیراز کی محبت میں مزید سرشار ہو گیا۔ شدت محبت سے اس نے شیراز کے ہاتھ تھام لیے۔

☆☆☆

☆☆☆

وقت کی گردش تیزی سے جاری تھی۔ دسمبر کا مہینہ آئے ابھی کچھ دن ہی گزرے تھے کہ بیگم قدوس کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کے بعد دو دن مزید گزر گئے، طبیعت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ شیراز خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ وقت انھی کے سرہانے بیٹھ کر گزارنے لگا۔

وہ ممی کو دوا اپنے ہاتھ سے کھلا رہا تھا۔ تب بازغہ کو شدت کے ساتھ احساس ہوا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کس قدر چاہتا ہے، کتنی محبت کرتا ہے وہ ان سے۔ خاصی رات گئے وہ اپنی خواب گاہ میں آیا تو بازغہ جاگ رہی تھی۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نیند ہی نہیں آئی۔'' بازغہ نے کہا۔

''کیوں۔۔۔کیا کوئی خاص مسئلہ؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں! تمہارے انتظار میں۔'' پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

''ممی جاگ رہی تھیں اور خاصی بے چین تھی انہیں، اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ ان کے سونے تک ان کے پاس ہی بیٹھا رہوں۔'' شیراز نے بتایا۔

''اچھا کیا تم نے۔'' وہ بولی۔

''ویسے تم میرا انتظار نہ کیا کرو، آرام سے سو جایا کرو۔'' شیراز نے کہا۔

''آرام سے؟''

''تو کیا یونہی جاگتی رہا کرو گی؟'' شیراز مسکرا دیا۔

''کیا ہرج ہے۔۔۔تمہارے انتظار میں مزا آتا ہے۔'' بازغہ نے خاص ادا سے کہا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں!'' شیراز نے اس کی ادائے خاص کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ممی کے پاس مجھے دیر ہو جاتی ہے اور تم خواہ مخواہ اپنی نیند خراب کرتی ہو۔''

''اب کیسی ہے ان کی طبیعت؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور اسی وجہ سے انہیں نیند بھی نہیں آرہی تھی۔'' شیراز کے چہرے پر پریشانی سی آگئی۔

''بہت کمزور نظر آرہی ہیں وہ۔'' بازغہ نے کہا۔

اگلے دن وہ بیگم قدوس کے کمرے میں گئی تو وہ سو رہی تھیں۔ بڑی دیر وہ خاموش بیٹھی میز پر رکھی ڈھیر ساری دواؤں کو دیر تک گھورتی رہی۔ ان کے چہرے کو تکتی رہی اور پھر واپس آگئی۔ کئی دفعہ وہ ان کے پاس جاتی تھی دن میں۔ لیکن ہر مرتبہ وہ اسے سوئی ہوئی نظر آتیں۔

''ممی آج کل سو بہت رہی ہیں۔ کیا ڈاکٹر نے نیند کی دوا دی ہے؟'' اس نے شیراز سے پوچھا۔

''نہیں تو!'' وہ بولا۔

''میں تو جب بھی ان کے کمرے میں جاتی ہوں، وہ مجھے سوئی ہوئی ہی ملتی ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''مجھے تو آج آفس جانا ضروری ہے، دو دن سے گیا ہی نہیں ہوں۔ بہت کام اکٹھا ہو گیا ہوگا۔ تم دس بجے ممی کو سوپ ضرور پلا دینا۔'' وہ ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے بولا۔

''اچھا!'' بازغہ نے کہا۔

''اور دیکھو، اپنے ہاتھ سے پلانا، نوکروں کے ہاتھ سے کھانا پینا وہ پسند نہیں کرتیں۔'' اس نے تنبیہہ کرنے کے انداز میں کہا۔

''میں خود ہی پلاؤں گی، تم فکر نہ کرو۔'' بازغہ نے اسے یقین دہانی کراتے ہوئے کہا۔

''اور وقت پر تمام دوائیں بھی دینی ہوں گی۔'' شیراز نے مزید تاکید کی۔

''تم بے فکر رہونا، میں سب کچھ کر لوں گی۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''دوائیں کھلانی مت بھول جانا۔'' کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے پھر یاد دہانی کرائی۔

''اتنی کمزور یادداشت نہیں ہے میری۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اپنی دوا کا بھی خیال رکھنا، تمہیں پتا ہے نا کون کون سی دوا کس وقت کھانی ہے؟''

''ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔'' بازغہ نے پورے یقین سے کہا۔

''اچھا خدا حافظ!'' وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔

بازغہ نے بھی ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اندر چلی آئی۔ وہ باورچی خانے میں گئی۔ وہاں سعیدہ کام کر رہی تھی۔

''کیا کر رہی ہو سعیدہ؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کے لیے سوپ تیار کر رہی ہوں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''تم رہنے دو! آج میں ان کے لیے خود تیار کروں گی۔'' بازغہ نے کہا۔

''آپ خواہ مخواہ کیوں تکلیف کرتی ہیں، رہنے دیں، میں تیار کر لوں گی۔'' سعیدہ بولی۔

''نہیں! آج میں ہی سوپ تیار کروں گی ان کے لیے۔'' بازغہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

سعیدہ ہٹ گئی۔ بازغہ محبت اور خلوص سے سرشار دل لیے سوپ تیار کرنے لگی۔ پہلی بار ایسا موقع ملا تھا۔ بڑی راحت سی ہو رہی تھی دل کو۔ سوپ تیار کر کے وہ ان کے کمرے میں لے آئی۔

وہ اب بھی سو رہی تھیں۔ اس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور واپس آ گئی۔

سعیدہ نے پوچھا: ''پیا نہیں؟''

''سو رہی ہیں۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''اس وقت تو نہیں سوتی ہیں وہ۔'' سعیدہ حیرانی سے بولی۔

''لیکن آج تو سو رہی ہیں۔'' بازغہ نے کہا۔

''آج انہیں کیا ہوا؟'' سعیدہ کی حیرانی دور نہیں ہو رہی تھی۔

''اتفاق سے نیند آ گئی ہو گی۔'' بازغہ نے کہا اور باورچی خانے سے نکل آئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر ان کی خواب گاہ میں گئی اور انہیں پھر سوتا ہوا پا کر واپس آ گئی۔

''ابھی تک نہیں جاگیں وہ؟'' سعیدہ نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں!'' بازغہ نے کہا۔

''مجھے تو فکر سی ہونے لگی ہے۔ آپ خود ہی جگا دیں انہیں۔'' سعیدہ نے کہا۔

''نہیں بیمار کو جگانا مناسب نہیں ہوتا۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''اس مرتبہ میں خود لے کر جاؤں گی، آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔'' سعیدہ نے کہا۔

''نہیں، مجھے تو بہت راحت محسوس ہوتی ہے۔ آج پہلی مرتبہ ان کی خدمت کا موقع ملا ہے۔ آج میں اپنے ہاتھوں سے ان کے سب کام کروں گی۔'' بازغہ کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''اچھا! جیسے آپ کی مرضی۔'' سعیدہ خاموش ہو گئی۔

ساڑھے دس ہو چکے تھے۔ سوپ کے بعد انہیں کئی دوائیاں بھی دینی تھیں اور وہ بے خبر سوئی ہوئی تھیں۔ بازغہ کو فکر سی ہونے لگی۔ اس نے سوپ کا پیالہ اٹھایا اور ایک بار پھر ان کے کمرے میں آ گئی۔ وہ جاگ چکی تھیں لیکن اسے دیکھتے ہی انہوں نے آنکھیں دوبارہ موند لیں۔ انہیں جاگتا پا کر اسے اطمینان سا ہوا۔

''ممی!'' اس نے دھیرے سے پکارا۔

کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خاموشی سے آنکھیں بند کیے رہیں۔

بازغہ نے ہمت کر کے پھر کہا۔ ''ممی! خاصا وقت ہو گیا ہے۔ پہلے سوپ پی لیجیے پھر آپ کو دوائیں بھی کھلانی ہیں۔'' اس کی آواز میں مٹھاس تھی لیکن انہوں نے ذرا سی بھی جنبش نہیں کی۔ ایسے ہی آنکھیں بند کیے لیٹی رہیں، جیسے بے خبر سو رہی ہوں۔

بازغہ کو چکر سا آنے لگا۔ ان کے زیادہ سونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ ''انہیں میری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں رہی اب؟'' سوچتے ہوئے دکھ سے بازغہ کا سارا وجود کانپنے لگا۔ دھندسی چھانے لگی آنکھوں کے سامنے، لٹا لٹا سا وجود لیے وہ واپس آ گئی۔

''اب بھی سو رہی ہیں کیا؟'' سعیدہ نے پھر پوچھا۔

''ہاں!'' اس کی آواز رُندھ سی گئی تھی۔

''لگتا ہے آپ کے بارے میں بیگم صاحبہ کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔'' سعیدہ نے تشویش سے کہا۔

''اب کچھ دیر بعد تم جا کر دیکھ لینا۔'' گھٹی گھٹی سی آواز میں کہتے ہوئے وہ وہاں سے آ گئی۔

بہت دکھ ہوا تھا اسے۔ بڑی تکلیف پہنچی تھی دل کو۔ بہت دیر وہ بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی اور پھر کچن میں چلی آئی۔

''انہوں نے سوپ پی لیا؟'' اس نے سعیدہ سے پوچھا۔

''ہاں! جب میں گئی تو وہ جاگ رہی تھیں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

’’وہ سوئی ہی کب تھیں، بس میری صورت گوارا نہیں تھی انہیں۔‘‘ بازغہ نے دکھ سے سوچا۔

’’کچھ دیر بعد انہیں دوائیں بھی دینی ہیں۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’بیگم صاحبہ نے مجھے سب دواؤں کے ٹائم بتا دیئے ہیں۔ آپ بے فکر رہیے، میں سب دوائیں انہیں وقت پر دے دوں گی۔‘‘ سعیدہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

’’اچھا‘‘ کہتے ہوئے وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی وہاں سے آ گئی۔

شام کو شیراز آفس سے لوٹ آیا۔

’’ممی کو سب دوائیں کھلا دی تھیں نا؟‘‘ اس نے آتے ہی پوچھا۔

’’ہاں!‘‘ بازغہ نے دکھ کے لہراتے سایوں میں جواب دیا۔

’’اور کھانا؟‘‘

’’ہاں وہ بھی دے دیا تھا۔‘‘ بازغہ کی آواز میں سپاٹ پن سا تھا۔

اب وہ کیسے بتاتی کہ انہیں میرے ہاتھ سے کھانا تو درکنار میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں رہی ہے۔ لیکن وہ چپ رہی، کچھ نہیں بتایا شیراز کو۔

’’ممی کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر ہے۔‘‘ شیراز نے بتایا۔ ’’کل ڈیڈی سارا دن ان کے سرہانے بیٹھے رہے، دفتر بھی نہیں گئے۔‘‘

’’ہاں! ڈیڈی تو بہت مصروف رہتے ہیں۔ انہیں وقت ہی کہاں ملتا ہے گھر کے بارے میں۔‘‘

’’بس ان کا شروع ہی سے یہی مزاج ہے۔‘‘ شیراز نے لاپروائی سے کہا۔

’’کل وہ سارا دن ان کا سر دباتے رہے، مجھے تو بڑا مزا آ رہا تھا ان کو ایسا کرتے دیکھتے ہوئے۔‘‘

’’ان کی اس حوالے سے تقلید مت کرنا۔‘‘ بازغہ نے ہنس کر کہا۔ پھر بولی:

’’دوا سے فائدہ نہیں ہوتا کیا؟‘‘

’’ہوتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ بڑی بڑی دیر مجھ سے سر دبواتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ تمہارے دبانے سے بہت سکون ملتا ہے۔‘‘ شیراز نے جواب دیا۔

’’ان کے پہلے تو کبھی ایسا درد نہیں ہوا شاید؟‘‘ بازغہ نے اوپر چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’ایک دو دفعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔‘‘ شیراز نے بتایا۔

’’کب؟‘‘ بازغہ نے پوچھا۔

’’ان دنوں جب میں نے تم سے شادی کے لیے اصرار کیا تھا۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’ہر دفعہ ان کی بیماری کا سبب تم ہی بنتے ہو۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’ممکن ہے! اگر ماں باپ اولاد کو اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر راضی رہیں تو شاید بیماریاں ان کے قریب بھی نہ آئیں۔‘‘ شیراز نے دکھ سے کہا۔

’’بہت ضدی ہو تم۔‘‘ بازغہ بولی۔

’’ضدی نہیں، مجبور!‘‘ وہ بولا۔

’’مجبور کس طرح؟‘‘ بازغہ نے پوچھا۔

’’دل کے ہاتھوں مجبور۔‘‘ خوبصورت سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

’’مجبور نہیں، بس ضدی!‘‘ بازغہ نے اصرار سے کہا اور ہنس پڑی۔

’’چلو یہی سمجھ لو!‘‘ شیراز ہنستے ہوئے بولا۔

شیراز آفس جا چکا تھا۔ وہ طبیعت کا پوچھنے بیگم قدوس کے کمرے میں چلی آئی۔ بیگم قدوس دونوں ہاتھوں سے سر تھامے تکیے پر ادھر ادھر پٹخ رہی تھیں۔ شاید بہت شدید درد تھا۔ بہت بے چینی نظر آ رہی تھی ان کی کیفیت سے۔ بازغہ جلدی سے آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ بڑھا کر دبانے کے لیے ان کے سر پر رکھ دیئے۔

انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے بازغہ کے ہاتھ بری طرح جھٹک دیئے۔ ان کے انداز میں نفرت تھی۔ بازغہ نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں نفرتوں کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ بازغہ کو اپنا وجود جھلستا ہوا محسوس ہوا۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورے چلی جا رہی تھیں اور بازغہ ساکت سی بیٹھی تھی۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ سن سا ہونے لگا تھا۔ تب ہی بیگم قدوس نے اٹھ کر اپنا سر پائنتی کی طرف کر لیا۔ بازغہ کے لیے اب وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ وہاں سے آ گئی۔ دم گھٹتا جا رہا تھا۔ ریزہ ریزہ ہونے لگی تھی اس کی ذات۔ دھواں سا بھرنے لگا تھا ذہن میں۔ محبتوں اور نفرتوں کے درمیان وہ بری طرح پسی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ تپش بڑھنے لگی اور سارا وجود جھلسنے لگا۔

شام کو شیراز آفس سے آیا تو وہ بالکل چپ تھی۔ بول ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے سارے وجود پر نقاہت چھائی ہوئی تھی۔ شیراز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ بری طرح تپ رہا تھا۔

’’اوہو! تمہیں تو سخت بخار ہے۔‘‘ وہ گھبرا گیا۔ ’’میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔‘‘ نمبر ڈائل کرنے کے لیے اس نے تپائی پر پڑے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

’’شیراز!‘‘ ۔۔۔ اس کی آواز میں دھاڑ تھی ۔۔۔ ’’مجھے طلاق چاہیے!‘‘

شیراز کو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے شعلے سے لرزنے لگے ہیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ پھر چیخی:
''ہاں۔۔۔ مجھے طلاق چاہیے!'' اس کے لہجے میں سنگینی تھی۔
''کیوں؟'' شیراز نے بہت اطمینان سے پوچھا۔
''دم گھٹ رہا ہے یہاں میرا، سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔'' وہ تیز آواز میں بولی۔
''کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' شیراز نے نرمی سے پوچھا۔
''کوئی بات نہیں ہوئی۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔
''پھر؟'' شیراز نے پوچھا۔
''بس اب میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔
''تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔
''زبردستی ہے کیا؟'' بازغہ پھر دھاڑی۔
''ہاں!'' وہ بولا۔ ''زبردستی ہی سمجھو!''
''نہیں شیراز! میرا اب اس ماحول میں سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔'' وہ رو دی۔ ''اب میں طلاق لے کر رہوں گی۔''
''اور اگر میں نہ دوں تو؟'' وہ اطمینان سے بولا۔
''تمہیں دینی پڑے گی؟'' وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔
''نہیں بازغہ! ان خیالوں میں کبھی مت رہنا کہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' وہ بھی طیش میں آ گیا۔
''تم ایسے نہیں دو گے تو میں عدالت کے ذریعے لے لوں گی۔'' وہ اپنے آپے میں نہیں لگ رہی تھی۔ بے خودی کے عالم میں بولے چلی جا رہی تھی۔
''ساری دنیا کی عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹا کر دیکھ لو۔'' اس نے اطمینان سے کہتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔
بازغہ کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ تیز ہواؤں کے جھکڑوں میں وہ خود کو بے قابو محسوس کر رہی تھی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ بھی تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سب احساس مٹ گئے تھے۔ دھواں سا بھرا ہوا تھا دماغ میں۔
''شیراز!'' بازغہ نے تیز لہجے میں پکارا۔
''فرمایئے!'' اس نے آنکھیں کھول دیں۔
''خدا کے لیے مجھے طلاق دے دو۔'' بازغہ کا لہجہ اچانک ہی نرم پڑ گیا۔
''تم اپنے ہوش میں نہیں ہو اس وقت۔'' شیراز کو بھی غصہ آ گیا۔
''میں پورے ہوش میں ہوں۔'' وہ بولی۔
''جی سکتی ہو میرے بغیر۔۔۔ اور۔۔۔ کہاں جاؤ گی؟'' اس نے ایک ٹھہراؤ کے ساتھ کہا۔
''کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی، تمہارے بغیر جینے کی کوشش بھی کر لوں گی۔'' اس کا فیصلہ اٹل تھا۔
''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔'' وہ غصے سے کمرے سے ہی نکل گیا۔
بڑی دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ آندھیوں کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔ اب بھی دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ رات کھانے پر بھی وہ نہیں گئی۔ سعیدہ بلانے آئی تھی کہ چھوٹے صاحب بلا رہے ہیں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد شیراز آیا۔
''اپنے مطالبات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے کیا؟'' شیراز کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔
بازغہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اٹھ کر الماری سے کپڑے نکالنے شروع کر دیئے۔
''کہاں کی تیاری ہے؟'' شیراز نے متعجب ہو کر پوچھا۔
''میں واپس امی کے گھر جاؤں گی۔'' اس نے روکھا سا جواب دیا۔
''وہاں کون ہے؟''
''میری امی کی یادیں، میرے ابو کے پیار بھرے دنوں کا گزرا ہوا احساس۔'' اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔
شیراز بھی اس کو دیکھ کر تقریباً رونے ہی والا تھا کہ ایک دم اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔
''تم میرے بغیر اس گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتیں۔'' شیراز ایک دم طیش میں آ گیا۔
''تمہاری قید میں ہوں کیا؟'' وہ بولی۔

’’یہی سمجھ لو۔‘‘ شیراز نے کہا۔ ’’مجھے رہائی چاہیے، نہیں تو میں اس گھٹن سے مرجاؤں گی۔ مجھے کچھ دن کے لیے ہی سہی، یہاں سے جانے دو۔‘‘ وہ ایک بار پھر نرم پڑگئی۔

’’کچھ دن کی بات نہیں ہے، مجھے تمہارے ارادوں کا اندازہ ہوچکا ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’شیراز!‘‘ اس نے لجاجت سے کہا۔ ’’آخر مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ کیا رکھا ہے میرے پتھر وجود میں۔ تمہاری خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گیا ہے میرا وجود۔ مجرم سی محسوس کرنے لگی ہوں میں اپنے آپ کو۔‘‘ اس کی آواز میں گہرے دکھ کی برکھا شامل ہوگئی تھی۔

’’تمہارا وہم ہے یہ سب کچھ۔‘‘ وہ ذرا درشت لہجے میں بولا۔

’’وہم نہیں ہے میرا، نفرتوں کے درمیان بری طرح پس رہی ہوں میں، بالکل بے بس ہوکر رہ گئی ہوں۔ کم از کم مجھے اپنی بدنصیبی کا ماتم تو کرنے دو۔ یہاں تو میں اس سے بھی محروم ہوں۔‘‘ اس کے لہجے میں التجا ہی التجا تھی۔

’’بدنصیبی ہم دونوں کی مشترکہ ہے، تم تنہا اس غم میں گرفتار نہیں ہو۔‘‘ شیراز نے کہا۔

’’نہیں! تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ میری محرومیوں کے سایوں نے تمہارے گھر کی روشنی کو گل کر دیا ہے۔ میری بدنصیبی کے سائے میں اپنی زندگی تاریک مت کرو شیراز!‘‘ بازغہ نے التجائی انداز میں کہا۔

’’کیا میری بدنصیبی تم سے الگ ہے؟‘‘ شیراز کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔

’’اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، میں چلی جاؤں گی تو تمہارے گھر کی رونقیں بحال ہوجائیں گی۔‘‘

’’لیکن میرا دل اجڑ جائے گا۔‘‘ شیراز نے جواب دیا۔

’’وقتی طور پر ہوگا۔ پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بہار آجائے گی اس گھر میں۔‘‘ بازغہ نے اسے مستقبل کا سہانا خواب دکھانا چاہا۔

’’خوشیوں کے سفر میں تمہارے ساتھ شریک ہوا تھا۔ اب غموں کے راستے پر بھی ساتھ ساتھ چلوں گا۔‘‘ شیراز نے کہا۔

’’نہیں شیراز! خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو، مجھے تنہا اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھانے دو۔‘‘ وہ بے بسی سے بولی۔

’’یہ نہیں ہوسکتا۔‘‘ شیراز نے دوٹوک جواب دیا۔

’’ہوسکتا ہے، سب کچھ ہوسکتا ہے، کیوں نہیں ہوسکتا۔‘‘ وہ چیخ پڑی۔

’’بس میں نے کہہ جو دیا۔‘‘ شیراز کے چہرے پر پھر اطمینان آگیا تھا۔

’’بہرحال میں طلاق ہر حال میں لوں گی۔‘‘ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

’’میں طلاق کسی حال میں نہیں دوں گا۔‘‘ اس نے بھی اٹل لہجے میں جواب دیا۔

’’طلاق نہ دوگے تو پھر بھی میں یہاں نہیں رہوں گی۔‘‘ بازغہ نے کہا۔

’’تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔‘‘ شیراز نے کہا۔

’’اس نفرت بھرے ماحول میں رہنا اب میری برداشت سے باہر ہے۔‘‘

’’اور مجھے چھوڑ دینا تمہاری برداشت میں ہے؟‘‘ شیراز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ایک لمحے کو بازغہ کا دل کانپ اٹھا۔ ’’نہیں، تمہیں چھوڑ دینا میری برداشت میں نہیں ہے۔‘‘ اس نے سوچا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔

’’میں تمہیں غموں سے نجات دلانا چاہتی ہوں، تمہاری خوشیوں کے لیے مجھے سب کچھ منظور ہے۔‘‘ وہ بولی۔

’’تمہیں میری خوشیوں یا غموں کا تجزیہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ وہ بولا۔

’’بہرحال میں جا رہی ہوں۔ اگر چاہو تو اپنی دوسری بیوی کے ساتھ کبھی کبھار ملنے آجایا کرنا۔‘‘ بازغہ نے دوبارہ اٹھ کر وارڈروب میں سے کپڑے نکالنے شروع کر دیئے۔

’’تم کہیں نہیں جاؤ گی۔‘‘ شیراز نے جھپٹ کر کپڑے اس کے ہاتھ سے لے کر وارڈروب میں واپس ڈالتے ہوئے اس کا دروازہ بند کر دیا اور بازغہ کا ہاتھ پکڑ کر مسہری کی طرف لے آیا۔ پھر تیزی سے باہر آیا اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

بڑی دیر تک وہ بیڈ پر پڑی سسکتی رہی۔ غموں کے بادل اٹھتے رہے۔ دماغ میں آندھیاں چلتی رہیں۔ ڈھیر سارا وقت یونہی بیت گیا۔ احساس ہی نہیں ہوا، پتہ ہی نہیں چلا کہ رات دھیرے دھیرے کتنی بیت گئی تھی۔ دماغ میں چلتی آندھیوں کا زور اب ٹوٹ گیا تھا۔ سب کچھ نظر آنے لگا تھا۔ طوفان تھم گیا تھا۔ پرسکون سا ہوگیا تھا جی۔ بالکل اسی طرح جیسے طوفان گزرنے کے بعد سمندر پہلے کی طرح پرسکون ہوجاتا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ شیراز نہ جانے کب اندر آکر سوگیا تھا۔ اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ غور سے اسے تکنے لگی۔ شیراز کی محبت کا یہ روپ۔۔۔ اتنا بڑا ہوگا۔ اس نے شروع میں تو بالکل اس کا تصور نہیں کیا تھا۔ کیا شخص ہے یہ۔ کس مٹی کا بنا ہے۔ ایک طرف بیگم قدوس کی نفرت کی انتہا، دوسری طرف آسمان کو چھوتی ہوئی محبت۔ اس نے کبھی کہانیوں میں پڑھی تھی نہ کبھی ڈراموں اور فلموں میں دیکھی تھی۔ اندر سے کتنی محبت کرتا تھا وہ اس سے، آج پہلی مرتبہ پتہ چلا۔ اسے خود پر اعتماد تھا، اور وہ اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ لیکن اس کی محبت تو فرشتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ آہ، اس کے دل میں پھر ہوک سی اٹھی۔ کتنا عظیم ہے یہ۔ اور میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ کرسکی، کچھ بھی نہ دے سکی۔ اسے کچھ دیر پہلے کی باتیں یاد آگئیں۔ اف خدایا اس نے بے خودی میں شیراز سے کیا کچھ کہا تھا۔ کتنا اصرار کیا تھا طلاق لینے کا۔

اور اگر شیراز اس کی بات مان لیتا، سوچتے ہوئے بازغہ کا دل لرزنے لگا۔ پورے کا پورا وجود کانپ اٹھا۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید دل کی دھڑکن ہمیشہ کے لیے رک جاتی۔ شیراز سے دائمی جدائی کا تصور بھی اس کے لیے موت ہے۔ تم کتنے بلند، کتنے عظیم ہو شیراز! اس بنجر زمین کو کتنی خوشی سے اپنا رکھا ہے۔ میری خوشیوں کے لیے تم نے اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ تمہیں معلوم ہے، تمہیں میری محبتوں کا اندازہ ہے کہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتی۔ جب ہی تم میرے لیے اپنی آرزوؤں کو ہمیشہ کی نیند سلا رہے ہو۔ تم عام مردوں سے کتنے مختلف اور الگ ہو۔ بلند کرداری کی انتہا پر پہنچ گیا ہے تمہارا وجود۔ تم نے واقعی چاہتوں کا مان رکھ لیا ہے۔ شیراز! تم نے اپنے قبیلے والوں کی محبتوں کو معتبر کر دیا ہے۔ تمہاری ذات دنیا کے سب مردوں سے کتنی بلند و بالا ہے۔ تمہاری شخصیت کتنی اونچی ہے شیراز، اور میں۔۔۔ مجھے اپنے آپ پر فخر ہو رہا ہے کہ میری چاہتوں کا مرکز ایک عظیم انسان ہے۔ ایسا انسان جو آج کی دنیا کے سب مردوں سے بلند ہے۔ عظمتوں کے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا یہ انسان میرا اپنا ہے۔

شیراز کے چہرے پر نظریں جمائے بازغہ اپنے آپ سے مخاطب تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن میں جو طغیانی آئی تھی، وہ اب ختم ہو گئی تھی۔ وہ پرسکون تھی۔ شیراز پر اسے ڈھیروں ڈھیر پیار آ رہا تھا۔ اگر وہ بھی اس کی جنونی کیفیت سے بیزار ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کر لیا، اس کا مطالبہ مان لیتا تو پھر کیا ہوتا۔ لیکن وہ یہ سب کوئی خود سے تھوڑی کر رہی تھی۔ وہ تو بس حالات کی تیز آندھی کی زد میں آ گئی تھی، ہار گئی تھی۔ زخموں سے چور چور ہو کر چلا اٹھی تھی ورنہ وہ تو خوش شیراز کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے پھر شیراز کے پرسکون چہرے کی جانب دیکھا۔ ایک اطمینان بخش مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

اسی شام شیراز نے آفس سے آ کر جہاز کی دو ٹکٹیں بازغہ کی گود میں لا کر ڈال دیں۔

''یہ کیا ہے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''کچھ دن کے لیے گھومنے پھرنے کا ارادہ ہے۔ کاغان، گلگت، اسکردو اور بہت سی جگہ پر جانے کا پروگرام بنا لیا ہے میں نے۔ بس تم تیاری کر لو۔'' شیراز نے بتایا۔

''لیکن، ایسے اچانک؟'' بازغہ حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ہاں بھئی! تمہارے موڈ کی درستی کے لیے۔'' وہ بولا۔

''میرا موڈ تو ٹھیک ہے اب۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''اس گھٹے ہوئے ماحول میں تم خود بھی افسردہ ہو جاتی ہو اور مجھے بھی تنگ کرتی رہتی ہو۔'' شیراز کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔

''تمہیں تنگ کرتی رہتی ہوں؟'' بازغہ کا انداز بھی شکایتی ہو گیا۔

''اور کیا۔۔۔! آئے دن نت نئے مطالبے، نئی نئی باتیں کر کر کے تم تو میرا دماغ خراب کر دو گی۔'' وہ بولا۔

''جناب کو اپنے دماغ کا اتنا ہی خطرہ ہے تو مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ سارے خطرات ختم ہو جائیں گے۔'' بازغہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''سارے خطرات مول لے سکتا ہوں پر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں بازغہ کو اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ چاہتوں کے سمندر موجزن تھے شیراز کی نگاہوں میں۔ بازغہ کا وجود اس سمندر میں ڈوبنے لگا۔

''میں نے تمہیں غلط تو نہیں چاہا شیراز! تم تو ہو ہی چاہے جانے کے قابل۔'' چاہتوں کے سحر میں ڈوبی وہ سوچنے لگی۔

ایک ماہ بعد وہ دونوں واپس آئے تھے۔ خوب سیریں کی تھیں، جی بھر کر تفریح کی تھی۔ بہت خوبصورت، حسین جگہوں پر گھومے پھرے تھے۔ دلکش وادیوں کے حسین مناظر کو دلوں میں سمو لیا تھا۔ فرحت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان مقامات کی سیر کے دوران جی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے سب کچھ دماغ سے نکل گیا تھا۔ غموں کی نگری بہت دور رہ گئی تھی اور اب وہ خوشیوں کی وادی میں تھے۔ سرشار سرشار غموں کی ہنسی اڑائے بے فکرے سے ہو گئے تھے۔ گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ انہی پرمسرت فضاؤں اور گنگناتی ہواؤں میں، انہی دلکش وادیوں میں زندگی کی شام ہو جائے۔ وہ ہمیشہ کے لیے انہی پرکیف نظاروں میں کھو جائیں۔

اس دن شیراز نے گھر فون کر کے خیریت معلوم کی تو ممی نے بتایا کہ کام کا بوجھ بڑھ جانے سے قدوس صاحب ان دنوں خاصے مضمحل ہیں۔

''اب ہمیں واپس جانا ہی پڑے گا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، تو پھر چلو نا!'' بازغہ بولی۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں کہ وہاں جا کر پھر تم کہیں ویسی ہی نہ ہو جاؤ۔ اتنی مشکلوں سے تو تمہارا موڈ ٹھیک کیا ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''بہت محنت کرنی پڑی ہے تمہیں؟'' بازغہ نے مسکرا کر کہا۔

''بہت!'' وہ بھی مسکرا دیا۔

''نہیں شیراز! میں اب حالات سے سمجھوتہ کر لوں گی۔'' بازغہ نے کہا۔

''عقل آ گئی ہے کیا؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ہاں!'' بازغہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر وہ واپس آ گئے۔ وہی گھر تھا۔ ویسے ہی سناٹے پھیلے ہوئے تھے، اس وسیع و عریض گھر میں۔ مکینوں کے مزاج بھی ویسے ہی کڑوے کسیلے تھے لیکن اب بازغہ نے حالات سے واقعی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ سب کچھ سہہ لینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ نفرت بھری نگاہیں اب اس کے دل میں کھبتی نہیں تھیں۔ اس نے خود کو پتھر کی طرف سخت بنا لیا تھا۔ اسے ایسا ہی کرنا تھا کیونکہ شیراز کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی محال

تھا۔وہ جی ہی کب سکتی تھی اس کے بغیر۔اس کی تو سانس کی ایک ایک ڈور شیراز کے وجود سے بندھی ہوئی تھی۔وہ اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔پھر کسی طرح وہ اس سے جدا ہو سکتی تھی۔

رات خاصی ہو گئی تھی۔شیراز سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔ہاتھوں میں رسالہ لیے کچھ پڑھ رہا تھا۔بازغہ بستر پر لیٹی اسے دیکھے چلی جا رہی تھی اور وہ بہت انہماک سے پڑھنے میں مصروف تھا۔

''سونا نہیں ہے کیا؟ رات بہت ہو گئی ہے۔'' بازغہ نے پوچھا۔

''ہوں'' کہہ کر وہ دوبارہ رسالے کی طرف متوجہ ہو گیا۔بہت دیر سے وہ ایک ہی صفحے پر ٹکٹکی جمائے بیٹھا تھا۔نہ جانے کیا دیکھے چلا جا رہا تھا۔بازغہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔جب بہت دیر بعد بھی اس نے صفحہ نہیں پلٹا تو بازغہ کو الجھن سی ہونے لگی۔وہ اٹھی اور دبے قدموں اس کے پیچھے پہنچ گئی۔شیراز تو دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔صفحے پر نظر پڑتے ہی بازغہ کو اپنی ہستی ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔گول مٹول پیارے سے شیر خوار بچے کی تصویر تھی، جسے شیراز ایک ٹک دیکھے چلا جا رہا تھا۔

''اف خدایا!'' بازغہ کو محسوس ہوا جیسے آس پاس کہیں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور جیسے اس کا وجود شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہو، دم گھٹنے لگا۔احساس جرم اتنی شدت سے جاگا کہ اسے سانس لینا مشکل ہو گیا۔اسے لگا جیسے انجانے میں وہ کوئی قتل کر رہی تھی۔شیراز کی آرزوؤں کا قتل۔اس کی خوشیوں کا خون کر رہی تھی۔اس کے احساسات جل اٹھے۔

بہت مشکل سے وہ وہاں سے ہٹ کر مسہری تک آئی۔شیراز کو شاید کچھ بھی پتہ نہیں چل سکا۔وہ تو بالکل بے خبر بیٹھا تھا۔تصویریں دیکھ کر تشنہ آرزوؤں کی پیاس بجھا رہا تھا۔شاید؟ بازغہ کا دماغ سن ہو گیا۔کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔بہت دیر وہ پتھر بنی لیٹی رہی تھی۔تب ہی آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت واپس آ گئی۔

کتنی خود غرض محبت کی تھی اس نے شیراز کے ساتھ۔اس کی چاہتوں، محبتوں، ایثار اور قربانی کے صلے میں کیا دیا تھا خود غرضیوں کے سوا۔انسان کتنا ہی کیوں نہ کہے، کتنا ہی جھوٹی تسلیوں سے خود کو بہلائے۔لیکن دل میں چھپی آرزوئیں دل ہی میں رہتی ہیں۔وہ کسی طرح بھی دل سے نہیں جاتیں۔چاہے انسان انہیں نکالنے کی کتنی بھی کوشش کرے۔کتنے ہی یقین کیوں نہ کر لے۔یہ تو جڑوں کی مانند انسان کے دل میں دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔بہت مضبوطی سے دل کو جکڑے ہوئے ہوتی ہیں۔شیراز باتوں سے لاکھ اسے تسلیاں دے۔خود کو بہلائے لیکن دل کی آرزوؤں پر تو اس کا اختیار نہیں ہے۔''بچے میری کمزوری ہیں۔'' شیراز کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔مجرم محسوس کر رہی تھی وہ اپنے آپ کو شیراز کی۔شیراز نے کتنی چاہتیں اس کی جھولی میں ڈالی تھیں، کتنا خیال رکھتا تھا وہ اس کے ایک ایک پل کا، کتنی چاہت سے اس کا سب دکھ سمیٹ کر اس کے دامن میں خوشیوں کے پھول بھر دیئے تھے۔اور وہ؟ خود اس نے کیا دیا تھا شیراز کو۔اس کے ایثار کے بدلے میں صرف خود غرضی۔اس کی خود غرض محبت نے شیراز کی خوشیوں کے راستے میں فصیل کھڑی کر دی تھی۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔جاگتے ذہن کے ساتھ بازغہ سب کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔اس کے دماغ میں شرارے سے ناچ رہے تھے۔

نہیں، میں شیراز کی راہ میں دیوار نہیں بنوں گی۔میں اپنے پتھر وجود کو ہٹا لوں گی، اس کے راستے سے ہٹ جاؤں گی۔محبت ایثار کا نام ہے، خود غرضی کا نہیں۔نہیں، وہ خود غرض محبت نہیں کرے گی۔وہ اسے خوشیاں دینے کے لیے محبت کی آخری حدوں کو چھو لے گی۔

اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہے اسے شیراز کی ہستی۔اس کی ہستی کو دھواں دھواں ہوتے دیکھنا اس کے بس میں نہیں ہے۔سوچتے سوچتے بازغہ کا دماغ شل ہوا جا رہا تھا۔رات گزر رہی تھی اور پھر یونہی پوری رات بیت گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

صبح ہوئی۔دن کے اجالوں نے رات کی سیاہی کو نگل لیا تھا۔غموں کے اندھیروں نے بازغہ کی خوشیوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر ڈھانپ دیا تھا۔آفس جانے سے پہلے شیراز نے ایک بار پھر رسالہ کھول کر تصویر کو دیکھا تھا۔بازغہ کا دل کٹ گیا تھا۔وحشتیں بڑھنے لگی تھیں۔طوفان اٹھنے لگے تھے۔دل میں بگولے ناچنے لگے۔

اب اسے ہر طرح شیراز کے راستے سے ہٹنا ہو گا۔ایک ہی سوچ ہتھوڑے کی طرح دماغ کے پردے پر ضربیں لگا رہی تھی۔اسے پاگل کیے دے رہی تھی۔خودکشی گناہ ہے اور پھر وہ بزدل بھی نہیں تھی۔حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ تھا اس میں، گو کہ جلے ارمانوں کا دھواں اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

دفتر جاتے ہوئے شیراز نے اس کی جانب دیکھا: ''طبیعت خراب ہے کیا؟''

''نہیں تو!'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''پھر یہ چہرے پر دھواں کیوں پھیلا ہے؟'' وہ بہت ذہین تھا۔

''رات سر میں درد تھا خاصا۔'' بازغہ نے جلدی سے بہانہ بنا لیا۔

''مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔اب بھی ہے کیا؟'' اس نے جواب دیا۔

''دوائیں تو میں تمہیں باقاعدہ اپنے ہاتھ سے کھلا رہا ہوں۔ہاں البتہ رات شاید میں تمہیں ایک دوا دینا بھول ہی گیا۔''

''کیا؟''

''بھئی وہ گولی، جو سر میں درد ہونے سے بچائے رکھتی ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''خیر اب کھالو، اوپر دراز میں پڑی ہے۔ خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہی ہو۔'' اس کے لیے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

بازغہ کا دل ڈوبنے لگا۔ کتنا خیال رکھتا تھا وہ اس کا، کتنا احساس تھا اسے اس کی معمولی سے معمولی تکلیف کا بھی۔

شیراز آفس چلا گیا اور وہ لان میں آ گئی۔

سردیوں کی پیاری پیاری دھوپ اونچی منڈیروں سے اتر کر زمین پر پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ ماحول پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ بازغہ کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لہریں اٹھ رہی تھیں، اور وہ ان لہروں کی طغیانی ڈوبی جا رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی ٹہلنے کے بعد وہ پچھواڑے کی طرف آ گئی۔

دس بارہ ٹنڈ منڈ درختوں کا سلسلہ تھا۔ خزاں کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں اجاڑ دیا تھا۔ وہ دکھ سے سوچ رہی تھی۔ ان پر برگ و بار آ کر بھی گزر جاتا ہے اور ایک وقت میں یہ پھر ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کبھی ان پر بہار آئی ہی نہیں۔ چرچراتے خزاں رسیدہ پتوں پر قدم رکھتی وہ تھوڑا سا آگے بڑھ گئی۔ ایک پالتو شپین نسل کی کتیا کا چھوٹا سا گھر بنا ہوا تھا۔ سفید لمبے لمبے بالوں والی کتیا اپنے گھر میں اپنے پہلو میں چھوٹے سے بچے کو لیے، بہت پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ طمانیت سی پھیلی ہوئی تھی اس کے چہرے پر۔ بازغہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کتنی خوش قسمت ہے یہ۔ وہ رشک سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب واپس آئی تو کتیا جا چکی تھی اور بچہ تنہا زمین پر پڑا تھا۔ بازغہ کے ذہن میں ایک دم طوفان اٹھا۔ آندھی کا تیز جھکڑ چلا۔ سیلاب کا تیز ریلا گھس آیا اور اس کی ہستی کو کسی معمولی تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔ اس کی ذات کے خس و خاشاک بہہ گئے۔ اس طوفانی رو میں کچھ بھی ہوش نہ رہا اسے۔

اسے شیراز کے راستے سے ہٹنا ہے، چاہے جس طرح بھی ہو۔ ایک ہی گونج تھی اس کے دماغ میں۔ آوازوں کا شور تھا اور وہ بے خود ہوئی جا رہی تھی۔ جب ہی اس نے آگے بڑھ کر زمین پر پڑے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بچہ چاہے انسان کا ہو یا جانور کا، بچہ ہی ہوتا ہے۔ منہ پر معصومیت اور آنکھوں میں حیرانی لیے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

بازغہ کے لبوں پر بہت ہی دہشت ناک مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنے پتھر وجود کی دیوار گرا دے گی۔ ایک ہی دھن کے ساتھ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ بیگم قدوس اپنی خواب گاہ میں نہیں تھیں۔ اس نے بچے کو ان کی مسہری پر جا کر لٹا دیا۔ ریشمی لحاف اس پر ڈال کر وہ آہستہ آہستہ اس کے سر پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ بڑی کراہت سی آ رہی تھی۔ اسے کبھی جانوروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آج تک کسی جانور کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن اب سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ شیراز کے لیے، جو اسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اتنے میں بیگم قدوس آ گئیں۔

''یہ کیا؟'' حیرت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''بچہ ہے!'' پرسکون سی مسکراہٹ اس نے اپنے ہونٹوں پر سجالی۔

''یہ لٹانے کی جگہ ہے کیا؟ ہٹاؤ اسے یہاں سے۔'' وہ غصے سے گرجیں۔

''میرا بچہ ہے۔'' بازغہ نے معصومیت سے کہا۔

''کیا؟'' بیگم قدوس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''میرا بچہ ہے نا!'' بازغہ نے پھر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، پاگل ہو گئی ہو کیا، جلدی ہٹاؤ اسے یہاں سے۔'' غصے سے چنگھاڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''ہاں پاگل ہی تو ہو گئی ہوں، جب تک شیراز کو اس کے حصے کی خوشیاں نہیں مل جاتیں، تب تک اسے پاگل ہی تو رہنا ہے۔'' دکھے دل سے بازغہ نے سوچا۔

''جلدی ہٹاؤ اسے!'' بیگم قدوس غصے سے کانپ رہی تھیں۔

''آہستہ بولیے! ابھی سویا ہے، جاگ گیا تو بہت روئے گا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''پاگل ہو گئی ہو تم!'' انہوں نے دانت پیستے ہوئے اسے اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

''نہیں نہیں! سونے دیں۔'' بازغہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''سعیدہ، سعیدہ!'' وہ بے قراری سے سعیدہ کو آوازیں دینے لگیں۔

''کیا ہے بیگم صاحبہ؟ سعیدہ نے آتے ہوئے کہا۔

''اسے پھینکو یہاں سے، بازغہ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' سعیدہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''جلدی کرو!'' وہ گرجیں۔

سعیدہ نے آگے بڑھ کر جلدی سے کتیا کے بچے کو اٹھا لیا۔

☆☆☆

☆☆☆

شیراز کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں اور اب اس میں ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ آگے کا سفر طے کرے۔ پڑھتے ہوئے کئی بار اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ کئی بار اس نے رومال سے آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔ رومال جواب دے گیا تو اس نے قمیص کے پلو سے اس بند کو روکنے کی کوشش کی مگر آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔ اس کے باوجود وہ مسلسل بازغہ کی تحریر کے دوش بہ دوش سفر کرتا گیا، اور اب اس کی گردن کے پچھلے حصے میں اینٹھنسی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بازغہ کی داستانِ حیات کے جتنے ورق پڑھے تھے، اس سے بہت حد تک وہ خود بھی آشنا تھا لیکن بعض جزیات اسے آج ہی معلوم ہوئی تھیں۔ اور اب۔۔۔ اس مرحلے پر آ کر اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

کیا بازغہ پاگل نہیں ہوئی تھی؟ وردناک حیرت سے اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا۔ اس نے یہ ناٹک کر کے میری خوشیاں خریدنی چاہیں۔ آہ۔۔۔ کتنی معصوم تھی وہ۔ کتنی عظیم محبت تھی اس کی۔ بازغہ یہ تم نے کیا کیا۔ تم نے میرے لیے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جیتے جاگتے خود کو کس جہنم میں ڈال لیا تھا۔ تمہاری اتنی بڑی عظمت کا مقام میں کہاں سنبھال کر رکھوں۔ میرے چھوٹے سے دل میں تو اتنی جگہ بھی نہیں۔ میں کس طرح۔۔۔ کس طرح۔۔۔ اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

''صاحب جی!'' اس کے کانوں میں آواز پڑی تو وہ ایک دم ایک طویل خواب سے جیسے بیدار ہو گیا۔ سامنے سعیدہ کھڑی تھی۔ اسے بے اختیار روتا دیکھ کر اسے بھی کچھ یاد آ گیا اور وہ خود بھی رونے لگی۔

لیکن پھر سعیدہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اس دوران میں کاغذوں کا پلندہ شیراز کی گود سے نیچے گر گیا تھا۔ سعیدہ نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور شیراز کے ساتھ سنگ مرمر کے بنچ پر رکھ دیا۔ شیراز نے بے اختیار سعیدہ سے پوچھا:

''سعیدہ! تمہاری مالکن نے کیا کیا؟ کیا وہ واقعی پاگل تھی؟''

''جی صاحب! اس میں کوئی شک تھا کسی کو؟'' سعیدہ حیران ہوئی۔

''واہ بازغہ واہ! تم نے تو اس معاملے میں کسی کو رازداں بھی نہ رکھا۔ شاید تم ڈرتی تھیں کہ تمہارا بھید کھل گیا تو پھر تمہارا منصوبہ بیکار جائے گا۔'' شیراز بے اختیار بولتا چلا گیا۔

سعیدہ مسلسل حیران کھڑی تھی۔ ''صاحب جی! کیا بات ہے؟ میں حق تو نہیں رکھتی لیکن میں نے بازغہ بی بی کی کچھ خدمت کی ہے۔ اس لیے آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

''کہو سعیدہ!'' شیراز کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ''میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ بازغہ نے تمہیں ماں کا درجہ دیا تھا، میں بھی تمہیں دل سے یہی درجہ دیتا ہوں۔''

سعیدہ کی آنکھوں میں محبت جاگ اٹھی۔

''صاحب جی! وہ بازغہ۔۔۔'' اس کی آواز بھرّا گئی۔ ''وہ بہت بڑی عورت تھیں۔ بہت بڑی۔۔۔ اس گھر سے بھی بہت بڑی۔'' سعیدہ رو دی۔ لیکن پھر ایک دم اسے خیال آیا کہ وہ حد سے گزر گئی ہے۔

''صاحب جی! میرا مطلب تھا۔۔۔''

شیراز سمجھ گیا۔ ''نہیں سعیدہ اماں! تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔'' شیراز نے تائید کی۔

''سعیدہ اماں!'' وہ سن کر نہال ہو گئی۔ بازغہ کی یاد پھر اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔

''صاحب جی یہ بات بڑی بیگم کے سامنے نہ کہیے گا۔''

''اچھا!'' شیراز نے کہا۔

''آپ اکثر راتوں کو ان کی یاد میں یہاں بیٹھتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ آج بھی میں ساری رات آپ کے پاس ہی آپ کے پیچھے بیٹھی رہی تھی کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ تو بے خبر تھے

لیکن میں نے آپ کو آواز دینی مناسب نہیں سمجھی۔''

شیراز اس کی خدمت کا یہ انداز دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یک لخت اسے محسوس ہوا کہ سعیدہ میں جیسے بازغہ کی روح سما گئی ہے۔

''تم نے کیوں تکلیف کی۔''

''نہیں صاحب جی! یہ تو میرا فرض ہے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں۔ یوں بھی آپ میری بازغہ بی بی کے۔۔۔'' وہ چپ سی ہو گئی۔

شیراز بھی چپ رہا۔ کتنی محبت تھی بازغہ کے لیے اس کے دل میں۔ وہ پھر بول اٹھی۔

''آپ پڑھنے میں مصروف تھے۔ وہ تو جب میں نے دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو میں نے آپ کو بلا لیا۔ ویسے پتہ نہیں آپ نے کتنی بار اپنے آنسو صاف کیے ہیں۔ لیکن مجھ میں ہمت نہیں پڑی تھی کہ۔۔۔'' سعیدہ محبت سے کہتے ہوئے ایک دم چپ ہو گئی۔

شیراز کا اس بوڑھی نوکرانی کے بے لوث انداز محبت پر قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔

سعیدہ پھر بولی: ''صاحب جی ویسے یہ آپ کیا پڑھ رہے تھے۔ کیا بازغہ بی بی کا کچھ لکھا ہوا ہے؟''

''ہاں! اس نے اپنی کہانی لکھی تھی۔''

''کہانی۔۔۔ ہاں! یاد آیا، وہ کچھ لکھا کرتی تھیں، لیکن میں تو پڑھ نہیں سکتی۔''

''تمہیں کسی دن پڑھ کر سناؤں گا۔ ابھی تو میں نے خود بھی مکمل نہیں پڑھی۔ ہمت ہی نہیں پڑ رہی آگے پڑھنے کی۔''

''جی! اس کا تو سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔'' سعیدہ کی آنکھوں سے پھر آنسو بہہ نکلے۔

''شیراز۔۔۔ شیراز! یہاں کیا کر رہے ہو؟'' بیگم قدوس ایک دم وہاں آ گئیں۔

وہ بنچ سے اٹھ گیا۔ بیگم قدوس نے سعیدہ کی طرف دیکھا۔ ''تم یہاں کیسے؟'' وہ اس کی حالت کا اندازہ لگا رہی تھیں اور انہیں کچھ تعجب سا ہو رہا تھا۔

''جی بیگم صاحبہ! میں صاحب کو بلانے آئی تھی۔''

''کیوں؟ کیا یہ صبح ہی صبح۔۔۔'' انہیں کچھ خیال آیا۔ ''ابھی تو ناشتے کا وقت بھی نہیں ہوا تم سے کس نے کہا انہیں بلانے کو؟'' بیگم قدوس کے تیور کڑے ہو گئے۔

''جی یہ ٹھنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندر سے گرم شال لے کر آئی تھی۔'' سعیدہ نے ڈر ڈر کر جواب دیا۔

اور اسی وقت شیراز نے دیکھا کہ گرم شال اس کے کندھوں پر تھی اور وہ یہاں رات کو ٹھنڈ میں شال کے بغیر ہی یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں اس نے کس وقت اس کے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سوچا۔ یہ اس کی ڈیوٹی تو نہیں تھی۔ وہ تو اس گھر میں خانہ داری کے فرائض انجام دیتی ہے اور اسی کے پیسے اس کو ملتے ہیں۔ سعیدہ کی شفقت دیکھ کر اس کے دل میں اس کے لیے محبت ہی محبت بھر گئی تھی۔

''اچھا چلو! باتیں نہ بناؤ! کچن میں چل کر ناشتے کی تیاری کرو۔'' بیگم قدوس نے اسے حکم دیا۔ سعیدہ چپکے سے اندر چلی گئی۔

بیگم قدوس نے شیراز کی طرف دیکھا اور سنگ مرمر کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ پھر شیراز سے کہا کہ میرے پاس آ کر بیٹھو!

''جی ممی!'' وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔

بیگم قدوس نے اسے محبت سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اور اسی لمحے شیراز ان کی گود میں سر رکھے پھر رونے لگا۔ بیگم قدوس اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہیں۔ وہ چپ ہوا تو بیگم قدوس نے کہا۔

''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم ساری رات یہاں بیٹھے رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس کی گواہی دے رہی ہیں۔'' انہوں نے اس کا سر اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''جی ممی!''

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے بنچ پر پڑے کاغذوں کے پلندے کی طرف اشارہ کیا۔

بیگم قدوس نے اسے اٹھایا اور ورق پلٹ کر مختلف جگہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''کیا یہ بازغہ کی تحریر ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ممی!'' اس نے ادب سے کہا۔

''کیا لکھا ہے۔۔۔ یہی پڑھ رہے تھے کیا؟''

''جی!''

''اس پاگل نے کیا لکھا ہوگا۔'' بیگم قدوس کے ماتھے پر تیوری سی پڑ گئی۔

اب شیراز سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے وہ پلندہ ان کے ہاتھ سے لیا اور جہاں تک پڑھا تھا۔ وہاں سے وہ حصہ الگ کر لیا جو ابھی وہ نہیں پڑھ سکا تھا۔

''ممی! آپ سے ایک درخواست ہے؟'' شیراز نے ادب سے کہا۔

''ہاں ہاں کہو! میں تمہاری ماں ہوں، جو بھی دل چاہے کہو۔'' وہ اس کی حالت کا اندازہ کر رہی تھیں۔

''یہ حصہ آپ رکھ لیں اور اسے آج کسی وقت آرام سے شروع سے لے کر آخر تک پڑھیے۔ لیکن خدا کے لیے اسے پھاڑیے گا مت، ورنہ میں یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔''

وہ بیٹے کا منہ دیکھنے لگیں۔ ''اتنی بڑی شرط اور وہ بھی اپنی ماں سے۔۔۔ آخر اس میں کیا ہے؟''

''بس میں یہی کہوں گا کہ جو میں نے درخواست کی ہے، اس پر عمل کیجیے گا۔''

''کیا اس میں اس نے اپنی ذاتی کہانی تحریر کی ہے؟'' بیگم قدوس نے پوچھا۔

''ہاں ممی! لیکن ایسی کہانی جو والدین بھی بڑے فخر سے پڑھ سکتے ہیں۔ بہت پاکیزہ فطرت تھی وہ۔۔۔'' شیراز کی آنکھوں سے پھر آنسو چھلک اٹھے۔ ساری رات روتے گزر گئی تھی لیکن اس کے دل میں تو جیسے یادوں کا سمندر بھرا ہوا تھا۔ خشک ہی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے پر بیگم قدوس موجود نہیں تھیں۔ قدوس صاحب نے کسی سے نظر نہیں ملائی۔ بس ایک دو لقمے لیے اور بیگم قدوس کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ ساریہ نے شیراز سے پوچھا:

''خیر تو ہے؟ آج ممی ناشتے پر نہیں آئیں، اور ڈیڈی نے بھی پوری طرح ناشتہ نہیں کیا۔''

شیراز خاموش رہا۔

''تم جواب کیوں نہیں دیتے۔ جب سے میں آئی ہوں، ایسا پہلی بار ہوا ہے۔''

''شاید ممی کی طبیعت نہ ٹھیک ہو۔''

''تو پھر آؤ چلتے ہیں، ان کو دیکھنے کے لیے۔'' ساریہ نے کہا۔

''تم چلی جاؤ، میں یہاں بیٹھا ہوں۔''

''کیوں؟''

''میری ہمت نہیں ہو رہی۔''

''بھئی آخر ایسی کیا بات ہے؟'' وہ حیران پریشان تھی۔

''بس تم جاؤ نا!'' شیراز نے سختی سے کہا۔

وہ اٹھ کر بیگم قدوس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے بعد شیراز بھی وہاں سے اٹھ گیا۔

ساریہ جب ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو بیگم قدوس اپنے بیڈ پر نیم دراز تھیں اور قدوس صاحب اسے تسلی دے رہے تھے۔

''مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا۔'' وہ کہتے ہوئے رو رہی تھیں۔ ''اپنے بیٹے کی خوشیوں کی میں ہی قاتل ہوں اور اس بدنصیب کی بھی۔''

''بس اللہ کی مرضی تھی اسی میں۔'' قدوس صاحب کہہ رہے تھے۔ ہمارے گھر میں اللہ نے شیراز کے لیے جنت کی حور اتاری تھی۔ لیکن ہماری ناسمجھی کی وجہ سے اللہ نے اسے واپس بلا لیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔''

''شاید ہماری بیٹی کوئی نہیں، اس لیے ہم اس کے جذبات کو سمجھ نہ سکے۔'' بیگم قدوس پچھتاوے سے بول رہی تھیں۔

ساریہ نے ان کی باتیں سنیں تو سکتے میں آ گئی۔ تو گویا ابھی تک بازغہ کو یاد کیا جا رہا ہے۔ اس پاگل کو جس نے اس گھر کا سکون برباد کیا تھا۔ آخر وہ کہے بغیر نہ رہی۔

''ممی اس پاگل کے لیے آپ کے دل میں اب بھی محبت موجود ہے؟''

بیگم قدوس نے ساریہ کو دیکھا۔ کچھ ناگواری کے آثار سے تھے اس کے چہرے پر۔

''بیٹا! تم نہیں جانتی وہ کیا تھی۔'' بیگم قدوس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے۔

ساریہ کو اپنا سینہ جذبۂ رقابت سے جلتا ہوا محسوس ہوا۔ ''جانتی ہوں میں، وہ پاگل تھی، اس نے اس گھر کی خوشیوں کو برباد کر دیا تھا، آپ کی خوشیوں کو پامال کرنے پر تل گئی تھی۔''

''آہ بیٹا! یہی تو ہم سے غلطی ہو گئی اس کے بارے میں۔'' قدوس صاحب گویا ہوئے۔

''تو کیا؟'' ساریہ چپ سی ہو گئی۔

''ہاں بیٹا! وہ پاگل نہیں تھی۔ اس نے اس گھر کی خوشیوں کے لیے قربانی دی تھی۔ شیراز اسے طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے پاگل پن کا مظاہرہ کر کے شیراز کے دل میں اپنے لیے مایوسی اور نفرت کا بیج بویا تھا، تاکہ وہ تم سے شادی کر سکے۔ ہماری خوشیوں کا سامان فراہم کر سکے۔'' قدوس صاحب کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

ساریہ حیران سی رہ گئی۔ ''یہ سب آپ کو اب آ کر کیسے معلوم ہوا۔''

''لو بیٹا! تم بھی اسے پڑھ لو!'' قدوس صاحب نے کاغذوں کا وہ حصہ جو شیراز نے بیگم قدوس کے حوالے کیا تھا اس کی جانب بڑھا دیا۔ ''ہم دونوں نے اسے مل کر پڑھا ہے۔'' اس کا باقی حصہ شیراز کے پاس ہے جو شاید ابھی اس نے بھی نہیں پڑھا ہو گا۔ لیکن اسے ضائع مت کرنا۔''

''جی اچھا!'' ساریہ نے قدوس صاحب سے وہ حصہ لے لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

شیراز شاید دفتر جا چکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر نیم دراز ہوگئی اور تیزی سے بازغہ کے لکھے ہوئے حرفوں پر اس کی نظریں دوڑنے لگیں۔

پچھلے پہر ساریہ نے شیراز کو فون کیا۔

''ہیلو شیراز!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو!''

''بازغہ کی لکھی ہوئی کہانی کا باقی حصہ کہاں ہے؟''

''باقی حصہ؟۔۔۔کیا مطلب، پہلا حصہ تمہارے تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟''

''ڈیڈی ممی نے پڑھنے کو دیا ہے، تم فکر نہ کرو، میں نے پڑھ لیا ہے۔'' اس نے شیراز کو تسلی دی۔ ''اسے آنچ بھی نہیں آئے گی۔ میں تم سے زیادہ اس کی حفاظت کر سکتی ہوں۔ میں اس عظیم عورت کی داستان کا باقی حصہ فوراً پڑھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم بتاؤ گے، کہاں ہے وہ؟''

''ہاں۔۔۔کتابوں کی الماری کے اوپر ایک فائل میں پڑی ہے، اسی میں ہے۔''

''تم نے پڑھ لیا؟''

''ہاں میں نے رات ہی پڑھ لیا تھا۔ لیکن تم اسے کہیں ضائع نہ کر دینا۔ میں اسے چھپوانا چاہتا ہوں۔ یہی تو ایک یادگار ہے اس کی میرے پاس۔'' شیراز نے سختی سے کہا۔

اور اگلے چند لمحوں میں ساریہ ایک عجیب جذبے کے ساتھ محبت کے ان دیکھے جذبوں کی صداقت اور احساس کے نئے رنگوں میں اترتی چلی گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

اس نے اردگرد نظر دوڑائی تو شام کا اجالا رات کی تاریکی میں جذب ہو چکا تھا اور ہوا میں خنکی سی ہوگئی تھی۔ مگر اسے احساس ہی نہ ہوا کہ دن کب گزر گیا۔ سعیدہ کتیا کے بچے کو اٹھا کر نہ جانے کہاں چھپا آئی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ بہت لٹی پٹی سی لگ رہی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو کر اپنے بستر پر گر گئی اور پھر آنسوؤں کا سیلاب جو بہا تو ایک گھنٹے تک رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ دوپہر کھانے پر بھی نہیں گئی۔ جی ہی نہیں چاہ رہا تھا کھانے کو۔ سعیدہ اسے بلانے آئی تو اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس بری طرح گھورا کہ بیچاری گھبرا کر فوراً چلی گئی۔ سارا دن وہ یونہی پڑی رہی۔ وحشتیں طاری کیے، دیوانگی لیے۔

شام کو شیراز آفس سے واپس آیا تو اسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''یہ کیا ہو گیا تمہیں؟ آج یہ تم نے کیا کر دیا؟ ممی نے آتے ہی میرا جینا دوبھر کر دیا تھا۔'' وہ حیرت سے بولا۔

وہ چپ رہی۔

''سر میں درد رہا تمام دن کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بازغہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''گولی سے فائدہ نہیں ہوا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے کھائی ہی نہیں تھی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیوں؟'' ایک دم شیراز کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''بس ایسے ہی۔'' وہ بولی۔

''تکلیف اٹھانے میں مزا آ رہا تھا کیا؟'' شیراز جلے جلے لہجے میں بولا۔

''ہاں! بہت۔'' دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

''اذیت پسند کب سے ہو گئیں؟'' شیراز نے کہا۔

''آج ہی سے۔'' وہ بولی۔

''اور آج ہی سے تمہیں یہ مرض ختم بھی کرنا ہوگا۔'' شیراز نے کہا۔

''کون سا مرض؟'' وہ بولی۔

''اذیت پسندی کا۔'' شیراز نے کہا۔

''یہ مرض اب ختم نہیں ہو سکتا شیراز!'' بازغہ نے دکھتے دل سے سوچا۔ ''میں نے اپنی سزا تجویز کر لی ہے۔''

''ڈاکٹر کے ہاں چلتے ہیں۔'' اسے خاموش دیکھ کر شیراز نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''کیوں نہیں ہے ضرورت، ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو، کیا بنا رکھا ہے۔'' وہ چڑ سا گیا۔

بہت دکھی سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر آ گئی۔

''چلو! جلدی کرو!'' وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

''مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔'' بازغہ نے کہا۔

''کیوں نہیں جانا؟'' اس نے پوچھا۔

''تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو، معمولی درد ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''تمہیں نہیں معلوم، تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

''ایسی تکلیفیں اٹھانے کی عادت ڈالو شیراز! کہ یہی تکلیفیں تمہیں خوشیاں دے سکتی ہیں۔'' بازغہ نے دل میں کہا۔

''تمہیں کچھ احساس نہیں ہے میرا؟'' شیراز نے کہا۔

''تمہارا ہی تو احساس کر رہی ہوں، تمہاری آرزوؤں کا، جذبوں کا، تمناؤں کا، ارمانوں کا ہی تو احساس ہو گیا ہے مجھے۔'' بازغہ سوچ رہی تھی۔

''بولو!'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''یہی سمجھ لو!'' بازغہ نے جان چھڑا لی۔

رات کھانے کی میز پر صرف وہ دونوں ہی تھے۔ ممی اور ڈیڈی کسی ڈنر میں گئے ہوئے تھے۔ بازغہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ شیراز نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا کیا بتا رہا تھا۔ وہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ کئی چیزیں ایک ساتھ پلیٹ میں نکال لی تھیں۔ نمک کی شیشی پوری انڈیل لی تھی۔ گرم مصالحے کی شیشی آدھی خالی کر دی تھی۔ کانٹے اور چمچ سے چاول کھانے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھی۔ وہ سب کچھ اسے دکھانا چاہتی تھی لیکن وہ دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ شیراز نہ جانے کن خیالوں میں بولے جا رہا تھا۔ پھر یکدم شیراز کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔

''کیا چاول کھانے کا کوئی نیا تجربہ کر رہی ہو؟'' وہ بولا۔ بازغہ چپ رہی۔

''صبح تک بھی نہیں کھا سکو گی۔'' شیراز نے دھیرے سے کانٹا اس کے ہاتھ سے لے کر چمچ پکڑا دیا۔

بازغہ نے دوبارہ کانٹا اٹھا لیا۔ تب ہی شیراز کی نظر اس کی بنائی ہوئی دوسری پلیٹ پر پڑی۔

''ارے یہ کیا؟'' وہ حیران حیران سا بولا۔

پھر اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وحشت سی برس رہی تھی اس کی آنکھوں سے۔

''بازغہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' شیراز پریشان ہوا۔''

بازغہ نے پانی کا جگ اٹھا کر پورا اپنی پلیٹ میں انڈیل لیا۔ ساری میز پر پانی پھیل گیا۔

''بازغہ! کیا کر رہی ہو تم؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

شیراز بے تاب ہو کر چیخا، تب ہی اس نے سالن کا ڈونگا میز پر الٹ دیا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا کیے جا رہی ہو؟'' وہ اپنی کرسی چھوڑ کر تیزی سے بازغہ کی طرف بڑھا۔

اور تب سب کچھ بازغہ کے اختیار سے باہر ہونے لگا۔ دھواں بھرنے لگا دماغ میں۔ دل میں دکھ کی لہریں اٹھنے لگیں۔ بہت زور کا چکر آیا اور نڈھال ہو کر اس نے میز پر اپنے آپ کو گرا لیا۔

''بازغہ!'' شیراز اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کی بے تابیاں، بے قراریاں دیکھ رہی تھی لیکن کچھ نہیں بول سکتی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ عجیب بے بسی طاری تھی پورے وجود پر۔

''چلو یہاں سے!'' شیراز نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ بے سوچے سمجھے شیراز نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تو اس میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ اور پھر سہارا دے کر وہ اسے کمرے تک لے آیا۔

بڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی اور شیراز چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بند کیے کیے آنکھیں دکھنے لگیں تو اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

''بازغہ!'' اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر شیراز نے دھیرے سے پکارا۔

''ہوں!'' اس نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری!'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہوں!'' بازغہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شیراز خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' بازغہ نے طویل خاموشی کو توڑا۔

''سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا۔'' وہ فکر مند سے لہجے میں بولا۔

''مجھے کیا ہو گیا تھا؟'' بازغہ نے حیرانی ظاہر کی۔

''تم اتنی عجیب حرکتیں کیوں کر رہی تھیں۔'' وہ بولا۔

''کب؟'' وہ انجان سی بن گئی۔

''کھانے کی میز پر۔'' شیراز نے بتایا۔

''کھانے کی میز پر؟ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' وہ بدستور حیرت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''تمہیں کچھ یاد نہیں ہے کیا؟'' شیراز نے کہا۔

''نہیں، مجھے تو پتہ ہی نہیں ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''اچھا! تو تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟'' افسردگی سے کہتے ہوئے وہ پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔

''کیا کیا تھا میں نے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں کیا تھا، سب میرا وہم تھا۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

بازغہ اس کے اس انداز پر پہلے تو دل میں مسکرائی اور پھر اندر ہی اندر دکھی ہو گئی۔ شیراز اس کے لیے ایک نعمت تھا جسے وہ گنوانے پر تل گئی ہے۔ مگر وہ یہ سب کچھ بھی تو شیراز ہی کے لیے کر رہی تھی۔

دو تین دن یونہی گزر گئے۔ بازغہ نے ہونٹوں پر چپ کی مہر سی لگالی تھی۔ بہت کھوئی کھوئی سی رہنے لگی تھی۔ ہر وقت سوچوں میں ڈوبی گم صم سی۔ بڑی دیر لان میں یونہی ٹہلتی رہتی۔ کبھی کوریڈور میں بے قراری سے چکر لگانے شروع کر دیتی۔ ہر انداز سے، ہر ادا سے بے چینی اور بے قراری ٹپک رہی تھی۔ بہت مضطرب سی نظر آنے لگی تھی وہ۔ شیراز بھی خاصا پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی باتوں کا بھی وہ بہت کم جواب دیتی تھی۔ وہ ہر طرح اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا لیکن وہ تو بہلنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ کیا ملنا تھا اس طرح بہل بہل کر۔

اس صبح آفس جانے کے لیے ہو رہا تھا۔ وہ کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں گیا تو بازغہ نے اٹھ کر الماری میں سے اس کی ٹائی نکال کر اپنے گلے میں لٹکالی اور اسی کے جوتے پہن کر کمرے میں چہل قدمی شروع کر دی۔ شیراز آیا تو اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ کئی لمحے ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ بے نیازی سے چہل قدمی میں مصروف رہی۔ تب ہی وہ آگے بڑھا۔

''تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے بازغہ؟'' دکھی سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر بازغہ کے گلے میں سے ٹائی اتار لی۔

''اچھی لگ رہی ہوں نا!'' وحشت سی مسکراہٹ اس نے لبوں پر سجالی۔

''چلو! جوتے بھی اتار دو۔ مجھے تمہاری دماغی صحت پر شک ہونے لگا ہے۔'' شیراز جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

یہی تو وہ چاہتی تھی۔ ''دماغی صحت؟'' وہ زور سے ہنسی۔ ''یہ کیا ہوتا ہے بھلا؟''

''بازغہ خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو!'' شیراز چیخ اٹھا۔

''میں تو کچھ بھی نہیں کرتی ہوں۔'' وہ جوتے اتار کر دوبارہ مسہری پر لیٹ گئی۔

اس دن شیراز آفس دو گھنٹے دیر سے گیا۔ دو گھنٹے تک وہ وہیں بیٹھ کر اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتا رہا تھا۔ اور جب اتنی دیر تک اس نے کچھ نہیں کیا اور پرسکون انداز میں بیٹھ کر ناشتہ کر لیا۔ اس کی ایک دو باتوں کا بھی ٹھیک ٹھیک جواب دیا، تب وہ آفس چلا گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ مسہری پر لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ زندگی بہت عجیب ڈگر پر چل نکلی تھی۔ قدم قدم کانٹے بکھرے تھے اور وہ اس کانٹوں بھری راہ پر بہت مطمئن سی چل پڑی تھی۔ کانٹے ہی تو لکھے تھے اس کے نصیب میں۔ پھولوں کی آرزوئیں تو نادانی میں ہو گئی تھیں۔ اور اب اس نے اپنے مقدر کے تمام کانٹے اپنے دامن میں سمیٹ کر دوسروں کی جھولی میں ان کے حصے کے پھول ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کانٹوں بھرے راستے کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ کانٹے چبھ چبھ کر اسے لہولہان کر رہے تھے۔ روح میں زخم ڈال رہے تھے۔ چھید رہے تھے دل کو۔ لیکن اس نے پرواہ کرنی چھوڑ دی تھی۔ تکلیفوں کا احساس کرنا ختم کر دیا تھا۔ پتھری بن گئی تھی وہ۔ وحشی وحشی سا ہو گیا تھا دل۔ مضطرب مضطرب سی پھرتی رہتی تھی سارے گھر میں۔

ایسے ہی جیسے کوئی برسوں سے کسی کی تلاش میں ہو۔ اور وہ بھی تو تلاش میں ہی تھی۔ خوشیوں کی تلاش میں، خوشیاں ہی تو ڈھونڈ رہی تھی۔

اگلے دن شیراز کے آفس جانے کے بعد وہ پھر پچھواڑے میں آ گئی۔ کتیا غائب تھی۔ بچہ تنہا پڑا تھا۔ اس نے بچے کو اٹھا لیا اور کھانے کے کمرے میں آ گئی۔ بیگم قدوس ناشتہ کر رہی تھیں۔ اس نے بچے کو میز کے کونے پر بٹھا دیا۔

''بازغہ۔'' بیگم قدوس زور سے چلائیں۔

''ناشتہ کرے گا یہ بھی، اب تو بڑا ہو گیا نا۔'' وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''فوراً ہٹالو اسے یہاں سے، ورنہ میں ابھی اس کا قیمہ کرا دوں گی۔'' بیگم قدوس نے تڑپ کر کھڑے ہوتے ہوئے بپھرے ہوئے انداز میں کہا۔

''بھوکا ہے نا، ناشتہ کرے گا۔'' بازغہ نے پھر وہی بات دہرائی۔

''سعیدہ!'' بیگم قدوس نے زور سے آواز لگائی۔
سعیدہ آگئی اور بازغہ کو دیکھنے لگی۔ بازغہ نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر دکھ سا لرز رہا تھا۔
''اسے اٹھا کر باہر پھینکو۔'' وہ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گرجیں۔
سعیدہ نے لپک کر بچہ میز پر سے اٹھالیا اور جلدی سے باہر چلی گئی۔
''وہ بھوکا تھا آپ نے اسے ناشتہ نہیں کرنے دیا۔'' بازغہ نے طیش میں آکر میز کی چیزیں الٹنی شروع کر دیں۔ وحشت برس رہی تھی، اس کے انداز میں۔
''بازغہ ہوش میں آؤ! پاگل ہوگئی ہو تم!'' بیگم قدوس برابر چلائے جارہی تھیں۔ لیکن اسے پرواہی کب تھی۔ ان کی چائے کی پیالی اوندھا کر وہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔
نہ جانے بیگم قدوس نے شیراز کو اس کے متعلق بتایا تھا یا دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ بازغہ کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔ ویسے ان دنوں وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔
''یہ تمہیں اچانک کیا ہو جاتا ہے؟'' شیراز نے کئی بار پوچھا تھا۔
''مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔'' وہ کہہ دیتی۔
وہ چپ ہو جاتا۔
''تم ہی بتا دو نا، کیا ہو جاتا ہے مجھے؟''
شیراز خاموش تھا۔
کئی دن یونہی گزر گئے تھے۔ وہ کتے کے بچے کو اکثر اپنے ساتھ رکھنے لگی تھی۔ وہ بھی بہت مانوس ہو گیا تھا اس سے۔ اس دن وہ اسے اٹھائے اٹھائے بیگم قدوس کے کمرے میں گئی۔ وہ بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ بازغہ نے بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے ایک دم چونک کر آگے سے کتاب ہٹائی اور کتنے کے بچے کو گود میں پڑے دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔
''بازغہ!'' زور سے کہتے ہوئے انہوں نے بچے کو اٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔
''اتنی سنگدل ہیں آپ۔ اس کے چوٹ لگ گئی ہوگی۔'' اس نے دوبارہ اٹھالیا۔ بچے کو اپنے سینے سے لگائے بے پناہ پیار کرنے لگی۔ لیکن وہ مجبوریوں کے جال میں جکڑی ہوئی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔
''اتنا پیارا تو ہے یہ، اور آپ پیار ہی نہیں کرتیں اسے۔'' وہ بڑبڑانے لگی۔ بیگم قدوس اسے بری طرح گھور رہی تھیں۔ سینے میں چبھی جارہی تھیں ان کی تیز نظریں۔ دل کانپنے سا لگا تھا، لیکن وہ کھڑی رہی۔
''آپ کو بھی پیار نہیں آتا اس پر۔'' وہ بولی۔
انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''لیجیے پیار کر لیجیے نا'' بازغہ نے اس کا منہ بیگم قدوس کے چہرے کے بالکل قریب کر دیا۔
''ہٹاؤ اسے۔'' انہوں نے ہاتھ سے اسے دور کرتے ہوئے کہا۔
''کر لیجیے نا! دیکھیے کیسی معصومیت سے آپ کو دیکھ رہا ہے۔'' بازغہ بولی۔
''بازغہ! میں کہتی ہوں کہ تم اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤ'' وہ تحکمانہ انداز میں بولیں۔
''تھوڑی دیر تو بیٹھنے دیجیے نا، یہ تو آپ سے ملنے آیا ہے۔'' بازغہ نے کہا۔
''جاؤ اب تم!'' وہ زور سے گرجیں۔ بازغہ وہیں کھڑی اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتی رہی۔
''دماغ خراب ہوتا جارہا ہے تمہارا تو۔'' وہ بڑبڑائیں۔
''ناراض ہو رہی ہیں تو جاتے ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ ان کے کمرے سے نکل آئی۔
دوسرے دن وہ پچھواڑے کی طرف گئی تو کتیا کا گھر خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں کہیں غائب تھے۔ بازغہ ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ قریب ہی صدیق درختوں کی کانٹ چھانٹ میں لگا ہوا تھا۔
''کیا ڈھونڈ رہی ہیں چھوٹی بیگم؟'' اسے پریشان دیکھ کر وہ بولا۔
''یہ دونوں کہاں ہیں؟'' اس نے خالی گھر کی طرف اشارہ کیا۔
''انہیں تو بیگم صاحبہ نے کہیں بھجوا دیا ہے۔'' صدیق نے بتایا۔
''کہاں؟'' وہ بولی۔
''مجھے تو پتہ نہیں، شاید کہیں بہت دور۔'' اس نے کہا۔
''اچھا!'' وہ وہاں سے آگئی۔
شام کو شیراز آفس سے واپس آیا تو وہ بہت بے قراری سے گھوم رہی تھی۔ وحشتیں ناچ رہی تھیں اس کی آنکھوں میں۔
شیراز پریشان سا ہو گیا۔ حسب معمول اس کے لبوں پر وہی ایک سوال تھا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''انہوں نے اسے چھین لیا'' وہ روٹھے انداز میں بولی۔

''کسے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''میرے بچے کو۔'' وہ بولی۔

''تمہارا بچہ؟'' شیراز کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''میرا ہی تو تھا۔'' وہ بولی۔

''کہاں سے آ گیا بھئی؟'' وہ بولا۔

''پچھواڑے رہتا تھا نا، کتنا پیارا تھا۔''

''اف خدایا۔'' شیراز نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''تمہیں نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانا ہی پڑے گا۔'' اپنا سر پکڑے پکڑے وہ زیر لب بولا۔

''میں انہیں نہیں چھوڑوں گی، انہیں لا کر دینا پڑے گا اسے، چاہے کہیں سے بھی لائیں۔'' وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ کوریڈور ہی میں بیگم قدوس مل گئیں۔

''کہاں بھیجا ہے آپ نے اسے؟'' بازغہ نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑو میرا ہاتھ۔'' وہ ہاتھ چھڑانے لگیں۔

''پہلے بتایئے، آپ اتنی ظالم کیوں ہیں۔'' وحشت ناک انداز تھا اس کا۔

''بازغہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' بیگم قدوس کا لہجہ اچانک ہی نرم پڑ گیا۔

''آپ نے سب کچھ چھین لیا ہے میرا۔'' وہ بولی۔

''میں نے کچھ بھی نہیں چھینا تم سے۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں، آپ نے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اب اسے بھی لے لیا۔'' بازغہ نے کہا۔

''اب میں آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے تیور بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ آنکھوں میں وحشتیں ناچ رہی تھیں۔ بیگم قدوس پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''کہاں گیا ہے وہ؟'' جنونی انداز میں اس نے اپنے ہاتھ ان کی گردن پر رکھ دیئے۔

''کیوں چھینا ہے اسے؟'' بازغہ نے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا اس کے لیے۔ اس کے دل میں بیگم قدوس کی بہت محبت تھی، بے پناہ احترام تھا اس کے دل میں۔ لیکن اب کیا کرنا پڑ رہا تھا ان کے ساتھ۔

''اف خدایا۔'' سوچتے ہوئے بازغہ کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔ ندامت کا طوفان سا اٹھنے لگا تھا دل میں۔ پشیمانی کے بادل امڈ رہے تھے۔ جی بیٹھا جا رہا تھا لیکن وہ یہ سب کچھ دیوانہ وار کیے جا رہی تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ یہ ناٹک کب تک جاری رہے گا۔ لیکن ایک امید سی تھی کہ یہ سب کچھ جلد ختم ہو جائے گا۔ اس گھر کے مکین شاید جلد ہی اس سے مایوس ہو جائیں گے۔

''تم پاگل ہو گئی ہو، چھوڑو میری گردن۔'' وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

تب ہی شیراز آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

''انہوں نے اسے کیوں چھینا ہے، میں انہیں نہیں چھوڑوں گی۔'' بازغہ چلائی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، جلدی چھوڑو۔'' وہ شدید غصے کی کیفیت میں بولا۔

''نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

''چھوڑو!'' شیراز ان کی گردن اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بہت مضبوط تھی اس کی گرفت۔ بیگم قدوس کی آنکھیں پھٹنے سی لگی تھیں۔

''بازغہ ہوش میں آؤ!'' وہ چلایا۔

بازغہ نے بیگم قدوس کی گردن چھوڑ دی تو وہ شیراز پر جھپٹ پڑی۔ لمبے ناخنوں سے کئی خراشیں شیراز کے ہاتھوں پر ڈال دی تھیں۔ اپنوں کو زخم لگانا کتنا مشکل کام ہے، آج اس کا اندازہ ہوا تھا۔ شیراز کے تو ہاتھ ہی زخمی ہوئے تھے لیکن خود بازغہ کے دل میں تو گھاؤ سے پڑ گئے تھے، خون بہنے لگا تھا زخم دل سے۔

شیراز نے سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کمرے میں لے آیا۔

وہ بے دم سی ہو کر مسہری پر گر گئی تھی۔ بڑی دیر وہ یونہی نڈھال نڈھال سی پڑی رہی۔ اور پھر دھیرے دھیرے سکون سا آیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

شیراز سامنے بیٹھا اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہارے ہاتھوں کے زخم تو مندمل ہو جائیں گے شیراز! لیکن میرے دل میں جو گھاؤ لگے ہیں وہ تو شاید کبھی نہ بھر سکیں۔ میری روح کا زخم تو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ آہ! تمہیں زخمی کر دینے کی خلش تمام عمر دل میں رہے گی۔ بازغہ سوچ رہی تھی۔ اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر شیراز نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں تھا۔ بس چند لمحے دیکھتے رہنے کے بعد نگاہیں ہٹالی تھیں۔

بہت دکھ ہوا ہوگا تمہیں شیراز! لیکن یہ دکھ تو تمہیں خوشیوں کے راستے پر لے جائے گا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ غموں کا راستہ پار کرنے کے بعد خوشیوں کی منزل آتی ہے۔ تم بھی یہ راستہ پار کر لو گے تو تمہیں خوشیوں اور آرزوؤں کی منزل مل جائے گی۔ پھر تم سب دکھوں کو بھول جاؤ گے۔ تمہارے سارے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ بازغہ چپ چاپ لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔

بڑی دیر یونہی گزر گئی تھی۔ شیراز باہر جا چکا تھا۔ شام سے رات ہو گئی۔ اس طرح پڑے پڑے، اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہا۔ کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ لیکن اجالا کرنے کو جی ہی نہیں چاہا، کہ روشنیاں اس کے مقدر میں نہیں تھیں۔ اس کا نصیب تو غموں کی سیاہی سے لکھا گیا تھا شاید۔ وہ اندھیروں ہی میں جینا چاہتی تھی۔ اپنے حصے کی روشنی دوسرے کو دے کر ہی تو انسان ابدی سکون پا سکتا ہے اور اس نے بھی دوسروں کی راہوں میں روشنی بکھیرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شیراز آ گیا۔

اس نے آتے ہی لائٹ جلائی اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہ رہا تھا۔

بازغہ اٹھ بیٹھی۔ ''تم کہاں تھے؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''باہر گیا تھا۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' بازغہ کا لہجہ حسب معمول تھا۔ ویسے ہی اپنائیت میں بھرپور لہجہ۔

''کیوں؟'' اسے بولتا دیکھ کر وہ کچھ مطمئن سا نظر آیا تھا۔

''بھوک لگ رہی تھی، اب تو خاصا وقت ہو چکا ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''چلو پھر، کھانا کھا لیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

وہ دونوں ڈرائینگ روم میں آ گئے۔

شیراز نے سعیدہ کو دیکھا تو اس سے کہا: ''ممی، ڈیڈی کو بھی بلا لاؤ۔''

''انہوں نے کچھ دیر پہلے کھا لیا ہے۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''اچھا!'' شیراز بولا۔

کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ دونوں ہی چپ تھے۔ دونوں ہی نہیں بول رہے تھے۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئے تو شیراز کی خاموشی سے بازغہ کو الجھن سی ہونے لگی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا شیراز اس سے شکوہ کرے، اس سے پوچھے، اس کو سب بتائے لیکن وہ تو بالکل چپ تھا۔ تب اس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

''شیراز!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔ شیراز نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ تم اتنے خاموش کیوں ہو، کوئی پریشانی ہے کیا؟'' بازغہ کا لہجہ بہت ملائم تھا۔

''نہیں! کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''پھر کیا بات ہے؟'' بازغہ نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' شیراز بولا۔

''مجھ سے چھپا رہے ہو کیا؟'' اس کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا۔

''تم سے بھلا کیا چھپاؤں گا۔'' شیراز بولا۔

''پھر بتاتے کیوں نہیں؟'' اس کا اصرار بڑھا۔

''کیا بتاؤں بھئی!'' وہ بولا۔

''یہی کہ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' بازغہ نے کہا۔

''تمہاری دیوانگی مجھے دیوانہ بنا رہی ہے۔'' وہ جلے بھنے انداز میں بولا۔

''میری دیوانگی؟'' بازغہ حیرت سے بولی۔

''کتنی دفعہ سمجھایا تھا کہ تمہیں کوئی غم پالنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم نے روگ پال ہی لیا نا!'' وہ جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا؟ کچھ تو بتاؤ نا!'' بازغہ نے کہا۔

''یہ دیکھو!'' اس نے اپنے ہاتھ اس کے آگے کر دیئے۔ بازغہ کا دل بیٹھنے سا لگا۔

''کیسے ہوا یہ؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''تمہیں کچھ یاد نہیں ہے کیا؟'' وہ بولا۔

''نہیں!'' بازغہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''یہ خراشیں تم نے ڈالی ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں نے؟'' بازغہ نے لہجے میں حیرت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، خدا جانے تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔'' شیراز کا لہجہ افسردہ تھا۔

''بتاؤ نا، مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔'' وہ بولی۔

''بس کبھی کبھی دیوانگی کا دورہ سا پڑ جاتا ہے تمہیں۔'' شیراز کی آواز میں درد تھا۔

''اف خدایا! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' بازغہ نے اپنا سر تھام لیا۔

''ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔'' بہت اداس نظر آ رہا تھا وہ۔

''نہیں شیراز، یہ نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''ہاں! یہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ٹائم لے لیا ہے۔ کل شام ہم ان کے پاس چلیں گے۔'' شیراز نے بتایا۔

''کیا وہیں جہاں ایک بار پہلے گئے تھے ہم؟''

ہاں! بہت خوب، تمہیں یاد ہے۔ انہی کے پاس۔''

''انہوں نے اس وقت کیا بتایا تھا؟''

''کچھ نہیں۔۔۔اس وقت کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''آخر تم وہاں مجھے کیوں لے کر گئے تھے؟'' بازغہ نے زور دے کر پوچھا۔ وہ سب کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

''سچ بتاؤں؟''

''ہاں سچ بتاؤ!'' اس کی بات سے بازغہ کچھ اندر سے ڈر سی گئی۔

''تمہاری لیڈی ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا ان کے پاس جانے کا۔''

تو اس کا مطلب ہے کہ کچھ حقیقت ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اس نے یونہی اپنا جائزہ لیا کہ کیا واقعی میں ناٹک کر رہی ہوں۔ کہیں یہ حقیقت ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس حال میں اس کا شعور تو بحال رہتا تھا اور دیدہ دانستہ سب کچھ کر رہی ہوتی تھی اور ردعمل کو بھی پوری طرح محسوس کرتی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' شیراز نے حیرت سے پوچھا۔

''بس یونہی۔ تم نے بتایا نہیں کہ اس وقت ڈاکٹر نے کیا بتایا تھا تمہیں جو تم نے مجھ سے اوجھل رکھا۔'' بازغہ نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ تمہیں شیزوفرینیا کے مرض کا خطرہ لاحق ہے۔'' شیراز نے بتایا۔

''وہ کیا مرض ہوتا ہے؟'' بازغہ نے حیرت سے پوچھا۔

''دماغ کی ایسی حالت واقعی ہو جاتی ہے کہ مریض کے سر میں جو بھی سودا سمائے وہ اس پر عمل کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک قسم کا ادھورا پاگل پن بھی کہہ سکتے ہیں اسے۔''

''اوہ!'' بازغہ نے پریشانی ظاہر کی۔

''اور تم میں یہ کیفیت کبھی کبھی ہونے لگی ہے۔'' شیراز نے یقین کے لہجے میں کہا۔ ''اس لیے اپنے آپ کو خوش و خرم رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا کرو۔''

''اچھا!'' بازغہ نے روبوٹ کی طرح سر ہلا دیا۔

☆☆☆

☆☆☆

شیراز آفس میں تھا کہ بازغہ نے موقع غنیمت جانا۔ وہ سیڑھیوں سے تیزی سے نیچے اترتے چلی گئی اور آخری سٹیپ پر آ کر اپنے آپ کو اس انداز میں نیچے گرا لیا جیسے اسے کوئی دورہ پڑا ہو۔

بیگم قدوس ہال میں بیٹھی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی سعیدہ کو آواز دی۔ اور خود بھی بازغہ کے سر پر پہنچ گئیں۔ بازغہ بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ سعیدہ جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی اور اس کے منہ میں پانی کے قطرے ٹپکانے شروع کر دیے۔ وہ جلد ہی اٹھ کر وہیں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے آس پاس دیکھا۔ بیگم قدوس نے اسے بتایا کہ وہ نیچے آتے ہوئے گر گئی تھی۔

''اب کیسی ہے تمہاری حالت؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی ٹھیک ہوں۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوجاتا ہے۔'' اس نے بظاہر بے بسی سے کہا۔

چار بجے شام شیراز آفس سے واپس آگیا تو بیگم قدوس ہال ہی میں تھیں۔ سعیدہ بھی ان کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آتے ہی بیگم قدوس کو سلام کیا اور پھر بازغہ کا حال پوچھا:

''آج کا دن خیریت سے گزرا ہے نا ممی؟''

''نہیں بیٹا! آج پھر اسے دورہ پڑا تھا اور وہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی لیکن حیرت ہے کہ آج اس نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ اب وہ اپنے بیڈروم میں ہے۔'' بیگم قدوس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''وہ ٹھیک تو ہے نا! اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟'' شیراز نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہاں صاحب جی! بیگم صاحبہ بالکل ٹھیک ہیں۔'' سعیدہ نے اسے بتایا۔

''تو پھر اسے یہاں بلالاؤ، ہم پانچ بجے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے۔'' شیراز نے کہا۔

سعیدہ اوپر گئی اور پھر کچھ دیر میں بازغہ اس کے ساتھ نیچے آگئی۔

شیراز نے اس کی حالت کا جائزہ لیا۔ وہ اس وقت بظاہر ٹھیک نظر آرہی تھی۔

شیراز نے پوچھا: ''کیا حال ہے تمہارا؟''

بازغہ نے شیراز کی طرف دیکھا اور مسکرادی۔

''ٹھیک ہوں۔۔۔!''

''ڈاکٹر صاحب سے پانچ بجے کا وقت لیا تھا۔ تو کیا خیال ہے، چلیں؟'' شیراز نے نرم لہجے میں پوچھا۔

بازغہ نے بیگم قدوس کی طرف دیکھا تو وہ خاموش تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ گاڑی میں تھے اور اگلے آدھے گھنٹے میں وہ متوقع مقام پر پہنچ گئے۔

شیراز نے فائل چپراسی کے ہاتھ اندر روانہ کردی۔ چپراسی نے باہر آکر انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔

رسمی سلام دعا کے بعد انہوں نے رسمی سے سوالات شروع کردیے تھے، اور وہ بالکل ٹھیک جواب دے رہی تھی۔

''دورہ ختم ہونے کے بعد آپ کو اس کے متعلق کچھ یاد رہتا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے تو بالکل یاد نہیں رہتا۔'' بازغہ نے بتایا۔

''شروع ہونے سے قبل آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟'' ڈاکٹر شفیق نے پوچھا۔

''صحیح تو مجھے یاد نہیں، بس اتنا خیال ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔ سانس لینی مشکل ہوتی ہے اور پھر مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔'' اس نے بتایا۔

''جب انسانی خواہشوں اور تقدیروں کے درمیان تصادم ہوتا ہے تو اکثر ایسے ہی حادثات رونما ہوجاتے ہیں۔'' ڈاکٹر شفیق نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب مجھے بچے کی خواہش اتنی شدید بھی نہیں کہ۔۔۔'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لاشعور میں تو یہ خواہش ہے نا، اور جب شدت اختیار کرتی ہے یہ خواہش شعور پر غالب آجاتی ہے اور پھر آپ کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔'' انہوں نے سمجھایا۔

بازغہ خاموش تھی۔ مزید اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

''احساس محرومی، تشنہ آرزوئیں، کچلی ہوئی خواہشیں، یہی سب چیزیں ایسے دوروں کا سبب بنتی ہیں۔'' ڈاکٹر شفیق نے کہا۔

''یہ دورے ختم ہوسکتے ہیں کیا؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''ہاں! اگر انسان ان سب چیزوں پر قابو پانے کی کوشش کرے تو پھر یہ دورے دوبارہ پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں اپنے جذبات اور خواہشوں پر قابو پانے کی پوری کوشش کروں گی۔'' وہ عزم سے بولی۔

''شاباش بیٹا! اگر آپ نے تھوڑی سی بھی کوشش کرلی تو پھر آپ بہت جلد بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' انہوں نے کہا۔

''جی!'' بازغہ بولی۔

''یہ میں کچھ دوائیں وغیرہ لکھ دیتا ہوں، آپ جب بھی اپنے آپ پر کسی قسم کا دباؤ محسوس کریں، یہ کھا لیجیے گا۔ ان کے استعمال سے انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ سکون آور ہیں یہ سب، سکون پہنچاتی ہیں۔'' ڈاکٹر شفیق نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

اور کچھ دیر بعد وہ وہاں سے واپس آگئے۔ شیراز نے راستے میں پھر ریس کورس پارک کی طرف جانا چاہا لیکن اچانک اسے اس دن کا واقعہ یاد آگیا۔ اس نے یہ ارادہ ترک کردیا۔

جب کوئی خود ہی اچھا نہ ہونا چاہے تو کوئی چیز بھی اسے صحت نہیں بخش سکتی۔ بازغہ نے ایک بھی گولی اپنے منہ میں نہ ڈالی۔ وقت کے مطابق وہ بڑی احتیاط سے دوا واش روم میں بہا دیتی تھی۔ شیراز کے پوچھنے پر وہ کہہ دیتی کہ پابندی سے استعمال کررہی ہوں۔ کئی دن یونہی گزر گئے تھے۔

شیراز آفس سے واپس آیا تو وہ تیار ہو رہی تھی۔

''کہاں جانے کی تیاری ہے بھئی۔'' اس نے پوچھا۔

''بس ایسے ہی، گھومنے پھرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''شکر ہے، تمہارے دل نے کچھ تو چاہا'' اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''چلو گے نا؟'' بازغہ بولی۔

''تمہارا حکم ہو اور اس کی تعمیل نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا'' وہ خوش دلی سے بولا۔

وہ مسکرانے لگی۔ ''تمہارے ہونٹوں پر اتنی جاندار سی مسکراہٹ دیکھ کر بہت دنوں بعد آج سکون نصیب ہوا ہے۔'' شیراز نے کہا اور پھر وہ دونوں گھومنے نکل گئے۔

بہت خوشگوار موڈ تھا آج بازغہ کا اور اسے دیکھ کر شیراز بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

بہت دیر تک وہ دونوں لمبی لمبی شاہراہوں پر یونہی بے مقصد گھومتے رہے تھے۔

''آج کئی دن بعد یہ خوش قسمت دن آیا ہے۔'' شیراز کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولا تھا۔

''تو اور دنوں میں کیا برائی تھی؟'' بازغہ نے کہا۔

''یونہی کہہ رہا تھا۔'' شیراز کو غلطی کا احساس ہوا۔

''بہت ذہنی اذیتیں جھیلی ہیں پچھلے دنوں میں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بازغہ! خدا کے لیے اب ایسا مت کرنا۔'' شیراز بولا۔

''کیا؟'' وہ چونک گئی۔

''میرا مطلب ہے اب ایسی خوفناک بیمار مت پڑنا'' اس نے وضاحت کی۔

''میں جان بوجھ کر تو نہیں کرتی نا!'' بازغہ گھبرا سی گئی تھی۔

''جان بوجھ کر تو نہیں کرتی ہو لیکن میرا مطلب ہے کہ علاج وغیرہ میں ذرا سی بھی کوتاہی مت کرنا، اور خود بھی سنبھلنے کی کوشش کیا کرو۔ انسان میں اگر خود اعتمادی پیدا ہو جائے تو پھر وہ بڑی سے بڑی کوفت کو بھی شکست دے سکتا ہے۔'' شیراز نے قدرے تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کوشش تو کرتی ہوں۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

اس کی جان میں جان آ گئی۔ پھر بہت دیر تک گھومتے رہنے کے بعد وہ گھر واپس آ گئے۔ جب سب کچھ اپنے اختیار میں ہو تو انسان جب چاہے جو چاہے، اپنی مرضی سے کر سکتا ہے۔ بازغہ کے ہاتھوں میں بھی ڈور آ گئی تھی۔ جب چاہتی وہ اسے ہلا دیتی۔ حالانکہ اس کے اپنے دل کی بے کلی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بے چینیاں دوچند ہو گئی تھیں۔ دماغ ہر وقت سوچوں میں گم رہنے لگا تھا۔ بہت دہشت سی ہوتی تھی۔ اس کا علاج باقاعدگی سے جاری تھا جو صرف کلینک تک ہی محدود تھا، گھر آ کر تو وہ کچھ بھی نہیں کرتی تھی۔

شیراز ہر روز پوچھتا اور وہ ہر روز جھوٹی تسلیوں سے اسے مطمئن کر دیتی۔ وحشتیں تو اب سارے وجود پر آپ ہی آپ چھانے لگی تھیں۔ پریشاں پریشاں سی وہ سارے گھر میں گھومتی رہتی۔ بے قراری سے گم صم بیٹھی رہتی۔ اس کے ہر انداز سے بے چینی جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ چہرہ دلی کرب کا آئینہ دار بن گیا تھا۔ مضمحل سی ہو کر وہ سوچوں میں گم، اداسیوں میں ڈوبی رہتی۔

شیراز اسے دیکھتا تو پریشان ہو جاتا۔

ایک روز وہ یوں ہی بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ کسی اپنے کے کندھے سے سر لگا کر جی بھر کر روئے کہ اس کے غم کچھ دیر کے لیے رخصت ہو جائیں۔ آج امی بڑی یاد آ رہی تھیں۔ وہی تو تھیں اس کی غم خوار، انہی کی پیار بھری آغوش میں چھپ کر وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ کتنا سکون ملتا تھا محبت و خلوص کے اس پیکر سے، کتنی راحت ملتی تھی ان کی گود میں سر چھپا کر۔ کاش امی آپ زندہ ہوتیں تو میرے سینے پر رکھا ہوا دکھوں کا یہ بوجھ اس قدر نہ ہوتا۔ میرا آدھا دکھ تو آپ بانٹ لیتیں۔ وہ دکھے دل سے سوچ رہی تھی۔ بالکونی سے نیچے دیکھا تو بیگم قدوس لان میں بیٹھی نظر آئیں۔ ممتا کا خزانہ تو ان کے پاس بھی تھا۔ وہ بھی تو ماں ہی تھیں نا۔ اس کی نہیں تو شیراز کی تھیں۔ سب ماؤں کے دل تو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ایک ہی سے احساسات و جذبات ہوتے ہیں۔ ساری مائیں پیار کے چشموں کی مالک ہوتی ہیں۔ بازغہ ان چشموں میں سے چند قطرے لے کر اپنی تشنگی مٹانا چاہتی تھی۔ وہ ہمت کر کے ان کے پاس چلی آئی۔ انہیں بھی تو اس نے ماں ہی کا درجہ دے رکھا تھا۔ اپنی ماں ہی سمجھتی تھی انہیں بھی۔ ویسے ہی محبت کرتی تھی ان سے جیسی اپنی امی سے کیا کرتی تھی۔ وہی عقیدت تھی ان سے۔ ان کے سایہ شفقت میں بیٹھنے کے لیے وہ ان کے قریب چلی آئی۔

بیگم قدوس نے اسے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نفرت سی جاگ اٹھی۔ حالانکہ شیراز ساتھ ہوتا تو ان کا یہ رویہ ہرگز نہ ہوتا۔

بازغہ ان کے قریب آئی تو وہ وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ اس کا دل ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ دکھ کی تیز لہر اس کی آنکھوں تک آ پہنچی اور اس کا سارا وجود بہا کر لے گئی۔ تشنگی کے سمندر میں ڈوب کر اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ بے خودی ہو کر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہوش و حواس کا دامن چھوٹنے لگا تھا۔ عقل و خرد سے بیگانہ ہوئی جا رہی تھی۔ تب ہی سائیڈ ٹیبل لیمپ پر اس کی نظریں آ کر رک سی گئیں۔ دل میں وحشتوں کا طوفان اٹھنے لگا۔ تحفے تو محبت و خلوص کا آئینہ دار ہوتے ہیں اور جب محبت و خلوص ہی ختم ہو گیا تو ان کا وجود کیا معنی۔ اس نے لیمپ اٹھا کر زور سے دیوار میں دے مارا اور دور تک اس کے ٹکڑے بکھر گئے۔ میز پر رکھے گلدان میں بہت خوبصورت تازہ تازہ پھول لگے تھے۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں سارے پھول نوچ ڈالے۔ ایک ایک پتی مسل کر پھینک دی اور گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ فرش پر کانچ ہی کانچ پھیل گیا۔

آپ کے دل سے خلوص ختم ہو گیا تو میں نے اس خلوص کی یادگاریں بھی مٹا دی ہیں جو کبھی آپ کے دل میں تھا بیگم قدوس! زہرخندی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی اور پھر اضطراب بڑھتا ہی گیا۔ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اضطراری کیفیت میں وہ دیوانہ وار کمرے میں گھوم رہی تھی۔ ننگے پاؤں کانچ کے ٹکڑوں پر چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں پیر بری طرح لہولہان ہو گئے۔ خون بہہ رہا تھا اور وہ بے خبر تھی۔ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ سارے قالین پر خون آلود نقش بن گئے تھے۔ تب ہی شیراز آ گیا۔

''بازغہ!'' وہ آتے ہی چلایا تو وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''یہ کیا کیا تم نے؟'' چہرے پر وحشت لیے وہ گھبرا کر بولا۔

وہ جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ تب ہی شیراز نے ہاتھ پکڑ کر اسے مسہری پر بٹھا دیا۔

''اف خدایا!'' وہ نیچے بیٹھ کر اس کے پاؤں میں چبھی کرچیاں نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم نے بہت برا کیا بازغہ۔ اپنے پیروں کو زخمی کر لیا۔'' وہ کرب سے بولا۔

''میرے پیروں کے زخم دیکھ رہے ہو شیراز! یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ میرے دل پر لگے زخموں کو دیکھو، ان کی تکلیف کا اندازہ کر کے تمہیں سانس لینا بھی مشکل لگے گا۔'' بازغہ نے دل میں کہا۔ وہ اس کے پیروں سے چن چن کر کانچ کے ٹکڑے نکال رہا تھا۔

بازغہ چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ تم نے کیوں کیا بازغہ؟'' اس نے کہا۔

''میں نے نہیں کیا۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر؟'' شیراز نے کہا۔

''خود ہی ہو گیا۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

جواب میں شیراز نے سرد آہ بھری۔ کانچ نکالنے کے بعد خون صاف کر کے اس نے پٹی باندھی اور پھر ڈاکٹر کو فون کر دیا۔

''سب کرچیاں تو نکل گئی ہیں، پھر ڈاکٹر کو کیوں بلایا ہے؟'' بازغہ نے کہا۔

''ہو سکتا ہے کچھ ابھی باقی رہ گئی ہوں اور پھر مرہم پٹی تو ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔'' وہ بولا۔

وہ چپ ہو گئی۔

''تمہیں تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا کیا؟'' تھوڑے توقف کے بعد شیراز نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ بولی۔

''دل میں لگے گھاؤ سے تو یہ ٹیسیں زیادہ نہیں۔'' بازغہ نے دل میں سوچا۔

''اب تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔'' شیراز نے پوچھا۔

''ہاں! اب تو محسوس ہو رہی ہے۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

شاید ابھی کچھ کرچیاں باقی رہ گئی تھیں۔ زخموں میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ بہت جلن ہو رہی تھی۔ اب تو تکلیف کا احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ ذہن میں آئی طغیانی کا زور جو ٹوٹ چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر ارشد آ گئے۔

پیروں میں واقعی کچھ ننھی ننھی کرچیاں رہ گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نکالنی شروع کیں تو تکلیف سے اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ اور تب خیال آیا کہ ان کرچیوں کے اندر گھستے وقت بھی اتنی ہی تکلیف ہوئی ہو گی لیکن سارے احساس مٹ جانے کا نام ہی تو بے خودی ہے۔ اور اس وقت اس کے سارے احساسات مٹ ہی تو گئے تھے۔ کرچیاں نکالنے کے بعد انہوں نے مرہم پٹی کی۔ اور ضروری ہدایتیں دے کر چلے گئے۔

''تکلیف میں کچھ کمی آئی؟ ان کو خدا حافظ کہہ کر شیراز نے واپس آ کر پوچھا۔

''ہاں! اب کم محسوس ہو رہی ہے۔'' بازغہ نے جواب دیا۔

''میں سعیدہ کو بھیجتا ہوں کہ وہ فرش صاف کر دے۔'' شیراز یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

سعیدہ آئی تو فرش پر سے کانچ کے ٹکڑے چنتے ہوئے وہ بڑی افسردگی سے بازغہ کو دیکھ رہی تھی۔ ''سعیدہ ہاتھ میں کانچ نہ چبھ جائیں۔'' بازغہ نے توجہ دلائی۔

''نہیں بیٹا! ہاتھوں میں نہیں چبھیں گے، یہ تو میرے دل میں چبھ گئے ہیں۔'' وہ بولی۔

''کیوں؟'' بازغہ نے کہا۔

''تمہیں تکلیف میں دیکھ کر میرا دل روتا ہے بیٹا!'' سعیدہ افسردگی سے بولی۔

''کیا رشتہ ہے میرا اس سے، لیکن کتنا خلوص ہے اس کے دل میں میرے لیے۔'' بازغہ نے سوچا۔

''میں تو دن رات آپ کے اچھے ہونے کی دعا مانگتی ہوں۔ نہ جانے کیوں اللہ سنتا ہی نہیں ہے۔'' سعیدہ کے آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آئے۔

''اچھی تو میں جب ہی ہو سکتی ہوں جب یہ گھر حقیقی خوشیوں سے ہمکنار ہو جائے گا۔ شیراز کو خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشیاں مل جائیں گی۔ لیکن خوشیوں اور میرے درمیان پل صراط ہے اور میں نے

اس پل صراط پر قدم رکھ دیئے ہیں۔ اب تو راستہ پار کرنا ہی ہے نا۔'' بازغہ سوچے چلی جا رہی تھی۔

''خدا! آپ کو اچھا کر کے مجھے آپ کا مرض دے دے۔'' سعیدہ کے لہجے میں خلوص تھا۔

''نہیں سعیدہ! ایسے تو مت کہو۔'' بازغہ نے کہا۔

''میری تو دن رات یہی دعا ہے کہ آپ اچھی ہو جائیں۔ خوشیوں میں پھولیں پھلیں، شاد و آباد رہیں۔'' سعیدہ نے دعا دیتے ہوئے کہا: ''کاش آپ کا مرض مجھے آ جائے۔''

''سب کی تقدیریں الگ الگ ہوتی ہیں سعیدہ! کوئی بھی اپنی تقدیر سے دوسرے کی تقدیر نہیں بدل سکتا۔'' بازغہ نے کہا۔

''ہاں یہی تو بے بسی ہے انسان کی۔'' سعیدہ نے سرد آہ بھری۔

''بہت بے بس ہے انسان بیچارہ۔'' بازغہ کے لبوں سے بھی آہ نکلی۔

سارے ٹکڑے سمیٹنے کے بعد سعیدہ چلی گئی۔ بازغہ کے پیروں میں جلن باقی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ بہت دیر یونہی گزر گئی۔

شیراز کمرے میں داخل ہوا تو چند لمحوں بعد سعیدہ بھی آ گئی۔

''کھانا لے کر آئی ہوں چھوٹے صاحب!'' اس نے کہا۔

''اچھا، یہاں رکھ دو۔'' شیراز نے کہا۔

وہ آنکھیں بند کیے سن رہی تھی۔

''بازغہ!'' کچھ توقف کے بعد شیراز نے آہستہ سے پکارا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھو، کھانا کھالو۔'' شیراز نے کہا۔

''تم نے یہیں منگالیا کھانا۔'' وہ میز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں، تم وہاں تک نہیں جاسکتی تھیں نا!'' شیراز نے کہا۔

وہ اٹھ گئی۔ کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ شیراز سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا، اور وہ بھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔

دوسرے دن وہ آفس سے واپس آیا تو بازغہ اپنے کمرے میں نیم دراز رسالہ پڑھ رہی تھی۔

''بازغہ! تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔'' وہ آتے ہی بولا۔

''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''قالین بدلوانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

سارے قالین پر سرخ سرخ پیر بنے ہوئے تھے۔

''میں نیا قالین لے آیا ہوں، اسے ہٹا دیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''اچھا!'' وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شیراز آیا۔

''چل کر دیکھو! نیا قالین کتنا خوبصورت ہے۔'' شیراز نے کہا تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''میری وجہ سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے شیراز!'' نادم نادم سا تھا اس کا لہجہ۔

''نہیں، یہ تو میں کئی دن سے خود بھی بدلوانے کا سوچ رہا تھا۔ اب یہ تمہاری عنایت ہے کہ تم نے میری سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔'' شیراز نے کہا۔ ''لیکن یہ عنایت تمہیں بہت مہنگی پڑی۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''میں بہت شرمندہ ہوں۔'' بازغہ بولی۔

شیراز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ آگے کچھ نہ کہے۔

☆☆☆

☆☆☆

وقت کی رفتار اپنی ہی ہوتی ہے۔ بازغہ کے لیے اب زیادہ دیر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ شیراز کو مزید کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ جب اس گھر سے جانے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پھر وہ شش و پنج کی اس کیفیت سے باہر کیوں نہیں نکل آتی۔ وہ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر ایک جھماکا سا ہوا اس کے ذہن میں۔ شیراز کے آنے میں تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ وہ باہر آ گئی۔

لان میں آ کر اس نے پوری قوت سے ایک گملا اٹھایا اور پورچ میں آ گئی۔ وہاں آ کر اس نے پھولوں کا گملا توڑ دیا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اس طرح اس نے کئی گملے توڑ کر پاؤں سے گملوں کی مٹی گاڑی پارک کرنے والی جگہ پر پھیلا دی اور خود اُن میں بیٹھ گئی، بلکہ لیٹ گئی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ گیلی مٹی سے اس کے کپڑے آلودہ ہو گئے ہیں تو اس نے وہ مٹی اپنے بالوں میں بھی بھر لی۔ عین اسی لمحے سعیدہ وہاں آ گئی۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر غم زدہ سی ہو گئی۔

''بیٹا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' لیکن اس نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور نیچے سے گیلی مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر اندازہ کیا کہ کہیں سخت تو نہیں اور سعیدہ کی طرف اچھال دیا۔ مٹی کا ڈھیلا سعیدہ کے کپڑوں پر نقش بناتا ہوا نیچے بکھر گیا۔ اچانک باہر کا گیٹ کھلا اور ایک گاڑی تیزی سے اندر آ گئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ شیراز ہے۔ وہ آگے بڑھ کر سعیدہ کے بال نوچنے لگی۔ سعیدہ پیار سے اس کے ہاتھ روکتی رہی تاہم اس نے سختی کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں کی۔

گاڑی پورچ کے قریب آ کر رکی تو قدوس صاحب گاڑی سے باہر نکلے اور یہ منظر دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی۔

''بازغہ بیٹی!'' انہوں نے پکارا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' بازغہ نے کوئی جواب نہ دیا تو سعیدہ نے آگے بڑھ کر انہیں بتایا کہ پاگل پن کا دورہ ہے۔

''ہیں؟'' وہ حیران رہ گئے۔ ''یہ کب سے ہوا؟'' انہوں نے سعیدہ سے پوچھا۔

''صاحب جی! آپ کو شاید پتا نہیں۔ یہ تو کئی دن سے ہو رہا ہے۔ چھوٹے صاحب نے چھوٹی بیگم کو ڈاکٹروں کو بھی دکھایا ہے لیکن ابھی تک مسئلہ باقی ہے۔'' سعیدہ نے انہیں بتایا۔

''چلو کوشش کر کے انہیں اندر لے کر آؤ۔'' قدوس صاحب نے اسے حکم دیا۔

سعیدہ نے بازغہ کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں بازغہ نے مٹی کا ایک اور ڈھیلا پکڑ لیا تھا۔ وہ اس نے قدوس صاحب کی طرف اچھال دیا۔ قدوس صاحب تیزی سے پیچھے ہٹے اور اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں بیگم قدوس کے ساتھ وہ باہر نکلے۔ بیگم قدوس بازغہ کی حالت دیکھ کر ڈر سی گئیں۔ انہوں نے کھڑے کھڑے موبائل پر شیراز کا نمبر ڈائل کیا۔

شیراز گھر کے قریب ہی پہنچ چکا تھا۔ بیگم قدوس نے موبائل بند کر کے باہر کے گیٹ کی طرف نظر دوڑائی تو شیراز کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔

اور جب شیراز آیا تو وہ سارا ماجرا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

بازغہ نے جب شیراز کو دیکھا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھی لیکن اس نے گیلی مٹی کا ایک اور ڈھیلا اٹھا کر شیراز کی جانب بھی اچھال دیا۔ مگر ایسا کرتے وقت اس کا دل اندر سے دہل گیا تھا۔ ایک زلزلہ سا اس کے وجود میں آ گیا تھا۔ دماغ میں اندھیرا سا چھا گیا تھا اور وہ شدت احساس سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

آنکھ کھلی تو وہ بستر پر تھی۔ اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا اور ایک نرس اس کے پاس کھڑی تھی۔

اس نے کچھ پوچھنا چاہا تو نرس جواب دینے کی بجائے باہر چلی گئی اور ذرا سی دیر میں شیراز اور اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اتنی دیر میں بازغہ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں ہے۔

''کیا حال ہے؟'' شیراز نے آتے ہی پوچھا۔

بازغہ کے دل میں آیا کہ کہہ دے کہ وہ ٹھیک ہے، لیکن اس نے جو جواب دیا وہ خود اس کے لیے بھی حیرت ناک تھا۔

''کون ہیں آپ؟''

اس کا جواب سن کر شیراز کو ایسے لگا جیسے اس نے اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہو۔

''میں۔۔۔م۔۔میں شیراز ہوں۔'' شیراز نے لکنت زدہ آواز میں کہا۔

''کون شیراز؟ میں کسی شیراز وراز کو نہیں جانتی۔'' اس نے روکھائی سے کہا۔

شیراز نے کچھ کہنا چاہا تو ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے کہا آپ خاموش رہیں۔

''ہاں بیٹا! کیا حال ہے آپ کا؟''

''آپ کون ہیں؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بیٹا! میں ڈاکٹر ہوں۔''

''میں کہاں ہوں؟''

''بیٹا آپ ہمارے ہسپتال میں ہیں۔ یہ آپ کے شوہر ہیں۔ یہی لے کر آئے ہیں آپ کو۔''

''میں انہیں نہیں جانتی، آپ سب میرے کمرے سے چلے جائیں، چھوڑ دیں مجھے۔''

وہ آج ہر انتہاء کرنے پر آمادہ نظر آرہی تھی۔

''نہیں بیٹا! ہم آپ کا علاج کریں گے، آپ کو دوا دیں گے تو آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ڈاکٹر نے شفقت سے کہا۔

''مجھے کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ آپ بھاگ جائیں یہاں سے نہیں تو میں بھاگ جاؤں گی۔'' اس کے چہرے پر دہشت سی طاری ہوگئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اچھا بیٹا آپ چلی جانا لیکن ذرا رکنا۔'' انہوں نے شیراز کو اشارہ کیا تو شیراز نے اس کے دونوں بازو سختی سے پکڑ لیے۔ بازغہ نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے نہایت احتیاط سے اس کے بازو میں انجکشن لگا دیا۔

بازغہ نے ایک سسکاری سی لی۔ عام حالات میں کبھی انجکشن لگوانا پڑتا تو وہ اُف بھی نہیں کرتی تھی، لیکن اس وقت اسے واقعی ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا بازو چھید دیا ہو۔

وہ شور کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی اور پھر بالکل خاموش ہوگئی۔

اس کی حالت دیکھ کر شیراز کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی اور کمرے سے باہر آنے کے لیے کہا۔

انہوں نے باہر آکر شیراز کو مشورہ دیا کہ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو آپ انہیں گھر لے جائیں، اگر گھر میں رہتے ہوئے آپ ذمہ داری سے ان کی نگرانی اور علاج کروا سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر۔۔۔'' ڈاکٹر افتخار ذرا دیر کے لیے خاموش ہوئے تو شیراز نے پوچھا:

''ورنہ پھر؟'' شیراز ان کی ساری بات سننے کے لیے بے چین تھا۔

انہیں مینٹل ہسپتال میں داخل کروانا پڑے گا۔ اور یہ صورت شاید زیادہ بہتر ہوگی کیونکہ گھر میں رہتے ہوئے ان کا علاج شاید اب ممکن نہ ہو۔''

شیراز کا سینہ دکھ سے بھر گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب اب یہ کون سی سٹیج ہے؟''

''بھئی میں وثوق سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا، لیکن میں خیال میں یہ پاگل پن یا شیزوفرینیا کی انتہائی سٹیج ہے۔''

''شیزوفرینیا! اوہ تو مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی تھی۔'' شیراز نے تعجب سے کہا۔

''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے جب وہ ہوش میں آئے تو پہلے ہی کی طرح ہو جائے۔ لیکن اب یہ کیفیت میرے خیال میں زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔ جلد ہی وہ اسی کیفیت میں لوٹ آئے گی۔''

''تو آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''یہی کہ ہسپتال میں رکھ کر ان کا باقاعدہ علاج کروایا جائے۔''

''لیکن ایک بار میں اسے گھر لے جا کر دیکھ لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر افتخار نے کہا: ''اگر وہ اپنی پہلی کیفیت سے لوٹ آئے تو۔''

''ہوش کب تک آجائے گا؟''

''وہ ایک گھنٹہ کم از کم آرام سے سوتی رہے گی۔'' ڈاکٹر افتخار نے بتایا۔

شیراز واپس اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بستر پر بے خبر سوئی پڑی تھی۔ شیراز اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ کیا یہ وہ بازغہ ہے جسے وہ پسند کر کے اپنے گھر لایا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔ ظاہری طور پر بھی پہلے سے وہ بہت مختلف نظر آرہی تھی۔ اس کی خوبصورتی آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی تھی۔ لیکن اس وقت سوتے ہوئے وہ کتنی معصوم لگ رہی تھی۔۔۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اس کے دل میں درد ہی درد تھا۔ ''بازغہ!'' اس کے دل کی گہرائی سے صدا اٹھی۔ ''تمہارے لیے میں ایک بہت کڑے امتحان سے گزر رہا ہوں۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں، تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا،

اور تم ہو کہ مجھ سے لمحہ لمحہ بچھڑتی چلی جارہی ہو، اور اب پہچاننے سے بھی انکار کردیا ہے۔" سوچتے سوچتے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے لگا کہ اسے زیادہ دیر تک دیکھتے رہنے سے اس کا اپنا دماغ شل ہو جائے گا۔

☆☆☆

☆☆☆

خلاف توقع اگلے روز بازغہ بالکل نارمل نظر آرہی تھی۔ شیراز نے ڈاکٹر افتخار سے مشورہ کیا تو انہوں نے بخوشی اسے احتیاطی تدابیر سمجھاتے ہوئے گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔

جب وہ بازغہ کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو بیگم قدوس اسے دیکھتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ شیراز کو صاف طور پر پتا چل گیا کہ وہ اب اس کا وجود برداشت نہیں کرپارہیں۔ بازغہ ان کا یہ رویہ دیکھ کر پہلی بار اندر سے مسکرائی۔ دل نے کہا: "بیگم قدوس! اب بہت جلد میں آپ کا پیچھا چھوڑنے والی ہوں، فکر کی کیا بات ہے۔"

شیراز اسے اوپر لے گیا اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ بازغہ نے منہ سے کوئی لفظ نہیں کہا اور چپکے سے بستر پر لیٹ گئی۔

شیراز ذرا دیر کے لیے نیچے آیا تو اسے کھڑ کاوڑ کا سا محسوس ہوا۔ وہ پلٹ کر پھر اوپر چلا گیا۔

طوفان کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پرشور ہواؤں سے بازغہ کا وجود لہرانے لگا تھا۔ سب کچھ ڈوبنے لگا۔ شاید وہ اب بہت جلدی میں تھی۔ بے قراری میں وہ کمرے کی کھڑی کے پاس آئی تو اس نے اپنا سر لوہے کی گرل سے ٹکرانا شروع کردیا۔ شیراز نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ شیراز نے اسے باہر ہی سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اضطراری حالت میں چیختی رہی۔ اس کی خوفناک چیخوں کی آواز سن کر قدوس صاحب بھی اوپر آگئے اور پیچھے پیچھے بیگم قدوس بھی تھیں۔ سعیدہ بھی ساتھ ہی تھی۔ اس نے بھاگ کر بشیر کو آواز دی۔ بشیر نے آتے ہی دروازے کو زور سے دھکا دیا مگر وہ نہ کھلا۔ وہ پھر بھاگ کر نیچے گیا اور ایک ہتھوڑا لے آیا۔ اس نے شیراز کی طرف دیکھا اور زور زور سے دروازے کے لاک پر ہتھوڑے برسانے شروع کردیے۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔

اور جب وہ سب اندر داخل ہوئے تو بازغہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

شیراز نے اسے بے قراری سے دیکھا۔ اس کی نبض رواں تھی۔ پھر اس نے بازغہ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے بستر پر لٹا کر ڈاکٹر افتخار کا نمبر ملایا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر افتخار وہاں پہنچ گئے تھے۔

"ذہنی کشمکش کا شکار ہو جانے سے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔" ڈاکٹر افتخار نے کہا۔

"یہ کیسے ٹھیک ہوں گی ڈاکٹر صاحب؟" شیراز بے حد پریشان تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر بہت دباؤ ہے۔ کوئی بہت بڑا بوجھ ہے۔"

ڈاکٹر افتخار اسے انجکشن لگا کر اور شیراز اور دیگر گھر والوں کو جو وہاں موجود تھے، تسلی دے کر چلے گئے۔ آخر میں شیراز بازغہ کے ساتھ تنہا کمرے میں رہ گیا۔

نہ جانے کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ جب بازغہ کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کچھ دیر وہ اندھیرے میں گھورتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آنے لگا۔

ایک سرد سی آہ بے ساختہ ہونٹوں سے نکل گئی۔ اسے سب کچھ یاد آگیا۔ وہ خوف سے کانپ گئی۔ سر میں ٹیس پڑی تو اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اوہ میرے خدایا! اس نے سوچا۔ یہ تو میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ اس نے بے اختیار اپنے دائیں جانب دیکھا تو شیراز کرسی پر بیٹھا تھا لیکن آنکھیں بند تھیں۔ اس نے شیراز کو ہولے سے آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا تو اسے پتہ چلا کہ شیراز سویا ہوا ہے۔ دروازے کی جانب دیکھا تو اس کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ دروازہ توڑا گیا ہے۔

وہ سوچنے لگی۔ آج اتنا بڑا واقعہ کیسے ہو گیا۔ گو یہ سب کچھ اس کی اسکیم کے مطابق بہتر تھا لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح بھی ہو جائے گا۔

کیا واقعی وہ اس وقت ہوش و خرد سے بیگانہ تھی؟ بازغہ سوچنے لگی۔ اور پھر اسے واضح طور پر پتا چل گیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔

زندگی بہت عجیب موڑ پر لے آئی تھی۔ پل صراط کا سفر طے کررہی تھی۔ قدم قدم پر گرنے کا خدشہ تھا۔ کسی کو کچھ دینے کا جذبہ کتنا کیف آگیں ہوتا ہے اور شیراز کو کچھ دینے کا جذبہ اتنا ہی شدید تھا کہ وہ اپنے آپ کو یہاں سے جلد از جلد ہٹانے کے لیے پورے جتن کررہی تھی۔ کئی دن یونہی بیت گئے۔ اس لیے کہ وہ نڈھال نڈھال سی رہنے لگی تھی۔ جب خزاں آتی ہے تو چمن کی ساری شادابی اور شگفتگی کو نوچ کر پھینک دیتی ہے۔ سب کچھ اجاڑ دیتی ہے۔ ویرانیاں پھیل جاتی ہیں سب طرف۔

دکھوں کی خزاں نے بازغہ کے چہرے کی ساری شادابی، تمام شگفتگی چھین کر ویرانیاں بکھیر دی تھیں۔ اجڑی اجڑی سی رہنے لگی تھی وہ۔ مضمحل سی نظر آتی تھی۔ دل میں سائیں سائیں کرتی وحشتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ اضطراری کیفیت سوار رہنے لگی تھی ذہن پر۔ بہت مضطرب سی وہ سارے گھر میں چپ چاپ پھرتی رہتی۔ بے چینیاں بڑھیں تو عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا محسوس ہوتا۔

اس شام دیر تک سونے کے بعد وہ جاگی۔ کچھ دیر یونہی پڑے رہنے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر آئی تو طبیعت میں تازگی محسوس ہوئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بہت سلیقے سے بال سنوارے۔ کئی دن بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر اپنے بال سنوارے تھے۔ تب ہی اس کی نظر کھڑکی کے ٹوٹے شیشے پر پڑی۔

"ارے یہ کب ٹوٹ گیا؟"

شیراز چپ تھا۔

"صبح تک تو ٹھیک تھا۔" بازغہ نے کہا۔

"کچھ دیر قبل ہی ٹوٹا ہے۔" شیراز کے لہجے میں اداسی گھلی ہوئی تھی۔

''کیسے ٹوٹ گیا؟'' وہ بولی۔

''تم نے توڑا ہے۔'' وہ بہت بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔

''میں نے؟'' بازغہ نے سرد آہ بھری۔

''اف خدایا۔'' بازغہ کو چکر سا آ گیا۔ ''یہ میں کیا کرتی پھر رہی ہوں۔'' اسے تو واقعی کچھ یاد نہیں تھا۔ بالکل معلوم نہیں تھا۔ کیا وہ واقعی حقیقت میں بھی پاگل ہوتی جا رہی ہے۔ سوچتے ہوئے سرد سی لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے اپنے ہوش میں تو ایسا نہیں کیا تھا۔ پھر۔۔۔ پھر کیا واقعی؟

اس پر بے خودی طاری ہو گئی تھی۔ کیا سچ مچ دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا اس پر؟ سوچتے ہوئے بازغہ دہشت سے کانپ اٹھی۔ رواں رواں لرز اٹھا۔

''تمہاری بیماری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ کچھ بھی تو فائدہ نہیں ہو رہا ہے علاج سے۔'' شیراز اداسیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جب مریض خود ہی اچھا نہ ہونا چاہے تو علاج لاحاصل ہوتا ہے۔'' بازغہ نے دل میں سوچا۔

''خدا جانے تم نے دل میں کون کون سے روگ پال کر اپنا یہ حال کر لیا ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''صرف تمہاری محبت کا۔'' بازغہ کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔

''ڈاکٹر افتخار کے کلینک جانا ہے تمہیں۔'' شیراز نے کہا۔

''نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ بولی۔ ''تنگ آ گئی ہوں میں اس علاج معالجے سے۔'' اس کے لہجے میں بیزاری سی جھلک رہی تھی۔

''ڈاکٹر افتخار کا کہنا ہے کہ تم جب تک اپنے دل سے احساس محرومی نکالنے کی کوشش نہیں کرو گی، اپنی خواہشوں کو خود کنٹرول کرنے کی ہمت نہیں کرو گی، تب تک تمہارے علاج میں مشکلات حائل رہیں گی، اور تم ہو کہ علاج ہی نہیں کروانا چاہتیں۔'' شیراز نے کہا۔

''زندہ تو میں بھی رہنا چاہتی ہوں لیکن تمہاری خواہشوں کو مرتا ہوا دیکھتی ہوں تو حوصلہ ہار دیتی ہوں۔'' بازغہ کے دل نے صدا دی تھی۔

اس دوپہر سعیدہ کھانا لے کر آئی تو بازغہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ خاصی ہشاش بشاش طبیعت تھی۔

''کھانا لگا دیا ہے بیٹا!'' سعیدہ نے کہا۔

سعیدہ کھانا لگا کر واپس جا چکی تھی۔ بازغہ کا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے تھوڑا سا کھا لیا۔ سعیدہ برتن سمیٹنے آئی تو اسے احساس ہوا کہ کئی دن سے اس نے سعیدہ کی خیریت ہی نہیں پوچھی۔

''کیا حال ہے سعیدہ! ٹھیک تو ہو؟''

''اللہ کا شکر ہے جی۔'' اس نے جواب دیا۔

سعیدہ برتن سمیٹنے لگی تو اسی وقت اس کی نظر اس کی کلائی پر بندھی سفید پٹی پر پڑ گئی۔

''یہ ہاتھ میں کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔'' سعیدہ رک سی گئی۔

''کیا ہو گیا؟'' بازغہ نے دوبارہ کہا۔

''وہ جی چوٹ لگ گئی تھی۔'' سعیدہ گھبرا سی گئی تھی، جیسے کچھ چھپانا چاہ رہی ہو۔

''کیسے لگ گئی چوٹ؟'' بازغہ نے پوچھا۔

''بس وہ لگ گئی۔'' سعیدہ بولی۔

''کیسے آخر؟'' بازغہ الجھ سی گئی۔

''گر پڑی تھی میں، پاؤں پھسل گیا تھا۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''اچھا!۔۔۔ احتیاط سے چلا کرو نا!'' بازغہ نے کہا۔

''بس جی اتفاق ہے۔'' سعیدہ نے برتن سمیٹے اور چلی گئی۔

پھر کئی دن اور گزر گئے اور اسے پتہ چلا کہ اس دوران میں کتنے ہی واقعات ہو چکے ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ گھر میں سناٹا سا چھایا رہتا ہے۔ سناٹا تو پہلے بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن اب اس سناٹے میں غم و درد کے علاوہ بیزاری اور گھر کے مکینوں میں خوف کی آمیزش ہونے لگی تھی۔

وہ گھر کے کسی بھی کونے میں جاتی، وہاں کوئی ہوتا تو اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے وجود کو آسیب سمجھتا ہے۔

یوں پانچ چھ دن اور گزرے۔ دل میں لگی آگ سے اب اس کا دامن جلنا شروع ہو گیا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ کب وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ بعد میں شیراز کی زبانی معلوم ہوتا کہ آج تم نے خانساماں کو زخمی کر دیا ہے۔۔۔ پھر دوسرے روز وہ اطلاع دیتا کہ ڈیڈی کے ہاتھ کو تم نے دہشت سے کاٹ لیا تھا۔۔۔ مما کے چہرے پر بھی خراشیں ڈال دی تھیں۔۔۔ بشیر بے چارے کا کیا قصور تھا۔۔۔ وہ بیٹھا گھاس کاٹ رہا تھا کہ تم نے درانتی اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کے سر میں دے ماری تھی۔۔۔ وہ بے چارہ ہسپتال پہنچ گیا ہے۔

ایک روز تو عجیب واقعہ ہوا۔ وہ اور شیراز کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ نیچے سے اچانک چیخ و پکار کے شور سے وہ جاگ گیا۔ دیکھا تو وہ بستر پر نہیں تھی۔ وہ دوڑ کر نیچے گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر کی جانب لپکا۔ دیکھا کہ باہر کے دروازے پر چوکیدار بے چارہ درد سے کراہ رہا ہے۔ اس نے سختی سے اس کی کلائی کاٹ کھانے کے انداز میں اپنے دانتوں میں جکڑ رکھی ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے اس کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھڑائی۔ اب معلوم نہیں کہ چوکیدار کی مضبوط کلائی کس طرح اس کے کمزور ہاتھوں نے جکڑ لی تھی۔ بہت شرمناک سی صورت تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ وحشت سے بازغہ کے ہاتھوں کی قوت دگنی ہو جاتی ہے اور کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ شیراز ہیجانی سی کیفیت میں اسے یہ واقعات بتا رہا تھا۔

بازغہ نے شیراز کی زبانی یہ سب سنا تو وہ رونے لگی۔ اس نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔ بس ذرا احتیاط سے وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی کہ کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ تو کیا۔۔۔ وہ اندر ہی اندر درد سے کراہ اٹھی۔ ایک دم اسے ایسے لگا کہ اس کے سر میں کچھ ہو رہا ہے، پھر اسے کچھ خبر نہ رہی۔

جب اسے ہوش آیا تو دو ہاتھ اسے سختی سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ شیراز کے ہاتھ تھے۔ اس کے شعور کی حالت مزید بہتر ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ڈرائیور گاڑی چلا رہا ہے اور پیچھے شیراز اس کے ساتھ تھا جس نے سختی سے اسے دبوچ رکھا تھا۔ شیراز کے چہرے پر خراشیں ہی خراشیں تھیں اور ان پر ٹینکچر کے نشانات تھے۔ پہلے تو اس کی نظر کو یہ ایک سراب سا لگا۔ نہیں۔۔۔ اس کے دل نے پکارا۔ یہ میں نے کیا کیا؟۔۔۔ کیا میں نے ہی کیا ہے۔ تف!۔۔۔ اس کو خود سے نفرت سی ہونے لگی۔ پھر اس کا دل رونے لگا۔ یہ تو میں نے بالکل نہیں چاہا تھا۔ اندر سے آواز آئی۔۔۔ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔ ایک اور صدا دل کے کسی دوسرے گوشے سے پیدا ہوئی۔ کچھ چیزیں بغیر چاہنے سے وجود میں آجاتی ہیں اور کچھ چاہنے سے بھی نہیں۔ اس کے دل نے شیراز کو محبت سے پکارا۔ لیکن یہ پکار اس کی زبان پر بھی آگئی۔

''شیراز!'' اس نے ہلکے سے کہا۔ اس کی آواز شاید ڈرائیور نے بھی سن لی تھی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ڈرائیور کا گھبراہٹ میں بریک پر پاؤں دب گیا تھا۔

شیراز بھی گھبرا گیا لیکن اس نے اس کے لہجے سے محسوس کیا کہ وہ شعوری حالت میں ہے۔

''کیا ہے؟'' شیراز نے پوچھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

''ڈاکٹر افتخار کے کلینک۔'' شیراز نے اطمینان سے جواب دیا۔

گاڑی کلینک کے سامنے رکی تو شیراز کے اشارے پر ڈرائیور تیزی سے اندر گیا۔ ذرا سی دیر میں ڈاکٹر افتخار باہر آگئے۔

گاڑی پھر چل پڑی۔ بازغہ چپکے سے سب کچھ سن اور دیکھ چکی تھی۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے شیراز کی کلائی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مینٹل ہسپتال!'' شیراز نے واضح کیا۔ وہ بازغہ سے اب کچھ بھی اوجھل نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

بازغہ نے سنا تو اسے ایسا لگا جیسے شیراز کو سمندر کا دوسرا کنارہ مل گیا ہو۔ اس نے بے پناہ سکون کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

ہسپتال پہنچ کر کار سے پہلا قدم زمین پر رکھتے ہوئے بازغہ کے پیر کانپ سے گئے۔ اف خدایا! تقدیر کے اس رخ کا تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ گردش ایام کہاں سے کہاں لے آئی۔ اس کا دل رو اٹھا، لیکن وہ دکھوں کے سمندر پر ضبط کے بندھن باندھے چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ ہسپتال میں ایڈمٹ کرنے کے لیے نہ جانے کیا کیا کارروائی ہوتی رہی۔ بازغہ سب سے بے خبر پتھر کی بے جان مورت کی مانند چپ چاپ بیٹھی تھی۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

''اچھا بازغہ! اب میں چلتا ہوں۔'' شیراز نے ایکدم کہا۔

اسے لگا کہ شیراز چند گھڑیوں میں پورا سمندر پار کر گیا ہے اور ڈوری کے دوسرے کنارے پر جا کھڑا ہوا ہے۔

''میں پھر آؤں گا۔۔۔ خدا حافظ۔'' شیراز کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''خدا حافظ۔'' بازغہ کی آواز رُندھ گئی۔

شیراز کو وہ جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس انداز میں کہ شاید پھر کبھی اسے دیکھنا نصیب نہ ہو۔ لیکن پھر بھی وہ ایک موہوم سی امید رکھتی تھی کہ وہ اسے دیکھنے ضرور آئے گا۔ اس کے دکھوں کی جھلتی دھوپ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنے والا شیراز ایک بار تو ضرور آئے گا۔

اس بات کا ذکر بے محل ہے کہ شیراز سے اسے بے پناہ محبت تھی، ایسی کہ جس کا وہ خود بھی تصور نہیں کر سکتی تھی اور پھر۔۔۔ اس کے والدین کی تمام بے اعتنائیوں، نفرتوں، بیزاریوں کے باوجود وہ انہیں اپنے ماں باپ ہی سمجھتی تھی۔ ان کے لیے اس کے دل میں اب بھی بے پناہ عقیدت، محبت اور احترام تھا۔ اس کا دل اب بھی ان کی شفقت بھری چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے مچلتا تھا، لیکن اب تو سب کچھ چھن گیا تھا۔ اب وہ چھاؤں اس کے لیے نہیں رہی تھی۔ اسے دوریوں کا یہ کڑا سفر طے کرنا ہی تھا۔ اپنے ان پیاروں کی خوشیوں کی خاطر، جن کی خوشیاں اسے اپنی ہستی سے زیادہ عزیز تھیں۔ جن کو خوشیاں دینے کے لیے اس نے اس تپتے صحرا کا سفر شروع کیا تھا۔ تنہائی ہوتے ہی اس کے احساسات کے ڈھیر میں پھر چنگاری پھوٹ پڑی۔

دھیمی دھیمی آگ سلگنی شروع ہو گئی۔ محرومیوں کے احساس نے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر بھینچنا شروع کر دیا۔ کاش کاتب تقدیر بندوں کو اتنی آزمائشوں میں نہ ڈالا کرے۔ کمزور اور ناتواں بندے آزمائشوں کے پل صراط پر سے گزرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ تقدیر کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، مٹ جاتے ہیں۔ وہ بستر پر چپکے سے لیٹ گئی اور پھر مسلسل چھت کو گھورتے ہوئے سوچتی چلی گئی۔

اس کی تقدیر بھی کیا تھی۔ تقدیر تو آندھی کی طرح ہوتی ہے جو بے بس انسان کو تنکے کی طرح اڑائے اڑائے پھرتی ہے۔ کبھی آرزوؤں سے بھر مہکتے گلستان میں چھوڑ دیتی ہے اور کبھی خارزار میں۔ قسمت کے بگولے میں الجھ کر انسان ساری زندگی چکر کھاتا رہتا ہے۔ بری تقدیر تو انمٹ سیاہی سے لکھی ہوتی ہے، جسے دھونا انسان کے بس میں نہیں۔ انسان تو تقدیر کا پابند ہوتا ہے۔ کر بھی کیا سکتا ہے وہ بھلا؟ سر ٹکرانے سے لکھی ہوئی قسمت تو نہیں بدل سکتی نا۔ آنسوؤں کے سمندر بھی مل کر اس انمٹ سیاہی کو نہیں دھو سکتے۔ یہ تو اٹل ہوتی ہے۔ مجھے بھی نوشتۂ تقدیر کی بے رحمی نے اس مقام پر لا پھینکا ہے جس کا مجھے تصور بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ دن مجھے دیکھنا ہی تھا، سو میں نے دیکھ لیا۔ اپنے روتے ہوئے دل کو وہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دلاسے دے رہی تھی۔ بے قرار دل کو بہلاوے دے رہی تھی۔ لیکن پاگل دل مان ہی نہیں رہا تھا۔

قطرہ قطرہ پگھلتا ہوا دل آخر کہیں تو سکون پا ہی لیتا ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ بوجھل ہو گیا اور نا معلوم کس طرح اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو دوسرے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کے کمرے میں صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ باہر سے چڑیوں کی چہکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو تو وہ کچھ سمجھی نہیں۔ بس سب کچھ نیا نیا محسوس ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ایک بے حد سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی اور وہ اٹھ کر مشرقی سمت کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ نرم سنہری دھوپ آسمان کی بلندیوں سے اتر کر زمین پر آئی شروع ہو گئی تھی۔

ہسپتال پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف سامنے لگے بڑے بڑے درختوں پر پھدکتی چڑیوں کی چہکار ماحول کی خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں کھڑی ایک ٹک انہیں ادھر سے ادھر جاتا دیکھتی رہی۔ کاش تم ہمیشہ یونہی آزادی سے چہکتی رہو۔ تم پر بھی کوئی قیدی لمحہ مسلط نہ ہو سکے۔ اس کے لبوں سے آہ نکلی۔ مجھے دیکھو میں پہلے شیراز کی محبتوں کے حصار میں قید تھی اور اب ہسپتال والوں کی قید میں ہوں۔ میرے پر ٹوٹ گئے ہیں۔ مجھ میں اڑنے کی سکت نہیں رہی۔ میں اڑ نہیں سکتی۔ تمہاری طرح آزاد نہیں پھر سکتی۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تمہیں تمہاری آزادی مبارک ہو۔ اللہ کرے تم تقدیر کے بے رحم تھپیڑوں سے محفوظ رہو۔ تمہارے پر کبھی نہ ٹوٹیں۔ تم یونہی ہواؤں میں اڑتی پھرو، چہکتی پھرو۔ وہ پھدکتی چڑیوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ زیر لب کہہ رہی تھی۔ بڑی دیر وہ یونہی کھڑی رہی۔ تب ہی ہسپتال میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ بے ہنگم سی آوازوں کا شور اس کے کانوں میں ہونے لگا۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ پلنگ پر آ بیٹھی۔ اس کا ناشتہ آ گیا تھا۔ اس کا دل کچھ کھانے کو بالکل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے کھانا بہر حال ضروری ہے۔ اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی۔ وہ کچھ لکھے گی۔ اپنی تقدیر کی سیاہی میں اپنے خون دل سے کچھ رنگ بھرے گی اور دنیا والوں کو دکھائے گی کہ زندگی کے یہ رنگ بھی ہوتے ہیں۔ وہ شیراز کی محبت میں اتنا لکھے گی کہ اس کی انگلیاں فگار ہو جائیں اور ان سے پھوٹنے والا لہو شیراز کی محبت کے خوبصورت رشتے کو جاوداں بنا دے۔

یوں بھی وہ بزدل نہیں تھی کہ زندگی جیسی نعمت کو یوں رائیگاں جانے دیتی۔ وہ تو زندہ رہ کر آزمائشوں کے پل صراط پر سے گزرنا چاہتی تھی۔ جفاکشوں کی طرح زندگی کی ہر کٹھن گھاٹی کو عبور کرنا چاہتی تھی۔ ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار تھی۔ اس میں یہ حوصلہ ہی تھا کہ اس نے پل صراط پر قدم رکھ دیئے تھے۔

سفر شروع ہو گیا تھا اور وہ لمحہ لمحہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ہسپتال میں آئے دو دن گزر گئے تھے اور یہ دو دن اس نے جس طرح اکیلے کاٹے تھے یہ صرف اس کا دل ہی جانتا تھا۔ کتنا ذہنی کرب، کتنی اذیت جھیل لی تھی اس نے ان دو دنوں میں۔ وہ پاگل خانے میں داخل کی گئی تھی۔ اور اب اس کی حیثیت ایک پاگل ہی کی تھی۔ اس کو ٹریٹ منٹ دیا جا رہا تھا اور وہ بے بسی سے خاموش تھی۔ دل اب بھی رو رہا تھا۔ اپنی تقدیر پر ماتم کناں تھا۔ لاکھ بہلاوے دینے کے باوجود دل تو کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ بدستور بے قرار تھا۔ قطرہ قطرہ ہو کر پگھلنے لگتا تھا۔ دماغ اسے منانے سمجھانے کی اپنی سی کوشش میں لگا ہوا تھا اور دل و دماغ کی اس کشمکش میں بازغہ بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ خاموشی سے بیٹھی وہ دیواروں اور چھتوں کو تکتی رہتی۔ نہ جانے اس چھت تلے زندگی کے کتنے دن بیت جائیں گے۔ عمر کی کتنی گھڑیاں اس قید میں گزریں گی۔ نہ جانے کب تک۔ اس وقت بھی وہ چھت پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔ تب ہی دھڑ سے دروازہ کھول کر ایک جوان عورت اندر گھس آئی۔

''تم پاگل ہو؟'' اس نے آتے ہی سوال دے مارا۔

''نہیں تو!'' بے اختیار بازغہ کے منہ سے نکلا۔ اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''میں بھی نہیں ہوں۔'' اس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''اچھا!'' بازغہ کو اطمینان سا ہوا۔

''تم نے ڈاکٹری پڑھی ہے؟'' وہ اس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں!'' بازغہ نے حیرت سے کہا۔

''میں نے بھی نہیں پڑھی۔'' وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

بازغہ چپ رہی۔

''یہاں سے وہاں تک جتنے بھی کمرے ہیں نا، سب میں ڈاکٹرانیاں رہتی ہیں۔ ان میں سب نے ڈاکٹری پڑھی ہے۔ بس مجھے میری سوتیلی ماں نے پڑھنے ہی نہیں دی۔'' عورت کی آنکھوں میں دکھ کے سائے لہرانے لگے۔

بازغہ کو اس کی جانب ہمدردی سے دیکھا۔ اس کے خیال میں یہاں تو سارے کمروں میں ذہنی مریض عورتیں ہی تھیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ بھی ذہنی مریضہ ہے۔

''تم یہاں داخل ہو؟'' بازغہ نے احتیاط سے پوچھا۔

''میری ماں مر گئی تھی۔ ابا نے دوسری شادی کر لی۔ دوسری اماں تو مجھے اتنا مارتی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اس نے میری کتابوں کو آگ لگا دی۔ اسکول سے چھڑا کر گھر کے کام میں لگا دیا۔ میں ڈاکٹری بھی نہیں پڑھ سکی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اف!'' بازغہ کا ذہن جل اٹھا۔ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب رونے سے کیا فائدہ ہوگا۔'' بازغہ نے تسلی دیتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''فائدہ؟ ہمیں تو بس نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ یہاں بھی نقصان، وہاں بھی نقصان۔'' دفعتاً اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

رونے اور ہنسنے کی ملی جلی کیفیت نے اسے بہت وحشت ناک کر دیا تھا۔ بازغہ کو ڈر سا لگنے لگا۔ وہ ہنسے چلی جا رہی تھی اور بازغہ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ نرس آ گئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' نرس نے اس عورت سے پوچھا۔

''ہم دونوں پیار بھری باتیں کر رہے ہیں۔'' عورت نے آگے بڑھ کر بازغہ کے گلے میں اپنے بازو ڈالنے چاہے۔

بازغہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

''چلو، تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' نرس نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

''ڈاکٹرانی صاحبہ! یہ کہہ رہی ہے کہ یہ بھی پاگل نہیں ہے۔'' عورت نے بازغہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر زور سے ہنسی۔

''کوئی پاگل بھی خود کو پاگل نہیں کہتا۔'' نرس برہمی سے بولی۔

بازغہ کا دل کٹ گیا۔ اف، تقدیر کیسے کیسے وار کر رہی ہے۔ نہ جانے کیا کیا سہنا ہے ابھی۔ دوبے دم سی ہو کر پلنگ پر گر گئی۔ نرس نے اسے انجکشن لگا دیا۔

شام کو کمرے میں بے حد گھٹن محسوس ہونے لگی تو وہ باہر وارڈ میں آ گئی۔ وہاں بہت سے بستر لگے ہوئے تھے۔ اس نے سب کی طرف اچٹتی سی نگاہ سے دیکھا اور دوسری طرف پلٹ آئی۔ وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کے انداز میں سارے وارڈ میں گھوم رہی تھی۔ سب کمروں میں مریض عورتیں کسی نہ کسی شغل میں مصروف نظر آ رہی تھیں۔ کوئی مسلسل دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کی جستجو کیے جا رہی تھی، کوئی ہاتھوں کو اٹھا کر ان دیکھے لوگوں کو لیکچر دے رہی تھی۔ بازغہ کے دل میں دکھ کے بادل امڈ رہے تھے۔ ان سب کو بے خودی کی حالت میں دیکھ کر اسے دلی صدمہ ہو رہا تھا۔

نہ جانے غموں کے کتنے گہرے سمندر پار کر کے یہ لوگ اس حالت کو پہنچے ہیں۔ انسان پاگل یونہی تو نہیں ہو جاتا۔ خدا جانے کون سے دکھ ان کو ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔ کتنے عذاب سہہ سہہ کر جب اعصاب شل ہو جاتے ہیں تو ذہن ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ ان سب کے دلوں میں بھی نہ جانے کتنے دکھوں کے خزانے دفن ہوں گے۔ نہ جانے کتنی آرزوؤں کے محل ٹوٹنے سے دل کی دنیا میں آگ لگ گئی ہو گی اور پھر اس آگ میں ان کی پوری ہستی جل اٹھی ہو گی۔ یہاں ہر آنے والے کے دل میں کوئی نہ کوئی غم کی کہانی ہو گی۔ دکھوں کی لمبی داستان چھپی ہو گی اس کے سینے میں۔ زخموں کی مہک آ رہی ہو گی اسے اپنے وجود سے۔

ہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ اس کے دل نے جواب دیا۔ کبھی یہ زخم اپنوں کے لگائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی تقدیر کے مذاق میں زخمی ہو جاتے ہیں۔ سوچتے سوچتے اس کے اپنے اعصاب شل ہونے لگے۔ اس نے سوچا، اس سے پہلے کہ سوچوں کے نکیلے وار سے اس کا جسم لہولہان ہو جائے، خدا کرے کہ وہ بھی ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر انہی سب مریض عورتوں میں شامل ہو جائے۔ پھر اسے بھی کسی محرومی کا احساس نہیں ستائے گا۔ سارے احساسات فنا ہونے کا نام ہی تو دیوانگی ہے۔

آج اسے ہسپتال میں آئے چوتھا دن تھا۔ اس دوران میں شیراز دو بار اس سے مل کر گیا تھا۔ ہسپتال میں آئے دوسرا دن یونہی گزر گیا تھا اور تیسرے دن وہ آیا تو اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو اس نے چپکے سے اس کے بستر کے پاس پڑی میز پر رکھ دیا تھا۔ اس نے اس کے چہرے پر بس یونہی ہلکا سا تغیر محسوس کیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی اس میں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے لیے اداس ہو۔ بازغہ کو کچھ یاد آیا۔ اس نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر خراشوں کے نشانات کچھ کم ہو گئے تھے۔ بس اداسی سی تھی۔ بازغہ نے سوچا کہ یہ اداسی ایک دن آخر ختم ہو ہی جائے گی۔ اس نے اس سے زیادہ سوالات نہیں کیے تھے۔ بس اتنا ہی پوچھا کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ دوا وقت پر ملتی ہے یا نہیں، اور اس نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے لبریز تھا کہ وہ اسے دیکھنے تو آتا ہے۔

آج پورا دن گزر گیا تھا اور شیراز نہیں آیا تھا۔ شروع تاریخوں کا چاند طلوع ہو گیا تھا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ شیراز کی جدائی کے تصور سے اس کے دل میں طوفان سا اٹھنے لگا۔ وہ چپکے سے کمرے سے باہر نکلی اور چلتے چلتے ہسپتال کی اندرونی عمارت سے باہر نکل کر نیچے لان میں آ گئی۔

پھر ایک درخت سے ٹیک لگا کر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور انہماک سے پتلی سی لکیر جیسے چاند کو دیکھنے لگی۔ نہ جانے کتنی ساعتیں گزر گئیں۔ کتنی گھڑیاں بیت گئیں۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ تو بس چاند پر نظریں جمائے اس میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اس کا گوہر مقصود مل ہی نہیں رہا تھا۔ تلاش ختم ہی نہیں ہو رہی تھی اور وہ مسلسل ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی۔ جب ہی کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ چونک گئی۔ محویت ٹوٹ گئی۔

''کتنی رات بیت گئی اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔'' رات کی ڈیوٹی والی نرس اس سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ مانوس ہو چکی تھی۔

''چلو اوپر اپنے کمرے میں۔'' اس نے پیار سے کہا۔

''ہوں!'' وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی۔

''واقعی، مجھے تو کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔'' بازغہ نے اپنے یخ بستہ ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

نرس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں جا کر لٹا دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ بالکل ٹھنڈا ہے۔ پھر اس کی کلائی کو چھوا تو وہ بھی برف کی مانند ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

گزشتہ دو روز پہلے اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن اس نے دیکھے تھے۔ وہ اب بھی اسی طرح اس کے ہاتھ میں تھے۔ اسے تعجب ہوا تھا کہ گھر والوں نے یہ اتارے کیوں نہیں۔ حالانکہ یہاں جتنی عورتیں آتی تھیں ان کی کلائیاں خالی ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا زیور ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا لیکن اس نے اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ اب اس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی اور پوچھ بیٹھی۔

''تمہارے ہاتھ میں یہ کنگن۔۔۔؟'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ بازغہ نے جلدی سے چادر سے انہیں ڈھانپ لیا۔ نرس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اس سے اس بارے میں کچھ اور پوچھے۔ بس

حیران سی تھی۔

''باہر بیٹھنے سے تمہارا جسم بالکل یخ بستہ ہو چکا ہے۔'' اس نے جلدی سے اسے کمبل اوڑھادیا۔ ''ویسے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟''

''ہاں!'' بازغہ نے اسے انسیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھالیا تھا نا؟''

''کھالیا تھا؟'' بازغہ نے جواب دیا۔

نرس حیران تھی کہ جب سے وہ یہاں آئی تھی، پاگل پن کی ایک بھی علامت اس میں نظر نہ آئی تھی۔ وہ تو ذرا بھی پاگل نظر نہ آتی تھی۔ آخر اسے یہاں کیوں داخل کروایا گیا۔ ہسپتال میں داخل کئی پاگل عورتوں کی کہانیوں کے عکس اس کے ذہن کے پردے سے ٹکرائے۔ اس نے سوچا، یہ تو یہاں کا معمول ہے۔ بازغہ چپکے سے اسے دیکھتی رہی اور اس نے اس سے اپنائیت سی محسوس کی۔

''اچھا تم سو جاؤ تو بہتر ہے۔ طبیعت مزید بہتر ہو جائے گی۔'' نرس یہ کہہ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اس کے سارے احساسات پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ وہ سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

چھ دن اور گزر گئے۔ شیراز کو گئے آج ساتواں روز تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی انگلیوں پر گن کر حساب لگانا شروع کیا۔ شیراز کو آج ہی کے دن واپس آنا تھا۔ وہ آج ہانگ کانگ سے واپس آ جائے گا اور فوراً اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ اس بات پر اسے اتنا ہی یقین تھا جتنا خدا کی ذات پر تھا۔ وہ تو شیراز کی ایک ایک ادا سے واقف تھی۔ اس کی محبتوں، اس کے جذبوں کی پوری پہچان رکھتی تھی۔ آج شیراز ضرور آئے گا۔ یہ خوش کن، خوبصورت احساس اس کی رگوں میں لہو کی طرح دوڑ گیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ ایک ہفتہ اس کے بغیر ایک صدی ہی کی طرح تو کاٹا تھا اس نے۔ ہر لمحہ اس کو یاد کیا تھا۔ ایک پل بھی اس کے تصور سے خالی نہیں گزارا تھا۔ آنکھیں ترس گئی تھیں اسے دیکھنے کے لیے۔ دل کی بے تابیاں پریشان کر رہی تھیں اور اب انتظار کی گھڑیاں پوری ہو رہی تھیں۔

ذہن سپنوں کے خوبصورت جال بن رہا تھا اور لبوں پر دلفریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''آج بستر چھوڑنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' صبح کی ڈیوٹی پر آنے والی نرس کی آواز پر وہ چونک گئی اور خجل سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

بھلا مجھے اکیلے ہی اکیلے مسکراتے دیکھ کر نرس نے کیا سوچا ہوگا۔ اسے خیال آیا: ارے پگلی وہ تو اکیلے ہنسنے اور اکیلے رونے والے لوگوں ہی میں رہتی ہے، تیری مسکراہٹ کو بھی دیوانگی کی لہر سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہوگی۔ اس کے دماغ نے سمجھایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

''رات کو دیر سے سوئی تھی نا!'' اس نے کہا۔

''ہاں!''

نرس باہر چلی گئی۔ دن آہستہ آہستہ بیت رہا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور شام ہونے کو تھی۔ وہ بہت شدت سے شیراز کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا ایک ایک پل بے قراری سے کٹ رہا تھا۔ ایک دن اور گزر گیا۔ صبح ہوئی تو اس کی بے چینیاں دو چند ہو گئیں۔

وہ ضرور آئے گا۔ اسی یقین کے سہارے کئی پل اور گزر گئے۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو اس کی دھڑکنیں بھی تھم تھم کر چلنے لگیں۔ مایوسی کی لہریں آگے بڑھ کر اس کے پورے وجود کا احاطہ کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے نڈھال سی بیٹھی تھی۔

ایک دم ماسی نے دروازہ کھولا۔

''تمہیں سپرنٹنڈنٹ صاحب بلا رہے ہیں۔'' ماسی نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔

''اچھا!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے ساتھ وہ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں پہنچی تو اس کا دل خوشی سے دھڑکنا ہی بھول گیا۔ سامنے ہی کرسی پر شیراز دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بازغہ کی ہستی ڈول گئی۔

شیراز کے چہرے پر دکھ اور کرب کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں اداسیوں کا سمندر اتر آیا تھا۔ بہت بے بسی سے وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ بازغہ کا دل تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ بھاگ کر اس کے سینے سے لگ جائے۔ اس کے سارے دکھ پلکوں سے چن کر اپنے دامن میں بھر لے۔ اس کے لبوں کو وہی دل فریب مسکراہٹیں دلا دے جو بازغہ کو بے حد عزیز تھیں لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ مصلحتوں کے پردے چاک نہیں کر سکی۔ اپنا ڈولتا ہوا وجود لے کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ شیراز کی نظروں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اپنی نظریں اٹھا کر اس کی نظروں سے نظریں ملانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ چپ چاپ فرش کو گھورے چلی جا رہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اپنے چہرے پر شیراز کی نظروں کی تپش محسوس کر رہی تھی۔ شیراز کی اجڑی اجڑی صورت دیکھ کر اسے اپنے آپ سے انتہائی شرم محسوس ہوئی تھی۔

وہ دونوں چپ تھے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی خاموشی سے فائلوں کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ گھمبیر خاموشی سے بازغہ کا دل ڈولنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیراز کچھ بولے، کچھ کہے، شکوہ کرے، اپنی بے قراریوں کا اظہار کرے۔ لیکن وہ تو پتھر بنا بیٹھا تھا۔ ایک لفظ بھی تو نہیں کہا تھا۔ نہ شکوہ کیا، نہ تسلی دی، نہ اس کا حال پوچھا، بس ایک ٹک اسے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

بازغہ کو الجھن سی ہونے لگی۔ وہ واپسی کے لیے اٹھنے لگی تو شیراز بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ باہر آئی تو شیراز بھی پیچھے پیچھے آ گیا۔

''یہ کیا ہو گیا بازغہ!'' ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتا ہوا وہ نڈھال سا لگ رہا تھا۔

''پتہ نہیں؟'' بازغہ کی آواز بھی رندھ سی گئی۔

''اف! زندگی ہمیں کس مقام پر لے آئی ہے۔'' شیراز کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

بازغہ چپ رہی۔ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دونوں اپنے اپنے ڈوبتے دلوں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے شاید۔

''شیراز! میں کبھی یہاں سے نکل پاؤں گی؟'' بازغہ کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''اللہ نے چاہا تو تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔'' شیراز نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''مجھے کیا ہوا ہے، اچھی بھلی تو ہوں۔'' بازغہ نے کہا۔

''ہوں!'' شیراز ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''بتاؤ نا شیراز، مجھے کیا ہوا ہے۔ کیوں تم سب میرے دشمن بن گئے ہو، مجھے کیوں ڈالا ہے یہاں لا کر۔'' بازغہ پر جھنجھلاہٹ سی سوار ہونے لگی۔

وہ یہاں سے اکتا گئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا، سب کچھ چھوڑ کر، سارے دکھوں کو بھلا کر اس وقت شیراز کے ساتھ باہر کھلی فضا میں نکل جائے۔ ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس کے اور شیراز کے علاوہ کوئی نہ ہو۔ جہاں وہ آزادی سے اپنی نئی خوبصورت دنیا کی تعمیر کر سکیں۔ جہاں کسی بھی محرومی کا احساس نہ ہو۔ نہ زمانے ہوں اور نہ زمانے کی ریت۔ اس احساس سے بازغہ کا دل کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے مچل اٹھا تو اپنی بے بسی کے احساس سے اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

''مجھے یہاں سے لے چلو شیراز، یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ التجائی لہجے میں بولی۔

شیراز کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''میری بات سن رہے ہو نا!'' وہ بولی۔

''ہوں!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''پھر لے چلو نا!'' بازغہ التجا کرنے لگی۔

جواب میں شیراز نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔

''تم جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟ بیزار ہو گئے ہو مجھ سے؟؟ پیچھا چھڑا رہے ہو؟؟؟'' بازغہ چیخ سی پڑی۔

''کاش تم میرے دل میں جھانک سکتیں۔''

شیراز کے لبوں سے سرد آہ نکلی۔

''تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' بازغہ نے پوچھا۔ حالانکہ خود ہی اس نے اس منزل تک پہنچنے میں خاصی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کیا تھا۔

''مجبوری ہے۔'' شیراز نے کہا۔

''کیا مجبوری ہے؟'' بازغہ الجھنے لگی۔

''تم بیمار ہو اور یہاں رہ کر علاج زیادہ بہتر ہو سکتا ہے۔'' شیراز نے افسردگی سے کہا۔

''نہیں شیراز! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سب سے پوچھ لو۔ میں نے ان دنوں میں کوئی پاگل پن کی حرکت نہیں کی۔ بے شک ڈاکٹر سے پوچھ لو۔ میں نے اب تک ایک بھی ایسی ویسی بات نہیں کی ہے۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔

''ڈاکٹر بتا رہی تھیں کہ کل تم نے خاصا ہنگامہ کیا تھا۔ بہت توڑ پھوڑ کی تھی۔'' شیراز نے بتایا تو بازغہ پر بجلی سی گر گئی۔

ایسا کوئی واقعہ، ہنگامہ پرور لمحہ تو اس کی یادداشت کے کسی بھی کونے میں نہیں تھا۔ اس کے حافظے میں تو ایسی کوئی بات محفوظ نہیں تھی۔ کیا وہ واقعی یہاں بھی ہوش و خرد کا دامن چھوڑ بیٹھی تھی۔ کل اس سے کیا کچھ ہوا تھا؟ سوچتے ہوئے اس کے دماغ کی نسیں تننے لگیں۔ دکھ اور صدمے سے دل بیٹھنا شروع ہو گیا۔ چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

''تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی بازغہ پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے۔ پھر وہی دن ہوں گے، وہی خوشیاں ہوں گی۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔'' شیراز نے پر امید ہو کر کہا۔

شیراز کی آواز میں محبتوں کی چاشنی گھلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں چاہتوں کے دیپ روشن تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ خوش آئند دنوں کی آس دلا رہا تھا۔ خدا جانے اب وہ دن آئیں گے بھی یا نہیں؟ بازغہ بہت افسردگی سے سوچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ شیراز اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اسے غیر شعوری طور پر اس کے کمرے میں لے آیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ رات کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

''اب میں چلتا ہوں، انشاء اللہ کل آؤں گا۔'' شیراز کھڑا ہو گیا۔

بازغہ کا دل چاہا کہ اس کے قدموں سے لپٹ کر اسے جانے سے روک لے۔ اس کے بغیر تو اسے دنیا میں ایک پل رہنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ بس بے بسی سے دیکھتی رہی۔

''خدا حافظ!'' کہتے ہوئے شیراز تیزی سے باہر چلا گیا۔ اس کا شدتِ جذبات سے سرخ پڑتا چہرہ بازغہ نے دیکھ لیا تھا۔ شاید شیراز میں بھی جدائی کی یہ گھڑی سہنے کی ہمت نہیں تھی۔ جب ہی تو وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ پھر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی اور اب شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ ذرا سی دیر میں رات بھی آ گئی۔

خوشی کی ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزار دی۔ اور پھر کئی دن اس طرح گزر گئے۔ ہر روز طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ ساتھ اس کی امیدیں بھی جاگ اٹھتیں۔ بہت آس لیے وہ راہ میں پلکیں بچھائے اس کی منتظر رہتی۔ ہر آہٹ پر چونک پڑتی۔ سارا سارا دن کھڑکی میں کھڑی اس کی راہ تکتی اور جب رات کے سائے بڑھنے لگتے تو ٹوٹی امیدوں کو سنبھالے بستر پر پڑی رہتی۔ تب آنسوؤں کا سیلاب امڈنے لگتا۔ پلکوں کے بند ٹوٹ جاتے اور وہ بے بسی سے اس سیلاب کو بہتا دیکھتی رہتی۔

☆☆☆

☆☆☆

اس دوپہر وہ سو رہی تھی، جب ہی اپنی پیشانی پر کسی کا لمس محسوس کر کے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

سعیدہ اس کے قریب کھڑی جھلملاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم!'' بازغہ اٹھ بیٹھی۔

اتنے دن بعد کوئی شفیق صورت دیکھنے کو ملی تھی۔ اس کے دل میں ایک ہی ساعت میں ڈھیروں منظر اتر آئے اور شدتِ جذبات کے ساتھ اسے چمٹ گئی۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟'' سعیدہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''ٹھیک ہوں سعیدہ!'' بازغہ کی آواز رندھ گئی۔

''تم کیسی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس بیٹا! ہم بھی جی رہے ہیں۔'' سعیدہ نے آہ بھری۔

''اور سب لوگ کیسے ہیں؟'' بازغہ سب کا حال جاننے کو بے قرار تھی۔

''سب لوگ تو ٹھیک ٹھاک ہیں، بس چھوٹے صاحب بیمار ہیں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''شیراز بیمار ہے؟'' بازغہ پریشان ہو گئی۔

''ہاں بیٹا!'' سعیدہ نے کہا۔

''کیا ہوگیا اسے؟'' بازغہ بے چین نظر آنے لگی تھی۔

''بس جی! آپ کی بیماری کا صدمہ دل پر لیا ہے۔ بہت برداشت کیا اور اب وہ بستر پر پڑے ہیں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''یا خدایا!'' بازغہ کے ہوش اڑنے لگے۔

''بڑے صاحب اور بیگم صاحبہ اس وجہ سے بہت پریشان ہیں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

بازغہ پریشانی سے سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کے ایک ایک مسام سے شیراز کی جلد صحت یابی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

''بس کیا بتاؤں بیٹا! اس گھر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ ساری رونقیں رخصت ہوگئی ہیں وہاں سے۔ اب تو بالکل اجڑا ہوا نظر آتا ہے۔'' وہ بولی۔

''خدا نے چاہا تو بہت جلد اس کی رونقیں لوٹ آئیں گی۔ وہ پھر نئے سرے سے آباد ہو جائے گا۔ اس کے گلستان میں پھر ننھی منی کونپلیں پھوٹیں گی۔ خزاں کا یہ دور جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے والوں کو اس کا انعام ضرور ملے گا۔ بازغہ بڑے عزم سے سوچنے لگی۔

اس کے حوصلے نہ جانے کہاں سے پھر کیسے جواں ہو گئے تھے۔ اس نے یقین کی مضبوط رسی تھام لی۔ پھر سے مضبوط عزم کا سمندر دل میں ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ اس گھر کی اس کی جائز خوشیاں دینے کا تصور اس کے دل میں اطمینان کی لہریں لے کر اتر رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ دونوں یونہی چپ چاپ بیٹھی اپنی سوچوں میں غلطاں ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہی تھیں۔

''شام ہونے کو ہے۔ اب میں چلتی ہوں بیٹا!'' سعیدہ اٹھنے لگی۔

''سعیدہ یہاں اکیلے میں مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔ تم آ جایا کرو تو سکھ کی دو باتیں کر لیا کروں گی۔ سب کی خیریت بھی معلوم ہوتی رہے گی۔'' بازغہ نے اس سے التجا کی۔

''بیٹا میرا بس چلے تو میں تو یہیں تمہارے پاس رہ جاؤں۔ میرا دل تو بس تمہاری ہی طرف اٹکا رہتا ہے۔ کوئی لمحہ تمہاری یاد سے غافل نہیں گزرتا۔'' کہتے ہوئے سعیدہ کی آواز رُندھنے لگی اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

''تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے اپنے دل میں مجھے اتنی جگہ دی ہے۔'' بازغہ نے کہا۔

''میرے دل میں تمہارے لیے کتنی جگہ ہے، یہ تو بس میں جانتی ہوں یا میرا خدا!'' سعیدہ نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی کہتی ہو اور پلٹ کر خبر بھی اتنے دنوں بعد لی۔'' بازغہ کے لبوں پر شکوہ آمیز تبسم چھا گیا۔

''آپ کے دکھوں نے تو مجھے خود چارپائی پر ڈال دیا تھا، اور پھر بیٹا یہاں کا فاصلہ بھی تو کتنا ہے۔'' سعیدہ نے کہا۔

''محبت کرنے والے فاصلے نہیں ناپا کرتے سعیدہ! محبت تو خود ہی سارے فاصلوں کو مٹا دیتی ہے۔'' بازغہ بولی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! محبت تو سارے فاصلوں کو ختم کر دیتی ہے۔ سعیدہ نے کہا۔

''تو پھر آتی رہا کرو گی نا؟'' بازغہ کے لہجے میں ابھی تک وہ التجا تھی۔

''بیٹا! مجھے اس طرح شرمندہ کیوں کرتی ہو فکر نہ کرو میں آتی ہی رہا کروں گی۔'' سعیدہ نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔

''دیکھو سعیدہ! چھوٹے صاحب کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔ یہ سوچ لینا کہ وہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔'' بازغہ کی آواز میں آنسوؤں کی نمی آ گئی۔

''فکر نہ کرو بیٹا! ان کی دیکھ بھال تو بڑے صاحب اور بیگم صاحبہ خود بھی کر رہے ہیں۔ دن رات کا چین حرام کر لیا ہے اپنے اوپر بیٹے کے لیے۔ اور کیوں نہ کریں ان کا ایک ہی تو بیٹا ہے، ان کی تو ساری امیدیں ہی اس کے دم سے ہیں۔'' سعیدہ نے بتایا۔

''بے شک!'' بازغہ کے لبوں سے آہ نکلی۔

''اپنی صحت کا خیال رکھا کرو بیٹا!'' سعیدہ نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''رکھتی تو ہوں۔'' بے جان سی مسکراہٹ بازغہ کے لبوں پر آ گئی۔

''اللہ آپ کو جلدی صحت یاب کرے تاکہ اس گھر کی رونقیں لوٹ آئیں۔'' وہ بولی۔

''بس سعیدہ دعا کرتی رہا کرو۔'' بازغہ نے کہا۔

''میرے لبوں پر تو ہر وقت یہی دعا رہتی ہے۔'' سعیدہ نے کہا۔

بازغہ خاموش ہو گئی۔

''اچھا بیٹا! خدا حافظ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''خدا حافظ!'' بازغہ نے جواب دیا۔

جب وہ چلی گئی تو بازغہ پھر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی اور باہر کی جانب دیکھنے لگی۔ شیراز کی بیماری کا سن کر اس کا دل بے حد پریشان ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے۔ اس کی تکلیفیں اپنے دامن میں بھر کر اسے راحتیں دے دے، لیکن وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکی۔ بس بے بس پنچھی کی طرح قید میں پھڑپھڑاتی رہ گئی۔

☆☆☆

☆☆☆

وقت کا پہیہ نہ کبھی رکا، نہ کبھی روکا جاسکتا ہے۔ یہ تو بس یونہی تیزی سے چلتا رہتا ہے۔ اس کی گردش سے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ ہر آنے والا نیا دن اپنے اندر گزرے ہوئے کل کی یادیں تیزی کے ساتھ سموئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وقت گزر جاتا ہے اور یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ انسان انہی یادوں کو سینے سے لگائے آنے والے کل کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یادیں ان کا سرمایہ حیات ہوتی ہیں بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اور بازغہ کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ گزرے دنوں کی خوشگوار یادوں کو سینے سے لگائے وہ جی رہی تھی۔

اس ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ وہ اب اس ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وحشتیں سوار ہو جاتیں اور وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتی۔

کسی بے بس پنچھی کی طرح دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر وہ خود کو زخمی کر لیتی اور جب طوفان گزر جاتا، دل میں آئی طغیانی کا زور ٹوٹ جاتا، جذباتی لہریں پرسکون ہو جاتیں، تب اپنے وجود پر بندھی سفید پٹیوں سے اس طوفاں کی آمد کا علم ہوتا اور اپنی دیوانگی کے احساس سے لرز اٹھتی۔ دن یونہی بیت رہے تھے، بہت کرب کے عالم میں۔ وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی تھی۔

شیراز پابندی سے آتا تھا اور بہت بہت دیر اس سے باتیں کرتا، اس کو سمجھانے کی کوشش میں لگا رہتا۔ شیراز کے جذبوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی بازغہ سے ویسے ہی والہانہ انداز میں ملتا، اس کی چاہتوں کی شدتیں ویسی ہی محسوس ہوتیں اور اس محبت میں والہانہ پن دیکھ کر بازغہ جی اٹھتی۔ سچے جذبوں میں ذرا بھی کھوٹ نہیں آنے دیا تھا اس نے۔

اس کے احساس پر سکون کا ذرا سا موسم طاری ہوا تو ایک دم اسے کچھ احساس ہوا۔

وہ اسی طرح اٹل رہا تو پھر بازغہ کی تو ساری ریاضتیں بیکار جائیں گی۔ ساری قربانیاں رائیگاں چلی جائیں گی۔ وہ سوچتے سوچتے الجھ سی گئی۔ نہیں شیراز! تمہیں مجھ کو بھلانا ہوگا۔ تمہیں اپنی آرزوؤں، اپنی خواہشوں کی خاطر مجھے دل سے نکالنا ہوگا، اپنی ذات کا بٹوارا کرنا ہوگا، اپنی محبت کو تقسیم کرنا ہوگا کہ یہی میری ریاضتوں، میری قربانیوں کا حاصل ہے۔ اور میں اپنی قربانیوں کو رائیگاں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔

یہ سوچ ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح اس پر برسنے لگی۔ لیکن الجھی ہوئی ڈور کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاتی تو دیوانگی اپنی حدوں کو چھونے لگتی۔ پھر ایسے ہی کبھی شیراز آجاتا تو وہ اس سے بھی کوئی بات نہ کرتی۔ بس چپ چاپ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کبھی چھت کو گھورتی اور کبھی خلاؤں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگتی۔ کبھی نظریں ادھر ادھر بھٹک کر شیراز پر ٹھہر جاتیں۔

شیراز کے چہرے پر پھیلے کرب کے سائے دیکھ کر اس کے دل میں دکھوں کا دھواں سا پھیلنے لگتا اور وہ بے بسی سے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگتی۔ ایسے وقت پر شیراز تیزی سے ڈاکٹر کو بلانے چلا جاتا۔

وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی، اس کے دل میں پڑے داغوں میں صبح ہی سے بہت جلن ہو رہی تھی۔ شیراز اس کے بالکل قریب بیٹھا تھا، لیکن وہ اس سے ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ مسلسل چھت کو گھورے چلی جا رہی تھی۔ جی ہی نہیں چاہ رہا تھا کچھ بولنے کو۔ دکھوں کی آگ میں جل جل سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ اب تو اکثر وہ کئی کئی دن منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خاموش تھی۔ شیراز کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور شیراز بھی تھک ہار کر وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ شیراز کے جانے کے ایک گھنٹے بعد سعیدہ آگئی تو وہ بہت پرسکون انداز میں سعیدہ سے باتیں کرنے لگی۔

سعیدہ کی آمد اس کے لیے بہت اطمینان کا باعث ہوتی تھی۔ وہ اس سے سب گھر والوں کی خیریت معلوم کر لیتی۔ خاص طور پر شیراز کی ایک ایک کیفیت کا علم تو اسے سعیدہ ہی سے ہوتا رہتا تھا اور سعیدہ سے شیراز کی ہر بات جان کر اس کا دل مطمئن سا ہو جاتا تھا۔ سعیدہ بھی تو اسے شیراز کی دل کی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر کے سب بتا دیتی تھی۔ بہت ذہین اور جہاندیدہ عورت تھی۔ وہ شیراز کے بچپن سے اس کو جانتی تھی۔ اس کے مزاج کا اچھی طرح اندازہ تھا اسے۔ اس کی ایک ایک ادا سے واقف تھی۔ اس کے دکھ جانتی تھی۔

اور اب وہ شیراز پر گزرنے والی قیامتوں کا سب حال بازغہ کو بتا رہی تھی۔ شروع شروع میں اس نے اجتناب برتنا چاہا تھا، لیکن اب اس نے بتا دیا تھا کہ اس کے گھر والے اس کی شادی کرنے پر تل گئے ہیں۔ بازغہ کو یہ سن کر بہت خوشی محسوس ہوئی۔ تو گویا اس کی تمام کاوشیں رنگ لے آئی ہیں۔ اس نے اس گھر کی خوشیوں کے لیے جو کچھ چاہا تھا وہ اب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اندر سے بہت کھل گئی، لیکن کہیں

ایک احساس نے انگڑائی لی۔ اس کی اپنی دنیا تو اجڑ رہی تھی۔ اس کا اپنا وجود تو پارہ پارہ ہونے لگا تھا۔

''تم دکھی نہ ہو بیٹا! شیراز مانے گا تھوڑا ہی۔''

''نہیں اسے یہ سب کچھ قبول کر لینا چاہیے۔ حالات کے مطابق اب اسے یہی کرنا چاہیے۔'' بازغہ نے مصمم ارادے کے ساتھ اسے کہا۔

''کیا؟'' سعیدہ حیران سی رہ گئی۔

''ہاں! میں یہی چاہتی ہوں۔ وہ کب تک میری صحت کی امید میں اپنی اور والدین کی زندگی کو خراب کرتا رہے گا۔ تم بھی اسے یہی مشورہ دو۔''

''بیٹا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔'' اسے کچھ خدشہ سا ہوا کہ شاید اس پر دیوانگی کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے باہر جانے لگی تو بازغہ اس کا ارادہ سمجھ گئی۔

''سعیدہ! گھبراؤ نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور پورے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے یہ بات کر رہی ہوں۔'' اس نے اسے یقین دلانا چاہا۔

سعیدہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''سعیدہ!'' اس نے نہایت پیار سے کہا۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔''

اور سعیدہ کو ایک دم یقین آ گیا۔ وہ کچھ کچھ بازغہ کی کیفیتوں کو سمجھنے لگی تھی۔

''بیٹا! اس گھر نے آپ کی قدر نہیں کی۔ لیکن آپ تو فرشتہ ہیں، بلکہ جنت کی حور ہیں۔۔۔ جنت کی حور'' محبت سے سعیدہ کے آنسو اس کے گالوں پر ٹپکنے لگے۔

بازغہ مسکرا دی۔

''تم نے کبھی جنت کی حور دیکھی بھی ہے سعیدہ!'' اس کی حس مزاح جاگ اٹھی۔

''دیکھی نہیں بیٹا! دیکھ رہی ہوں۔ جنت میں ایسی ہی حوریں تو ہوتی ہوں گی۔'' سعیدہ جذبات کی شدت میں رو دی۔

بازغہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا دل ایک دم انوکھے جذبے سے بھر گیا۔ اسے روتا ہوا دیکھ کر اسے ایسے لگا جیسے وہ اس کی حقیقی ماں ہے، جو جنت سے اس کے روپ میں واپس آ گئی ہے۔

انہی شب و روز میں ایک سال اور بیت گیا۔ بازغہ کے لیے اب وقت ایسے ہی تھا جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ کیا گزرا اور کیا نہیں، اسے بالکل احساس نہیں رہا تھا۔ اس عرصے میں شیراز سے ایک بھی ملاقات نہ ہوئی۔ بس سعیدہ سے سارے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ ہسپتال والوں کے بقول وہ اب نارمل زندگی گزار رہی تھی۔ کوئی دورہ اس پر نہیں پڑتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ بیماری اس کے جسم سے ایک دم پر لگا کر اڑ گئی ہے۔ اس کے وارڈ کی عورتیں، کیا نئی، کیا پرانی، سب کی سب ہی اس کی گرویدہ تھیں۔ جب کسی کو ذرا ہوش ہوتا تو اس کے پاس اپنے دکھ شیئر کرنے کے لیے آ جاتیں۔ کبھی اگر کوئی ہنگامہ کرتی تو وہ اسے پیار سے ٹوک دیتی۔ وہ اس کے ایک اشارے پر چپ ہو کر رہ جاتی۔

نرسوں نے یہ ساری باتیں ڈاکٹروں کو بتا رکھی تھیں۔ ڈاکٹر فرحانہ خود بھی اس کی بہت گرویدہ ہو چکی تھی۔ جب ذرا ڈیوٹی سے فرصت ملتی تو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتی یا اسے بلا لیتی۔

ایک روز سعیدہ آئی تو اس کے ساتھ ایک سمارٹ سی خوبصورت لڑکی تھی۔ لڑکی تو نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کی عمر کم از کم چھبیس ستائیس سال ضرور ہو گی۔ لیکن وہ بہت حسین دکھائی دے رہی تھی۔

''بیگم صاحب! یہ بازغہ بی بی ہیں۔ ہماری مالکن!'' سعیدہ نے اس سے تعارف کروا دیا۔

''یہ کون ہیں سعیدہ!'' بازغہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی بیٹا!۔۔۔'' سعیدہ کہتے ہوئے اٹکنے لگی۔ ''یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ چھوٹی بی بی۔ سارہ یہ ہیں۔''

بازغہ کو ایک دم سکتہ ہو گیا۔

''شیراز صاحب بھی آئے ہیں۔'' سعیدہ نے ایک دم کہا۔ ''وہ گاڑی پارک کر رہے تھے۔ ہمیں پہلے بھیج دیا۔''

''اچھا!'' بازغہ نے اپنی حالت پر قابو پایا اور مسکرائی۔

''بہت اچھی ہیں۔'' اس نے کہا۔

اور اسی اثناء میں شیراز اندر داخل ہوا۔

بازغہ نے شیراز کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ سا لگا اسے۔

''ہیلو بازغہ!'' اس نے اندر آ کر کہا۔

بازغہ نے بھی ہلکے سے کہا: ''ہیلو!'' بازغہ کے دل میں درد کا ایک سایہ لہرایا۔ پورے ایک سال بعد وہ آیا تھا۔ کتنے ہی سوال اس کے ذہن میں گونج اٹھے۔ جی چاہا کہ اس سے بہت کچھ پوچھے لیکن نہ پوچھ سکی۔

شیراز بازغہ کو غور سے دیکھے جا رہا تھا اور سارہ بھی۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ بازغہ کو کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ شیراز نے دیکھا کہ سارہ ابھی تک کھڑی ہے۔ اس نے اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئی لیکن وہ خود کھڑا رہا۔

''لو دیکھ لو!۔۔۔ تم نے جو چاہا، وہ ہو گیا۔'' شیراز کی آنکھیں اس کے چہرے پر تھیں۔

اس سے پہلے کہ بازغہ کچھ کہتی، سارہ شیراز کا جملہ سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شیراز! چلو اب چلتے ہیں۔''

''ابھی مالکن۔۔۔؟''سعیدہ کے منہ سے نکلا۔

ساریہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

شیراز نے بازغہ سے کہا:''اچھا بازغہ! میں پھر آؤں گا۔''

وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔سعیدہ کو بھی افسردہ دلی کے ساتھ جانا پڑا۔

اور بازغہ سوچتی رہ گئی کہ بس اتنی دیر کے لیے۔کیا شیراز تم مجھے اپنی بیوی دکھانے کے لیے لائے تھے یا پھر کچھ اور تھا تمہارا مقصد؟

مگر پہلے تم ایسے تو نہیں تھے۔اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔اس نے اپنے ذہن کو ایک جھٹکا دیا اور اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوا کہ شام ڈھل رہی ہے اور مغرب کا وقت ہونے کو ہے۔وہ اٹھی اور ملحقہ واش روم میں چلی گئی۔

دو مہینے اور گزر گئے۔شیراز آیا نہ اس کی بیوی۔سعیدہ البتہ تیسرے چوتھے روز ضرور آجاتی تھی۔اس شفیق عورت نے بازغہ کی محبت میں حد کر دی تھی۔کبھی کبھی وہ اس کے لیے راستے سے سیب خرید کر لے آتی۔وہ جانتی تھی کہ بازغہ کو سیب بہت پسند ہیں۔

شیراز نے نہیں آنا تھا تو کم از کم اس کی بیوی ہی اسے دیکھنے آجاتی۔لیکن پھر وہ اپنی اس خواہش پر خود ہی ہنس دی۔اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو کیا میں یہ کرتی؟ وہ سوچنے لگی۔

ہاں میں ضرور ایسا کرتی۔کم از کم شیراز کے لیے ضرور ایسا کرتی۔۔۔ایسا ہی کرتی۔اس کے دماغ میں تکرار سی ہونے لگی۔ایک دم اسے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ ایسا سوچتی چلی جا رہی ہے۔اسے خدشہ ہوا کہ کہیں پھر وہ اسی حالت میں نہ چلی جائے۔اس نے ایک وظیفے کا ورد شروع کر دیا۔اسے کچھ وظائف یاد تھے جو سکول کے زمانے میں اس کے امی ابو نے اسے یاد کروائے تھے۔اس تنہائی میں یہی اس کا آسرا تھے۔گزشتہ سال سے وہ ان وظائف کا ورد کثرت سے کرتی رہتی تھی۔پھر نماز کی پابندی بھی کرتی تھی۔وہ چپکے سے وضو کر لیتی اور کمرے میں اندر سے کنڈی چڑھا کر نماز پڑھ لیتی۔اس سے اس کے دل کو بے پناہ سکون حاصل ہوا تھا۔

ایک روز اس نے ڈاکٹر فرحانہ سے اپنی ایک خواہش کا اظہار کیا۔

''کیا آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟''

ڈاکٹر فرحانہ تھوڑی سی حیران ہوئیں۔اس نے تو آج تک کسی خواہش کا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔کہیں پھر۔۔۔؟''وہ ایک دم سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

''جی بتائیے آپ!''ڈاکٹر فرحانہ نے نہایت محبت اور احترام کے ساتھ پوچھا۔

''مجھے کاغذوں کا ایک رجسٹر اور لکھنے کے لیے تین چار بال پوائنٹ چاہئیں۔''بازغہ نے بھی اسی محبت سے کہا۔

''جی؟۔۔۔کیا؟۔۔۔آپ کیا کریں گی؟''

''ایک ایسی داستان لکھوں گی، جو مجھ پر قرض ہے۔''بازغہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کس کا قرض ہے؟''ڈاکٹر فرحانہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''محبتوں کا۔۔۔اپنوں اور غیروں کی محبتوں کا۔''

''اپنوں اور غیروں؟''ڈاکٹر فرحانہ مزید حیران ہو گئی۔

''ہاں! اپنوں کی محبتیں۔۔۔اور غیروں کی وہ محبتیں جو اپنوں سے بھی بڑھ کر کی جاتی ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں آپ کی منطق۔''

''اسی لیے تو لکھنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر فرحانہ نے اس کی جانب عقیدت سے دیکھا۔وہ کتنی عجیب مگر دانشورانہ باتیں کر رہی تھی۔

اگلے پندرہ منٹ میں ڈاکٹر فرحانہ نے اس کے لیے یہ بندوبست کر دیا اور وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

ڈاکٹر فرحانہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔اس نے پلٹ کر ڈاکٹر فرحانہ کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دی۔جواب میں بازغہ بھی مسکرا دی۔

اور پھر وقت یوں ہی پر لگا کے اڑتا رہا۔اس کا قلم مسلسل کاغذوں پر چلتا رہا۔اگلے تین مہینے میں اس نے فرحانہ سے پھر گزارش کی کہ وہ اسے کچھ اور کاغذ مہیا کر دے۔ڈاکٹر فرحانہ نے خواہش کی کہ اس کا لکھا ہوا دیکھنا چاہتی ہے لیکن فی الحال اس نے معذرت کر لی۔

یوں مہینوں پر مہینے گزرتے چلے گئے اور وہ ڈاکٹر فرحانہ سے کاغذ لے لے کر لکھتی چلی گئی۔فرحانہ کو آخر حیرت ہوئی کہ وہ اتنا کچھ کیا لکھ رہی ہے، کتنی لمبی داستان لکھنا چاہتی ہے۔ایک روز وہ احتیاط کے ساتھ دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں عین اس وقت پر آئی جب وہ لکھ رہی تھی۔وہ خاموشی سے ایک جانب کھڑی اسے دیکھتی رہی۔اس نے پورا ایک صفحہ اس کے سامنے لکھا لیکن وہ اتنی دور سے پڑھ نہ سکی۔پھر اس نے وہ صفحہ پھاڑ دیا اور دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔ڈاکٹر فرحانہ وہاں سے واپس آ گئی۔

اب وہ معمول کے خلاف بھی چیک اپ کے بہانے اس کے کمرے میں جانے لگی۔بازغہ نے شروع میں تو کچھ محسوس نہ کیا لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

آخر اس نے ڈاکٹر فرحانہ سے پوچھ ہی لیا۔

''بس بازغہ! میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کیسا لکھتی ہو، بس صرف یہی۔''

''اچھا!'' اس نے کہا: ''پھر ایک وعدہ کریں!''

''کیا؟''

''میری لکھی ہوئی داستان کو اپنے پاس محفوظ رکھیں گی اور وقت پڑنے پر شیراز یعنی میرے شوہر کے حوالے کر دیں گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ڈاکٹر فرحانہ نے کہا۔

''لیکن ایک بات تو بتاؤ بازغہ؟''

''جی کیا؟''

''میرے اور ڈاکٹروں کے خیال میں تم بالکل نارمل ہو، اصول کے مطابق تمہیں اب ہسپتال سے چھٹی دے دینی چاہیے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے گھر والے راضی ہوں اور تم بھی۔''

''کیا وہ راضی نہیں ہیں؟'' بازغہ کو اتنے عرصے بعد یہ بات سن کر دھچکا لگا۔ ''سعیدہ نے تو کبھی یہ بات مجھے نہیں بتائی۔''

''وہ تمہاری بوڑھی نوکرانی؟''

''جی۔۔۔ لیکن وہ میری ماں ہی کی طرح ہے۔''

''ممکن ہے ایسا ہو۔ لیکن ہمارے بتانے پر بھی وہ تمہیں لینے نہیں آئے۔''

ڈاکٹر فرحانہ نے پھر پوچھا: ''تمہارے والدین یا اور کوئی جن کے پاس تم جانا چاہو۔''

''جی کوئی نہیں، میرا جنازہ یہیں سے نکلے گا۔۔۔ آپ مجھ پر اتنا احسان کر دیں کہ ہسپتال کے کھاتے میں مجھے پاگل ہی ظاہر کیا جائے، اور اگر میں مر جاؤں تو میری تدفین بھی یہیں سے ہو۔ اس کی اطلاع میرے گھر والوں کو بعد میں دی جائے۔''

''بازغہ! لیکن یہ میرے کیریئر کے خلاف ہے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں۔''

''میں آپ سے احسان کرنے کی بات کر رہی ہوں۔ آپ کو زور نہیں دے رہی۔'' اس کے لہجے میں التجا آمیز درد تھا۔

''اچھا! خدا نہ کرے، اگر کوئی ایسا مسئلہ آیا تو میں ایسا ہی کروں گی۔'' ڈاکٹر فرحانہ اسے تسلی دے کر باہر چلی گئیں۔

☆☆☆

☆☆☆

کہانی یہیں تو ختم نہیں ہوتی۔۔۔! ڈاکٹر فرحانہ نے سوچا اور یہاں سے اس نے قلم پکڑ کر سبز بال پوائنٹ کے ساتھ لکھنا شروع کر دیا:

اگلے روز ڈاکٹر فرحانہ چھٹی پر تھی۔ جب وہ ہسپتال واپس آئی تو یہ خبر اس کے لیے سوہانِ روح تھی کہ بازغہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اسے کارڈیالوجی میں بھیج دیا گیا ہے۔

اس نے کارڈیالوجی میں فون کر کے پوچھا تو جواب ملا کہ وہ اب ٹھیک ہے اور واپس اپنے ہسپتال میں منتقل ہونے کے قابل ہے۔

ڈاکٹر فرحانہ نے ضروری انتظامات کروائے اور اس کی ڈیوٹی کے اوقات ہی میں وہ دوبارہ اس ہسپتال کے اسی کمرے میں تھی۔

چہرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پوری طرح ٹوٹ پھوٹ سی گئی ہے۔ اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجا۔ پتا نہیں آگے کیا ہو؟

اگلے روز وہ اس کے کمرے میں گئی تو وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بالکل نڈھال سی بستر پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر فرحانہ نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے کر اس کے گھر والوں کو فون کیا تو دوسری طرف سے شاید اس کے شوہر ہی نے فون اٹھایا تھا۔ ڈاکٹر فرحانہ نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ آئے گا۔

اور پھر تقریباً مہینہ گزر گیا۔ بازغہ کارڈیالوجی ہسپتال کی تجویز کردہ دواؤں کے سہارے بظاہر ٹھیک تھی لیکن پھر دو روز بعد، دن کے پچھلے پہر، جب وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے اٹھنے ہی والی تھی۔۔۔ نرس نے غم زدہ لہجے میں آ کر اسے بتایا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

ڈاکٹر فرحانہ اپنے کمرے سے نکل کر جلدی سے اوپر راہداری میں پہنچی تو وہاں حدِ نظر تک ماتم کا سماں تھا۔

اندر گئی تو بستر پر اس کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ پھر احتیاط سے اس کے ہاتھ سے کنگن اتار لیے اور ایک دردناک احساس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

بازغہ کے دکھوں کی داستان ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی بدنصیبی کا آخری باب بھی تمام ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ شیراز کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ساریہ کی طرف دیکھا۔ ایسے لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں سوجھی ہوئی ہیں۔ کاغذوں کا بقیہ حصہ اس کے سامنے بستر پر پڑا تھا اور وہ ایک تسلسل سے بازغہ کے کنگنوں کو دیکھے جا رہی تھی جو اس کے ہاتھ میں تھے۔ شیراز نے یہ صورت دیکھ کر کمرے سے باہر جانا چاہا تو اس نے ساریہ کی آواز سنی۔

''شیراز!''

وہ پلٹا تو اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: ''میں پڑھ چکی ہوں۔''

اس نے ساریہ کو غور سے دیکھا۔

''شیراز!'' اس نے بڑی دردناک آواز میں کہا: ''کتنی عظیم عورت تھی وہ۔ ممی اور ڈیڈی اب پچھتا رہے ہیں تو اس کا اسے کیا فائدہ۔ وہ تو مر گئی نا بے چاری۔''

حائف سے اس کی آنکھوں میں موتی سے جھلملانے لگے تھے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ننھا ریحان کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ساریہ کا جملہ سن لیا تھا۔

''کون مر گیا ماما؟'' اس کے انداز میں معصومیت سی تھی۔

''بیٹا! تمہاری ماں مر گئی ہے۔'' شیراز نے بھرّائی ہوئی آواز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ماں کون۔۔۔؟ دادی اماں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ''وہ تو نیچے بیٹھی ہیں۔''

شیراز ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

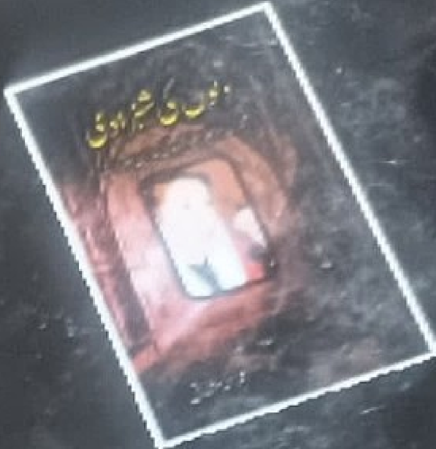

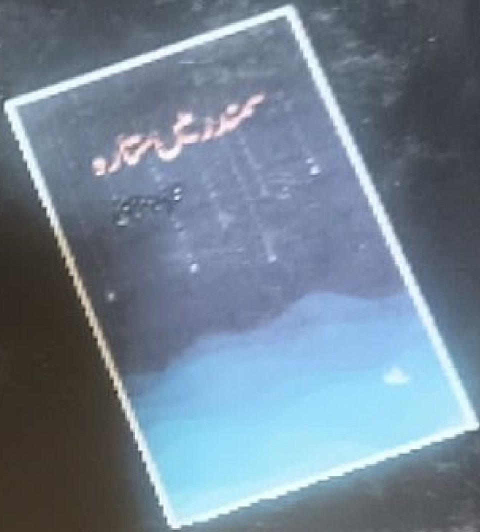

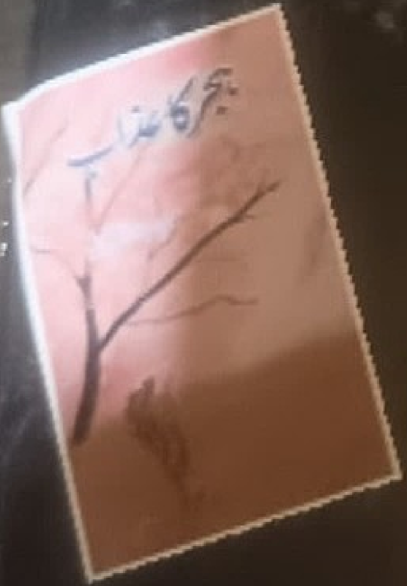

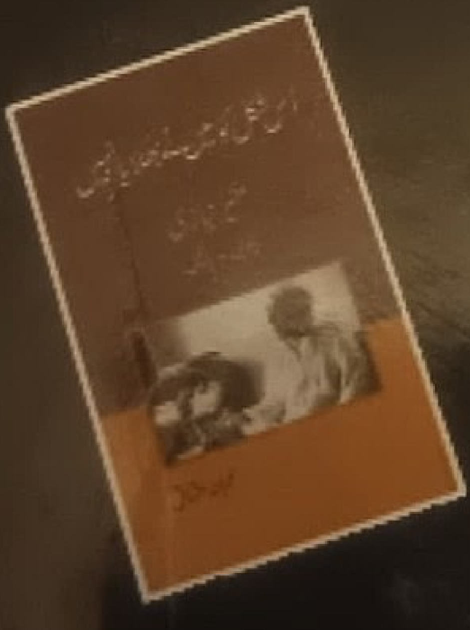

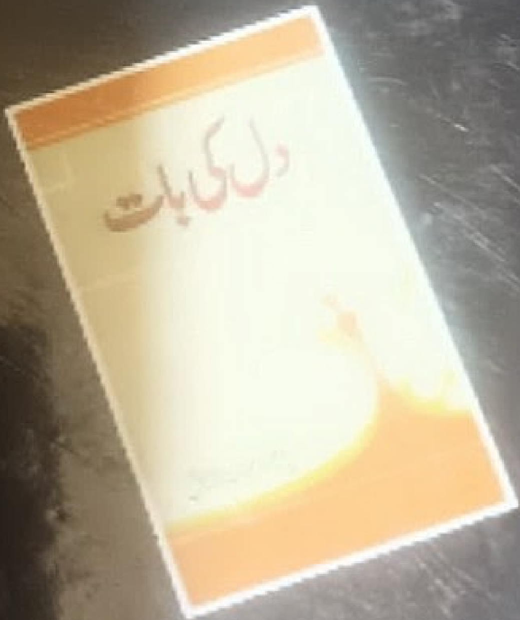

کتاب
Kitab
PUBLICATIONS
PUBLISHERS · PRINTERS · BOOK SELLERS
Book Street, 40/2, Mozang Road,
Lahore-54000, Pakistan
Call # 92 42 35724446, +92 333 4249342
Website: www.kitabpublications.com
Email: kitabpublications@gmail.com

ISBN 978-969-7845-11-6